دشتِ امکاں
(ناول)
اصغر ندیم سید

(ناول)

اصغر ندیم سید

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4393 Syed, Asghar Nadeem
Dasht e Imkan / Asghar Nadeem
Syed.-Lahore: Sang-e-Meel
Publications, 2021.
286pp.
1. Urdu Literature - Novel.
I. Title.

2021ء
افضال احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-3364-X
ISBN-13: 978-969-35-3364-4

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sangemeel.com e-mail: smp@sangemeel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

اِنتساب

زارا۔صوفیہ
اور حیدر علی اصغر کے نام

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

(غالبؔ)

میرے خاوند کا جو بھی نام تھا۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ میں انہیں آنس کہتی ہوں۔ وہ اب نہیں رہے۔ وہ بہت مشہور آدمی تھے۔ بہت بڑے مؤرخ تھے۔ بے شمار کتابیں، قصے اور تحقیقی مقالے لکھے۔ دنیا بھر کی کانفرنسوں میں گئے۔ مجھے بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ اس لئے میں اُن کے تمام معاملات کی گواہ بھی ہوں اور ان کی سرگرمیوں میں شریک بھی تھی ـــــ جب آپ سب جانتے ہیں تو نام بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں یہ سب اپنے آپ سے کہہ رہی ہوں۔ کسی ٹی وی کے سامنے بول رہی ہوں۔ کسی ادیبوں اور تاریخ دانوں کے ہجوم کے سامنے بات کر رہی ہوں۔ یہ بات بھی غیر ضروری ہے۔ وہ دنیا کو کیا سمجھتے تھے۔ وہ ان کی کتابوں میں موجود ہے۔ وہ دنیا کو کیا نہیں سمجھتے تھے وہ صرف مجھے معلوم ہے۔ اب جو بھی سن رہا ہے یا پڑھ رہا ہے، اُسے مجھ پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔ اب یہ بھی بتا دوں کہ انہوں نے مجھ سے شادی اس لئے نہیں کی تھی کہ میں یہ سب بتاؤں گی۔ اس لئے بھی شادی نہیں کی تھی کہ میں خوبصورت تھی۔ اس لئے بھی نہیں کی تھی کہ میں کہانیاں لکھتی تھی۔ اس لئے بھی نہیں کی تھی کہ میں بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ کیوں کی تھی؟ یہ بھی غیر ضروری بات ہے۔ انہوں نے کبھی بستر میں بھی نہیں بتایا تھا کہ مجھ سے شادی کے لئے ان کے دل میں کیسے جذبے جاگے تھے۔ بس ساتھی چاہیے تھا تو میں آ گئی ان کی زندگی میں جیسے موسم کسی بھی زمین پر آ جاتا ہے۔ کیونکہ اُسے آنا ہوتا ہے۔ موسم کو بتانا نہیں پڑتا کہ وہ کیوں آ گیا ہے۔ اور پھر موسم گذرتا ہے اُسے تو گذرنا ہے۔ ایسے ہی میں بھی اُن کی زندگی میں سے گذری اور آپ کو ایک عجیب و غریب تجربے میں شریک کرنا چاہتی ہوں۔ چونکہ کہانی کار ہوں تو پھر یہ میرا حق ہے کہ آپ کو اپنی کہانی میں شریک کروں ـــــ ایسا تجربہ بے شمار بیویاں دنیا کے مختلف حصوں میں کر رہی ہوں گی۔ مگر شاید اُسے لکھنے کا فریضہ میرے حصے میں آیا ہے۔ شاید میں بہت سی خواتین کے تجربے اپنے اندر جذب

کرلوں اور آپ تک پہنچا دوں۔ ابھی مجھے بھی نہیں معلوم کہ اس تجربے کی طاقت مجھ میں ہے یا نہیں ہے۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ اپنے ہی ملک میں ایک بڑی کانفرنس سے ہم واپس آئے۔ احتیاط کے لیے ڈاکٹرز نے مجھے کہہ رکھا تھا کہ اب ہوائی سفر اور فائیو سٹار ہوٹلوں کی راہداریوں اور ریسیپشن کے جھنجھٹوں میں آنس کو نہیں ڈالنا۔ بس انہیں احتیاط سے صوفے پر بٹھا دینا ہے اور پھر کمرے میں پہنچا دینا ہے۔ اگرچہ وہ چوکس ہوتے تھے۔ کسی کی مدد سے انکاری ہوتے تھے۔ چوکنے ایسے کہ کسی نے پہچان کے اگر ہیلو ہائے کیا تو رُک جاتے تھے۔ اس کا احوال جانتے۔ اُس سے سوال کرتے کہ کیا اُس نے محض ان کی تصویر اخباروں میں یا ٹی وی پہ دیکھ کر عقیدت دکھائی ہے یا اُن کی کوئی کتاب پڑھ کر متاثر ہوئے ہیں ـــــ اب اگر معاملہ سطحی شخصیت پرستی کا ہوتا تو بغیر جواب دیئے گذر جاتے تھے۔ ایسا بھی نہیں کہ وی ایس نائیپال جس نے کبھی ادب کا نوبل انعام لے لیا تھا اور پاکستان کے دورے میں ایک بہاول پور کی نیم صحافی نیم لکھنے والی خاتون اُس سے چپک گئی اور سیدھی اُس کے ساتھ انڈیا گئی۔ اور اُس کے نوبل انعام کے پیچھے مسلمانوں کے خلاف اُس کے گھٹیا جذبات تھے جو اُس نے پورے منصوبے کے ساتھ ناول میں لکھے تھے۔ بہرحال اُس نے ان کی قے دھوئی۔ ان کے پیشاب صاف کئے اور کیا نہیں کیا جو کوئی بھی نرس کر سکتی ہے۔ اس بات پر اُسے ایک بڑی خاتون مانتی ہوں۔ میں شاید بڑی خاتون نہیں ہوں نہ میں یہ ثابت کرنا چاہتی ہوں کیوں کہ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ میری خواہش اور خوشی کے عین مطابق تھا۔ اس لئے تو اس قابل ہوں کہ آپ سے مخاطب ہو سکوں۔

میرا اور اُس بہاولپوری کا کردار بالکل مختلف ہوگا اور ہونا بھی چاہیے کہ دنیا کے بڑے آرٹسٹ، رائٹرز، تاجر، سیاست دان اور پروفیشنلز اگر اپنی طبعی عمر میں ستر سال تک پہنچ جاتے ہیں تو وہ یا تو اپنی کسی مطلقہ یا بیوہ محبوبہ کی خدمات لے لیتے ہیں جس سے اُن کی شادی ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ وہ پرانے زمانے کی گرد دامن میں ایسے محسوس کرتی ہے کہ اب شاید راکھ میں کوئی چنگاری اُس کے لیے موجود ہو۔ اکثر یہ خود فریبی کا کھیل ہوتا ہے اور جب وہ بڑے فن کاروں، رائٹرز، تاجروں، سیاستدانوں اور پروفیشنلز کو آخری عمر میں محبوبہ کے روپ میں نرس کی خدمات پیش کر دیتی ہیں تو پھر وہ اُن مشہور لوگوں کی شہرت کے فریب ہی میں زندہ رہتی ہیں اور یہ فریب اُس وقت ٹوٹتا ہے جب رات کے کسی وقت یا فجر کی اذانوں کے آس پاس وہ مشہور ہستی یا تو ہسپتال میں جو ظاہر ہے بے حد مہنگا ہوتا ہے یا بڑے بنگلے کے کسی بیڈروم میں اس دنیا کو داغِ مفارقت دے کر اُٹھ جاتی ہے۔ پھر یہ ہوتا ہے کہ اُس نامور ہستی کے بیٹے بیٹیاں اور قانونی بیوی یا بیویاں آناً فاناً پریس اور میڈیا

کے آنے سے پہلے آجاتے ہیں اور اُس محبوبہ نما نرس کو پچھلے دروازے سے جانا ہوتا ہے۔

آنس میرا دوست ہے، ساتھی ہے، میرا سب کچھ ہے۔ ہمارا بہت اچھا وقت گذرا ہے۔ ہمارے تین بچے ہوئے۔ تینوں ظاہر ہے ذہین ماں باپ کی اولاد تھے۔ جینز کی سائنس ثابت کرنے والوں کے لئے ہمارا گھرانہ آئیڈیل ثابت ہوسکتا تھا ـــــ اب آنس کام کرتے کرتے تھک جاتے تھے۔ اُن کو کافی، چائے، سینڈوچ، لنچ، ڈنر تو میں خود ہی دیتی تھی اور مجھے ڈاکٹرز کی ہدایت کے مطابق معلوم تھا کہ کتنا نمک، کتنی چینی اور کھانے میں کیا دینا ہے۔ اور پھر صبح سے رات تک کون کون سی دوائیاں کب دینی ہیں اور کب کیا مساج کن کن جگہوں پر کرنا ہے۔ یہ سب میری ذمہ داری ٹھہر گئی تھی۔

اب میں آنس کی ایک کہانی لکھنے والی بیوی ہوں۔ میری افسانوں کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ افسوس وہ سیدھے افسانے ہیں۔ میں نے کوئی تجربہ نہ کیا نہ ضرورت محسوس کی کہ کہانی میں تجربہ نہیں ہونا چاہیے۔ کہانی تو کہانی ہے۔ اُسے کیوں کسی مشکل مرحلے میں ڈالیں۔ انتظار حسین اور داستان گو بھی کہانی کو مشکل میں نہیں ڈالتے تھے۔ ہاں خود مشکل میں پڑ جاتے تھے اور کہانی کو صحیح سلامت مشکل سے نکال کے لے جاتے تھے۔ میں نے آنس کے اس آخری مرحلے میں بیوی یا نرس کا کردار تو کرنا ہی تھا۔ تو ایسے میں نیورو سرجن اور فزیشن ڈاکٹر شہزاد امجد اور ڈاکٹر نیاز صدیق آنس کی میڈیکل رپورٹ لے کر مجھے ایک طرف لے گئے اور بتایا ـــــ

ٹھہریں، پہلے یہ بتادوں کہ آنس کو کیا ہوا تھا۔ رات کو اب وہ محض دو پیگ پینے لگے تھے اور اُس پر سختی سے عمل کرتے تھے۔ پھر وہ باتیں کرتے تھے اور ساتھ میں جو ڈنر میں انہیں پسند ہوتا تھا، وہ میں میز پر لگا دیتی تھی۔ بہت ملازم اور باورچی تھے۔ مگر یہ کام وہ مجھ سے لینا پسند کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی میری کہانیوں کا ذکر نہیں کیا۔ انہیں سب معلوم تھا۔ مجھے کس طرح کے فون آتے ہیں، کون ملنے آتا ہے۔ مگر جیسے کوئی بار بار پڑھی ہوئی کتاب لائبریری میں اپنی جگہ پر رکھی ہوتی ہے ایسے ہی گھر میں میری بھی جگہ تھی۔ ایک دن صبح اٹھے تو سر چکرانے کی شکایت کی۔ ایسا پہلے بھی ہوتا رہتا تھا۔ بلڈ پریشر کی دوائی بدل لینے سے ٹھیک ہو جاتا تھا۔ مگر جب ڈاکٹرز اور دواؤں سے معاملہ قابو میں نہ آیا تو رات کے دو پیگ سے ایک پر آگئے۔ خیر مجھے کیس ہسٹری نہیں بتانی۔ تو پھر وہ سارے ٹیسٹ ہوئے اور ایک دن انہوں نے ایسی بات کردی جس کی مجھے توقع نہیں تھی۔ انہوں نے کہا۔ ''میری تم سے شادی کب ہوئی تھی؟'' میں نے جواب دیا۔ مگر کہنے لگے۔ ''مجھے تو یاد نہیں ہے۔''

پھر کہنے لگے۔ ''میں نے دفتر جانا ہے۔ میرے کپڑے کدھر ہیں؟'' پھر کہنے لگے۔ ''ہم شکاگو میں ہیں اور ابھی میرا ایک لیکچر ہے۔ محمد علی جناح کا Partition۔''

جب یہ ساری باتیں اوپر نیچے ہوئیں تو پھر ڈاکٹرز سے رجوع کیا گیا تو پھر وہ لمحہ آیا جب ڈاکٹر شہزاد امجد اور ڈاکٹر نیاز صدیق نے مجھے اپنے آفس میں بٹھایا اور بتایا کہ اگر آپ کہانیاں لکھتی ہیں تو آپ کے لیے ایک بڑا چیلنج سامنے آ گیا ہے۔ میں نے کہا۔ ''میں سمجھی نہیں۔'' ڈاکٹر شہزاد نے کہا۔ ''آپ کے گھر میں کہانیاں پریوں یا فرشتوں کی طرح اُترنے والی ہیں۔ آپ کے لئے انہیں سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔'' ڈاکٹر نیاز صدیق نے کہا۔ ''آپ کے ہاتھ کہانیوں کا خزانہ لگ گیا ہے۔ اب یہ آپ پر ہے کہ انہیں کیسے پالنا پوسنا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ دونوں کا کہانیوں سے کیا تعلق ہے؟ کتنا جانتے ہیں کہانی کو؟'' انہوں نے کہا۔ ''بس اتنا کہ ہم دونوں نے الف لیلہ تو کم از کم پڑھی ہے۔'' میں خاموش ہو گئی تو انہوں نے کہا۔ ''بات خوشی کی نہیں ہے۔ ہم یہ بات اپنے مریض کے لواحقین کو دکھ کے ساتھ سناتے ہیں۔ صرف آپ کو ہم نے یہ خبر ذرا اور طرح سنائی ہے''۔ ''اب خبر کیا ہے؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ اس پر انہوں نے بتایا کہ آنس زمان اور مکان سے باہر چلا گیا ہے۔ جو کچھ اس کی زندگی میں گذرا ہے اُس کی ترتیب گڑبڑ ہو گئی ہے۔ وہ زمانوں اور مہ و سال کی گردش سے باہر آ چکا ہے۔ اُن کی یادداشت تاش کے پتوں کی طرح پھینٹی گئی ہے۔ معلوم نہیں کب کون سی یاد سامنے آ جائے اور اگلی یاد کا پتا کس زمانے کی خبر لائے۔ یہ نیورو Disorder رہے گا۔ اس کا علاج بہت آہستہ ہے۔ عام طور پر مریض اس میں سے نکل نہیں پاتا۔ وہ بھول جاتا ہے کہ وہ کہاں ہے۔ ہوسکتا ہے وہ آپ سے کہے مجھے فلاں دوست کے ہاں جانا ہے۔ آپ انہیں لے کر جائیں گی، واپس آئیں گے تو کہیں گے مجھے اُسی دوست کے ہاں جانا ہے ___ اس لئے کہ وہ بھول چکے ہوں گے کہ ابھی وہ وہاں سے ہو آئے ہیں۔ اتنی مشکل صورتحال ہوگی کہ اسے صرف کہانی کار ہی سمجھ سکتا ہے۔ اب آپ میں اگر اہلیت ہے تو ان کی بکھری یادوں سے کہانیوں کے الجھے تاروں کو سلجھا کے کہانی بنالیں ___ '' یہ بات سن کر دھچکا لگا کہ کیا ایک کہانی کار اتنا خود غرض ہوسکتا ہے کہ اپنے لہو کو چاٹنے سے لذت حاصل کرنے لگے لیکن جو کچھ ہو رہا تھا وہ میرے بس میں تو نہیں تھا۔ آنس اب میری کہانیوں کی تجربہ گاہ میں قدم رکھ چکا تھا۔ ایک جادونگری میرے گھر میں بسیرا کرنے والی تھی۔ مگر میں اس کے لئے تیار نہیں تھی۔

ڈاکٹروں نے ایک عجیب بات اور کردی۔ جس کا مجھے ذرا بھی ادراک نہیں تھا۔ انہوں نے بتایا کہ

بعض اوقات ایسے مریض کے خواب بھی اُس کی یادوں میں شامل ہو جاتے ہیں اور خواب اور حقیقت کا جو فاصلہ ہے وہ مٹ جاتا ہے۔ وہ بیک وقت خواب اور حقیقت میں رہنے لگتا ہے کہ جب زمانوں کی سرحدیں ختم ہو جاتی ہیں تو پھر سب سمندر رہو جاتا ہے۔ جو بھی لہر آئے گی وہ آ جائے گی ___ اور ایسے مریض سے آپ نے بحث نہیں کرنی، نہ ضد کرنی ہے، نہ غصے ہونا ہے۔ بس اُس کے ساتھ رہنے کی عادت ڈالنی ہوگی۔ یہ بات میرے لئے بہت اہم تھی جو میں نے پلے باندھ لی۔ اور یہی بات میری کہانیاں بُننے کے عمل کے لئے ضروری تھی۔ آنس کو لے کر میں گھر آ گئی۔ وہ خاموش تھے۔ گھر میں داخل ہوئے تو بس یہ کہا۔ ''یہ تو وہ بنگلہ نہیں جہاں بے نظیر بھٹو حیدر آباد میں ایک رات کے لئے رُکی تھیں۔ میں ساتھ والے کمرے میں تھا''۔ ''ہاں آنس یہ وہی بنگلہ ہے یہ کوثر بھٹی کا بنگلہ ہے جو اُن کا فیملی فرینڈ تھا ___ '' آنس نے کہا۔ ''ہاں تم بھی تو ساتھ تھیں''۔ ''ہاں میں بھی تو ساتھ تھی۔'' اب جب میں نے کمرے میں انہیں بٹھایا تو وہ بھول چکے تھے کہ انہوں نے کیا بات کی تھی۔ کہنے لگے۔ ''تاج محل دیکھا ہے۔ لگتا ہے آسمان سے کوئی معجزہ اُترا ہے۔ مگر اس کا سارا حسن Skyline ہے۔ اگر تاج محل کے پیچھے جمنا نہ ہوتا اور اُس کے پیچھے درختوں کا ذخیرہ تو اس کے پیچھے کئی منزلہ عمارتیں کھڑی ہو جاتیں اور پھر یہ معجزہ مرجھا جاتا ___ لیکن ایک بات ہے کہ ممتاز محل تیرھواں بچہ پیدا کرتے ہوئے قافلے سے واپس آتے ہوئے جاں بحق ہوگئی۔ کیا یہ ظلم نہیں تھا۔ اگر تیرا بچہ تیرے پیٹ میں مر جاتا تو میں تو صرف ایک کچی قبر ہی تمہاری بنا سکتا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''ہاں یہ ٹھیک ہے۔ آپ اب لیٹ جائیں۔ آپ کے لیے میں کھانا لاتی ہوں۔'' وہ لیٹ گئے۔ یہ میرے لئے پہلی رات کا سبق تھا۔ سونے سے پہلے کہنے لگے۔ ''صبح ہم کھجراؤ کے مندر دیکھنے جائیں گے۔'' اب انہیں کون بتاتا کہ کھجراؤ کے مندر یہاں سے کوسوں دور ہیں اور ہم تو آج تاج محل دیکھ کر آئے ہیں۔

میں آنس کے ساتھ بستر پر سوتی تھی۔ یہ ہم دونوں کی آسودگی کے لئے ایک ایسی عادت تھی جس کا ہم دونوں کو چسکا لگ چکا تھا۔ پہلے ہم الگ الگ اپنی نیند میں جاتے تھے اور پھر جب نیند ذرا سی ٹوٹتی تو ہم دونوں ایک دوسرے کے بازو تھام کر قریب ہو جاتے۔ پھر اتنے قریب کہ سانس سے سانس جڑ جاتی تھی اور پھر یا میرے خراٹے گونجتے یا اُن کے خراٹے۔ یہ عادت پکی ہوگئی تھی۔ مگر ایک رات ایسا ہوا کہ ___ آنس اُٹھ بیٹھے اور کہنے لگے۔ ''صبح اوسا کا یونیورسٹی میں لیکچر ہے۔ میرے نوٹس کہاں ہیں؟'' میں فوراً سمجھ گئی اور میں نے

دو چار کاغذ آگے کیئے کہ آپ کے نوٹس میرے پاس ہیں۔ اب آپ سو جائیں۔ صبح لیکچر میں تیار کرادوں گی۔ وہ لیٹ گئے مگر مجھے نیند نہیں آ سکتی تھی۔ میں اُن کا لیکچر تیار کرتی رہی۔ حالانکہ وہ میرا لیکچر نہیں تھا۔ اب وہ لیکچر کیا تھا ـــــ سوچنا چاہئے ـــــ

مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اور میں اُن کا اوساکا یونیورسٹی میں دیئے ہوئے لیکچر کو یاد کرنے لگی۔ لیکچر مہاتما بدھ پر تھا۔ جو یادرہا وہ یہ تھا کہ مہاتما بدھ نے گیان سے پہلے جو بن باس لیا اور اس میں جو تجربے ہوئے ان میں پہلا تجربہ پرندوں سے گفتگو کرنے کا تھا۔ اور اُس سے بھی پہلے درختوں اور پودوں سے مکالمہ کرنے کا تھا۔ جس میں وہ درختوں اور ہریالی کو اپنا ہم نوا بنا چکے تھے اور ان کی زبان بھی سیکھ چکے تھے اور اپنا فلسفہ بھی ان تک پہنچا چکے تھے۔ یوں پورا بَن مہاتما کی بات پا چکا تھا۔ پھر پرندوں کی باری آئی۔ پہلے کچھ پرندے ان کے پاس آئے اور اُن کا اُن سے باطنی رابطہ ہوا۔ پرندوں نے مہاتما کی بات پالی، تو اُڑ گئے۔ اور پھر غول کے غول معلوم نہیں کن علاقوں سے اُترے اور وہ مہاتما کے گیان کے احترام میں خود گیان میں چلے گئے اور انہوں نے ایمان لایا مہاتما کے فلسفے پر۔ یہ پرندے اُن کی ہر بات سمجھ سکتے تھے۔ چڑیا، ہدہد، پپیہا، نیل کنٹھ، بیا، کھٹ بڑھئی، چیل، کوے، کبوتر، مینا، فاختہ، شاما، طوطے ہریل، عقاب، شاہین، شکرے، تیتر، تلور، بٹیر، سرخاب، نہ جانے کتنی قسموں کے پرندے غول در غول اور جھنڈ در جھنڈ اُترنے لگے۔ مہاتما نے انہیں امن آشتی اور کائنات کے ساتھ اپنے تعلق کے بے شمار فلسفے بتائے۔ اور پرندوں نے وہ سب گیان حاصل کر لیا ـــــ اب اس کی بھنک جانوروں کو ہوئی کہ یہ پرندے اور درخت کس سے مکالمہ کر رہے ہیں کہ ہم اُس سے محروم ہیں۔ اب بات جنگل سے جنگلوں تک پہنچی ـــــ اور پھر جانوروں کے قبیلوں نے بھی مذاکرات کیئے اور پھر وہ بھی قافلوں کی شکل میں پہنچے مہاتما بدھ کا اُن کے ساتھ بھی مکالمہ ہوا کہ ایک گیان حاصل کرنے والے کے لیے پوری کائنات ہی ایک درس گاہ ہوتی ہے۔ گیانی کو اپنی سچائی ثابت کرنے کے لئے پوری کائنات سے مکالمہ کرنا پڑتا ہے۔ سو جانوروں نے بہت دیر لگائی مگر مہاتما بدھ کی زبان سمجھی۔ مہاتما بدھ کا پیغام پایا اور ایک دوسرے پر غراتے ہوئے اِدھر اُدھر ہو گئے۔ مگر انہوں نے بات سمجھی وہ یہ تھی کہ کسی پر ناروا تشدد نہیں کرنا۔ اور اپنی مادہ کے ساتھ زبردستی جنسی تعلق یعنی Rape نہیں کرنا اور جانور اور پرندے اب تک اس اصول پر چل رہے ہیں۔ آج تک کوئی جانور اپنی مادہ کو ریپ نہیں کر سکا۔ نر اپنی مادہ کے گرد منڈلاتا ہے۔ اگر اُس کی خواہش نہ ہو تو وہ لات مار دیتی ہے۔ نر بھاگ کر کسی اور مادہ کو آزماتا ہے۔ یہاں جانور اور پرندے انسانوں سے برتر ہو گئے ہیں۔ لیکن

اشرف المخلوقات تو انسان ہی ہے جو فطرت کے ضابطوں اور کائنات کے رازوں کا محافظ ہے۔ آنس نے اس لیکچر کے آخر میں یہ کہا کہ مہاتما بدھ نے جو گیان لیا، اُس کے بعد جب اسلام آیا تو اللہ نے اپنی کائنات کی حقیقت کو کھول دیا اور زمین پر اُگنے والے ہر خوشے اور گھاس کی پتّی سے کلام کیا۔ فطرت کو انسان کے تابع کرنے کے لئے چرند، پرند، پہاڑ، میدان، جنگل، آسمان، فضا، ہوا اور آفاق کو انسان کے حوالے کر دیا۔ اس پر تو انسان پر بہت سی پابندیاں نافذ ہو گئی تھیں اور انسان نے انحراف کیا۔ پرندوں کا قتل عام کیا۔ جانوروں کا قتل کیا۔ درختوں کو قتل کیا۔ زمین اور فضا کو نقصان پہنچایا۔۔۔۔ مجھے یہ بات یاد آ گئی اور پھر جاپانی سکالرز نے بہت سوال کئے اور ثابت یہ کیا کہ جاپانی لوگ مہاتما بدھ کے پیغام کو اب تک پورا کر رہے ہیں۔ کسی بھی جاپانی کے گھر جائیں، پھول، پودے، درخت اور پرندوں کے لئے گوشے موجود ہیں۔ اور جانوروں کے لئے ان کے حقوق موجود ہیں۔

بس یہ لیکچر مجھے یاد آیا۔ وہ تو سو گئے تھے۔ میں نے ان کے لیکچر سے یہ باتیں نکال لیں۔ اب مجھے نیند آ گئی اور پھر مجھے میری ملازمہ نے جگایا کہ میڈم وہ آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ میں بھول گئی تھی کہ اُن کا ناشتے کا وقت ہے۔ اب میں ہڑ بڑا کے اُٹھی اور سیدھی پہنچی ناشتے کی ٹیبل پر تو آنس جیسے سوئے تھے ویسے بیٹھے ہیں۔ میں سر پیٹ کر رہ گئی کہ ان کا اپنا پروٹوکول ہوتا ہے۔ وہ مجھ سے پہلے جاگ گئے ہیں تو انہوں نے ملازموں سے کیا گفتگو کی ہو گی کہ وہ تو دنیا سے باہر کہیں کسی لمحے میں موجود ہیں۔ میں نے جلدی سے چائے اور ناشتے کے لئے کچن میں ملازموں کو اشارہ دے دیا۔ ''آپ کب اٹھ کر یہاں آ گئے؟'' میں نے اُن کے ماتھے سے بال ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

''محمد علی جناح آئے تھے۔ ابھی اُٹھ کر گئے ہیں۔'' آنس نے خالی کرسی کو دیکھ کر کہا۔ میں فوراً سمجھ گئی کہ خواب سے نکلے ہیں اور خواب اور حقیقت کے درمیان چونکہ کوئی پردہ نہیں رہا تو ایسے محسوس کر رہے ہیں۔ میں بات سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔ ''پھر جناح صاحب کیا کہنے آئے تھے؟'' ''وہ پریشان تھے۔ کہنے لگے میں اپنی بمبئی والی رہائش گاہ پر گیا تھا۔ کسی نے بھی خیال نہیں رکھا۔ سارا فرنیچر دیمک اور سیلن سے گل سڑ گیا ہے۔ میری لائبریری تباہ ہو چکی تھی۔ ہر ورق مٹی ہو چکا تھا۔ قیمتی قالین اور پینٹنگز پہچانی نہیں جاتی تھیں۔ کسی نے خیال نہ کیا۔ میں تو کہہ کر گیا تھا کہ میں پاکستان بننے کے بعد واپس آ جاؤں گا اور بمبئی کی رہائش گاہ میں قیام کروں گا۔ کتنے خوبصورت درخت اس کالونی میں تھے۔ پارسیوں کی خوبصورت کوٹھیاں تھیں۔ میں نے دیکھا

ہندوستان کے مسلمانوں میں میرے خلاف بہت غصہ تھا۔‘‘

’’پھر آپ نے جناح صاحب سے کیا کہا؟‘‘ میں نے بات کو بڑھایا کہ ان کے دل میں جو ہے وہ باہر آ جائے۔ میں نے کہا، جناح صاحب آپ منطق اور دلیل کے آدمی تھے۔ پھر کیا ہوا کہ بڑے بڑے راجے نواب تو آپ کی بات مان کے اپنی ریاستیں چھوڑ کے پاکستان آ گئے جیسے راجہ صاحب محمود آباد بیوی بچے چھوڑ آئے۔ لیاقت علی خان اور بھی بہت سے ____ لیکن کیا وجہ مذہبی جماعتوں کے مولوی اپنے مدرسے چھوڑ کے آنے پر تیار نہ ہوئے اور آج ہندوستان میں ان مدرسوں کے غریب طلبا سفید ٹوپیاں پہنے مودی سرکار سے پناہ مانگ رہے ہیں۔ جناح صاحب مسکرائے اور کہا، اور جو مدرسے پاکستان بننے کے بعد یہاں پروان چڑھے۔ آپ کی حکومتیں اُن سے پناہ مانگ رہی ہیں۔ یہ سب میرے جانے کے بعد ہوا۔ میری دلیلوں سے تو ہندو بھی قائل تھے۔ اور آپ کو یاد ہوگا کہ نچلی ذات کے ہندو بھی اونچی ذات کے ہندوؤں کے خوف سے مسلمانوں کے ساتھ تھے۔ میں نے تو متبادل کئی تجاویز دی تھیں کہ ہندوستان تقسیم نہ ہو۔ پھر جب تحریک چلتی ہے تو وہ لیڈروں کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے ____‘‘

’’یہ سب جناح صاحب نے کہا؟‘‘

’’ہاں، یہ سب کہہ کر ابھی تو گئے ہیں۔ بلکہ یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ یہ ہمارا پاکستان، ہندوستان کے تنخواہ دار طبقے، پنجاب اور سندھ کے جاگیرداروں کے آپسی اتحاد کے نتیجہ میں قائم ہوا۔‘‘ ____ ’’آپ نے تو اپنی کتابوں میں اس طرح کے تھیسس لکھے ہیں۔‘‘ میں نے آنس کو یاد کرایا ____ ’’ہاں، میں تو سچ لکھ ہی نہیں سکا کہ جناح صاحب نے پاکستان تو بنایا تھا عام مسلمانوں کو معاشی تحفظ دینے کے لیے اور اُسے ہائی جیک کر لیا مذہبی جماعتوں نے جو اس کے قیام کے مخالف تھیں اور پھر مسلمان مسلسل تقسیم در تقسیم کا شکار ہوتے گئے اور مزید ہوتے رہیں گے۔‘‘ میں نے محسوس کیا کہ آنس تو بہت جم کے فوکس گفتگو کر رہے ہیں۔ شاید صحت میں بہتری آ رہی ہے۔ پھر سوچا شاید یہ ان کا پسندیدہ موضوع ہے اس لئے وہ جس زمانے میں پہنچے ہیں اُسی میں رہنا چاہتے ہیں۔ میں نے بات پھر آگے بڑھائی کہ ’’جناح صاحب نے تقسیم پر کچھ اور کہا؟‘‘ ’’ہاں، وہ کہنے لگے کہ ہندوستان سے ہجرت کر کے جو غریب اور معمولی کام کاج کرنے والے غیر تعلیم یافتہ لوگ پاکستان میں پہنچے۔ وہ اب معاشی طور پر کہاں کھڑے ہیں؟‘‘

’’تو آپ نے کہا نہیں کہ وہ کہاں کھڑے ہیں؟‘‘

''ہاں، میں نے کہا تو انہوں نے کہا۔ جاتی امرا میں خراد کی بھٹی کا لوہار پاکستان میں کتنا بڑا ٹائیکون بن گیا۔ اُس نے اتنی بڑی امپائر کھڑی کی کہ میرا پاکستان اُس کے نیچے دَب گیا ـــــ اب یہ سب میرا قصور تو نہیں تھا۔''

''پھر آپ نے نہیں بتایا کہ یہ جو معمولی روزگار والے پاکستان میں پناہ کے لئے آئے تھے، وہ اتنے ظالم کیوں ہو گئے کہ انہوں نے یہاں کے مقامی باشندوں کو جو کسان تھے یا معمولی کاروبار کرتے تھے، انہیں اپنی چالاکی سے کچل کے رکھ دیا۔ کسانوں کو زرعی زمینوں سے نکالا اور لینڈ مافیا بن گئے۔ معمولی کاروبار والوں کو اپنی چالاکی سے فارغ کیا، وہ بھیک مانگنے لگے اور خود انہوں نے فیکٹریاں لگائیں، پلازے کھڑے کئے، شاپنگ مال بنائے اور ملک کی اکانومی پر قابض ہو گئے اور سیاست گاہیں اُن کے قبضے میں آ گئیں۔'' میں نے آنس کا ساتھ دیا۔

''ہاں، یہ سب جناح صاحب کو بتایا۔ بس یہ سن کر وہ اُٹھ گئے۔'' آنس بہت مزے سے باتیں کر رہے تھے کہ چائے آ گئی اور ملازم خوش دکھائی دیئے کہ گھر میں بہت دنوں بعد کوئی حرارت آئی ہے۔ میں اندر سے پریشان تھی کہ اب خواب بھی زمان و مکاں سے آزاد ہو کر آنس کی یادداشت کا حصہ بن چکے ہیں۔ مجھے کیا معلوم کہ کب خواب داخل ہو گا اور کب حقیقت بے دخل ہو جائے گی۔ میرے لئے یہ ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ مجھے ہر لمحے ایک اسرار اور ایک حیرت کا سامنا تھا۔

ایک دن ایسا ہوا کہ میں نے آنس کو تیار کرا کے، اچھا لباس پہنایا جو اکثر وہ خاص تقریبات میں پہنتے تھے۔ خوبصورت قمیص، پتلون کوٹ، مفلر ـــــ یہ سردیوں کے دن تھے۔ ہلکی ہلکی شام آ رہی تھی۔ کہنے لگے ''آج احمد فراز سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ چلو گاڑی نکالیں۔''

اب میں سمجھ گئی کہ یہ اچانک حیرت اور اسرار میرے سامنے آ گئے ہیں۔ فراز کو فوت ہوئے وقت گذر چکا ہے اور ہم لاہور میں ہیں، فراز اسلام آباد میں تھے۔ میں نے فوراً اپنی ایک دوست کو فون کیا کہ اپنے ایک ملازم کو تیار رکھو۔ جب میں بیل دوں تو اُسے سمجھا دو کہ ہم احمد فراز کے گھر آئے ہیں اور وہ صرف یہ بتا دے کہ وہ مشاعروں کے سلسلے میں امریکہ گئے ہیں۔ میں نے آنس کو گاڑی میں بٹھایا تو وہ کہنے لگے ایک سکاچ کی بوتل رکھ لو۔ فراز کے گھر میں بغیر بوتل نہیں جا سکتا۔ وہ اتنا بدلحاظ ہے کہ مجھے اندر نہیں آنے دے گا۔ اس بات کا مجھے پہلے سے علم تھا اور میں نے بوتل رکھ لی تھی۔ گاڑی میری دوست کی کوٹھی پر پہنچی تو میں اُتری اور بیل بجائی۔

ملازم آیا جسے میں نے آنس کے سامنے پیش کر دیا۔

''جی سر! فراز صاحب تو ملک سے باہر ہیں۔''

''اوئے، کبھی وہ ملک میں بھی رہتا ہے کہ نہیں؟''

''سر جی، وہ مشاعرے کے لئے امریکہ گئے ہیں۔''

''تو پھر سن لو۔ یہ مشاعرے اُس کی جان لے لیں گے۔ وہ ایک دن امریکہ کی کسی سڑک پر گر جائے گا۔''

''جی سر!''

ملازم چلا گیا ــــ اور میں نے ڈرائیور سے کہا کہ اب چلو ــــ آنس نے مجھے کہا۔ ''فیض صاحب کے ہاں چلتے ہیں اور یہ بوتل اُن کے حضور پیش کرتے ہیں۔''

اب گاڑی میں بیٹھتے ہوئے میں نے سوچا۔ فیض صاحب کو فوت ہوئے زمانہ ہو چکا۔ یہ بوتل میں کس کی نذر کروں گی۔ پھر مجھے ڈاکٹر کی ہدایت یاد آئی کہ آپ نے ان کی بات کو چیلنج نہیں کرنا۔ چنانچہ میں نے ڈرائیور سے کہا ماڈل ٹاؤن میں ''فیض گھر'' کی طرف گاڑی لے لے اور اُسے نمبر بتا دیا۔ ڈرائیور اب اس نئے کھیل سے آشنا ہو چکا تھا۔ میں نے اُسے تمام نامور لوگوں کے پتے دے دیئے تھے۔ گاڑی سیدھی ''فیض گھر'' پہنچی۔ تو آنس نے کہا۔ ''یہ تو فیض کا گھر نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آنس سامنے لکھا ہے ''فیض گھر۔''

''اس کا مطلب ہے فیض نے گھر بدل لیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب وہ یہاں رہتے ہیں'' ــــ ''اچھا، تو بلاؤ فیض کو۔''

میں نے بیل دی تو ایک اچھی سی لڑکی اندر سے آئی، جسے فون پر میں نے سمجھا دیا تھا۔

میں نے کہا۔ ''فیض صاحب گھر پر ہیں۔ آنس اُن سے ملنے آئے ہیں۔''

''جی وہ تو بیروت میں ہیں۔ ان کی بیگم بھی ساتھ ہیں۔'' لڑکی نے کہا۔

''فیض صاحب بیروت میں ہیں۔'' میں نے کہا۔

''آؤ بیٹھو گاڑی میں۔ فیض ازل کا جلاوطن ہے۔ وہ کب گھر بیٹھا ہے۔'' اب میں گاڑی میں بیٹھ گئی تو کہنے لگے۔ ''اب بوتل تو کسی شرابی کو دینی ہے تو گاڑی ساقی فاروقی کی طرف موڑ لو۔''

اب میں نے سوچا کہ ساقی فاروقی کا انتقال لندن میں ہو چکا ہے۔ اُس کی بلیاں اور بیوی گنڈی بھی فوت ہو چکے ہیں تو میں نے ایسے میں ڈرائیور کو اشارہ کیا وہ ایک اور کوٹھی پر لے گیا۔ میں اُتری اور ایک بیل کے نتیجے میں ملازم باہر آیا۔

''ساقی فاروقی صاحب سے کہیں آنس آئے ہیں۔''

''جی وہ تو اس وقت عبداللہ حسین کی طرف گئے ہیں۔ اُن کے پب میں۔''

''مگر یہ ساقی فاروقی کا گھر نہیں ہے۔ ظالم نے گھر بھی بدل لیا۔ بتایا بھی نہیں۔ چلو بیگم چلتے ہیں۔''

اب گاڑی لاہور کی اُسی سڑک پر چل رہی تھی جس پر ہم کئی زمانوں کے چکر لگا چکے تھے۔ اور ہم اپنے گھر آ گئے۔ بڑی مشکل سے گولیاں کھلا کر سلایا کہ ڈاکٹرز نے مجھے اُن کا چارٹ دے دیا تھا۔

میں ہر طرح سے تیار تھی کہ آنس کب کب کیا یاد کر سکتے ہیں کہ ان کی زندگی میں جب سے میں آئی تھی، وہ ساری یادیں تو میرا بھی حصہ تھیں۔ اس لئے میں سوچتی رہتی تھی کہ اب یہ دہلی کو یاد کریں گے۔ کلکتہ، بمبئی، حیدر آباد دکن، لکھنؤ، بنگلور، جے پور میسور کو بھی یاد کریں گے۔ اس لئے کہ ان سب شہروں میں ہم جا چکے تھے اور وہاں ہمارے دوست موجود تھے۔ کچھ گذر گئے تھے کچھ موجود تھے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آنس تو گذر جانے والوں کو زیادہ یاد کر رہے تھے۔ یہ سلسلہ چل رہا تھا۔ اپنے رشتہ داروں اور اُن کے ساتھ گذرے واقعات تو کبھی کبھی بیچ میں آ جاتے تھے۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے کہنے لگے۔ ''فلم ''سن فلاور'' دیکھنی ہے۔ صوفیہ لارین کی بائیوگرافی پڑھی تھی۔ وہ لکھتی ہے کہ میں بچپن میں خوبصورت نہیں تھی۔ بچے میرا انداق اڑاتے تھے۔ میرا باپ میری ماں کو چھوڑ گیا تھا۔ میں بہت اداس رہتی تھی۔''

''فلم میں آپ کو لگا دوں، مل جاتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''نہیں، اب اتنا وقت کہاں ہے۔ ابھی مجھے برلن بھی جانا ہے۔ وہاں کے لئے تیاری کرنی ہے۔ تمہیں پتہ ہے سوزین کہ برلن میں ایک بہت بڑی تاریخ میرا انتظار کر رہی ہے۔'' میں چونکی کہ میرا نام سوزین نہیں ہے۔ میرا نام تو شہر بانو ہے اور اسی نام سے میری آنس سے شادی ہوئی تھی۔ اب یہ سوزین کون ہے؟ یہاں میرے اندر ایک خودغرض کہانی کار نے انگڑائی لی۔ مگر سوزین تو میری سوتن کے روپ میں آ رہی تھی۔ اب کہانی کار کو کچھ تو قربانی دینی ہوگی۔ میں خاموش رہی، بس اتنا کہا ــــ ''ہاں، برلن تو خود تاریخ ہے۔ کب جانا ہے؟'' ــــ

''سوزین! تمہیں تو پتہ ہے کہ یہاں فرینک فرٹ سے فلائیٹ ہے۔ سب انتظام ہو چکا ہے''___''ہاں ہاں، معلوم ہے۔''میں نے ذرااور کریدنے کی کوشش کی کہ کہانی سامنے آرہی تھی___پھر انہوں نے میرا اصلی نام پکارا۔''شہر بانو! تمہیں یاد ہے ایک بار ہم ملکہ پکھراج کے گھر گئے تھے۔کیا خاتون تھی۔ بے شمار انگوٹھیاں، جیولری، ہار سنگھار اور سب سے بڑھ کر اُس کے گھر کا مزاج___ کشمیر کے مہاراجہ کی معشوق تھی۔کوئی مذاق تو نہیں تھا''___اب میں نے مسکرا کے کہا۔''ہاں ہاں، یاد ہے۔کینال پر اُن کی بڑی سی کوٹھی بلکہ بنگلہ تھا۔اور کھانے میں کیا کیا پیش ہوا تھا۔مطلب وازوان، گوشتابہ، ہریسہ اور شب دیگ سب کچھ تو تھا۔''

''مگر سوزین! وہ سب بے ذائقہ تھا۔'' آنس نے کہا۔اب میں سوچنے لگی کہ آنس نے مجھے اور سوزین کو ایک کر لیا ہے۔جس کا مطلب ہے کہ ان کی زندگی میں میرے علاوہ سوزین بھی تھی اور اُس کی وہی عادت ہے جو میری ہے۔یعنی سوزین اور مجھ میں بال برابر فرق بھی نہیں۔وہ مجھے سوزین بھی سمجھتے ہیں اور شہر بانو بھی۔اب میرے لئے اہم بات یہ تھی کہ سوزین کون ہے؟ اتنا تو مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ سوزین کا تعلق جرمنی سے ہے۔کیونکہ فرینک فرٹ اور برلن کے ساتھ اُس کا ذکر آیا تھا۔یقیناً یہ میری شادی سے پہلے کا واقعہ ہے۔ جب آنس جرمنی اپنی ریسرچ کے لیے گئے تھے۔لیکن انہوں نے ایک لفظ بھی مجھے نہیں بتایا تھا کہ وہاں کوئی لڑکی یا عورت تھی جس کو وہ جانتے تھے۔مجھے ڈاکٹرز نے بتایا تھا کہ آنس اپنی زندگی کے وہ واقعات بھی سامنے لائیں گے جن سے میں واقف نہیں ہوں گی۔اس لئے میں نے اسے ایک عام سی بات سے تعبیر کیا۔ظاہر ہے عمر کے اس حصے میں کسی سوتن یا کسی ایسی عورت کا سوچنا جو میرے شوہر سے ہم بستری کر چکی ہو گی کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔چنانچہ میں چاہتی تھی کہ آنس خود ہی سوزین کے کردار سے پردہ اٹھائے۔میں لحہ بہ لحہ اور دن بدن سوزین کے نام کے ساتھ آنس کے تعلق کو رجسٹر کرتی رہی۔مطلب یہ کہ سوزین کا نام کس بات کے ساتھ آتا ہے۔اب جو میں نے ایک چارٹ بنایا تو وہ بہت واضح تھا مگر میرے لئے پریشان کرنے والا تھا۔مگر میں پریشان ہونے سے زیادہ اس حقیقت کو قبول کر رہی تھی۔اب جو میں نے ہر بار ہر بات کو کاغذ پر لکھا تو صورتِ احوال یہ سامنے آئی کہ میں آنس کی دیکھ بھال جس احتیاط سے کرتی ہوں، وہی احتیاط سوزین بھی کرتی تھی۔ مثلاً آنس کے ناخن میں کاٹتی تھی۔آنس کو کھانا میں کھلاتی تھی۔آنس کی رائیٹنگ ٹیبل کو میں صحیح کر کے رکھتی تھی۔ آنس کا لباس میں رکھتی تھی۔آنس کی جرابیں اور جوتے میں چُن کے رکھتی تھی۔آنس کا پرفیوم میں ہی چُن کے رکھتی تھی۔اس سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ کوئی میری طرح کی ایک خاتون آنس کی زندگی میں پہلے آ چکی ہے اور

شاید آنس نے مجھے یہ عزت اس لئے دی ہے کہ میں اُس پہلی خاتون کے عین مطابق ہوں۔ اب تو مجھے اپنے آپ سے وحشت ہونے لگی کہ میری کوئی خوبی میری نہیں ہے۔ جو بھی خوبی ہے وہ سوزین کی ہے کہ مجھے آنس سوزین کے معیار پر پرکھ رہا تھا۔ اب میں تو اندر سے ٹوٹ گئی۔ اب میں سوچنے لگی کہ سوزین کا نام کب آئے گا اور اس سے جڑی یاد کیا ہو گی۔ اس سے زیادہ اذیت ناک لمحہ کسی عورت کے لئے کیا ہو سکتا ہے۔ اب میں سوزین کو جانتی نہیں لیکن یہ جاننے لگی کہ وہ میری طرح کی ایک عورت ہے جو شوہر کا خیال رکھتی ہے۔ شوہر بھی کون ہے۔ جو ایک تاریخ دان ہے اور زندگی کی جزئیات سے واقف نہیں ہے۔ اب میرے دماغ میں سوزین داخل ہو چکی تھی۔ اس کا مطلب ہے سوزین اور میں ایک جگہ اکٹھے رہ رہے ہیں۔ یہ عجیب تجربہ ہے کہ دو عورتیں ایک دوسرے سے مختلف ایک ہی جگہ رہ رہی ہوں۔ مگر ہم اصل میں نہیں رہ رہی تھیں۔ ہم آنس کی یادداشت میں رہ رہی تھیں۔

ایک صبح میں نے کافی میز پر رکھی اور اخبار لینے گئی تو آواز دینے لگے۔ ''سوزین کافی اچھی بنائی ہے۔ مجھے اس کے ساتھ Olives اور Cheese بھی دیں۔'' میں نے گھر میں دونوں چیزیں رکھی ہوئی تھیں، لا کر دے دیں اور پھر سوچنے لگی۔ سوزین کی کہانی باہر کیسے لائی جائے۔ کچھ کچھ تو مجھے سمجھ آ رہی تھی کہ جرمنی میں ہائیڈل برگ یونیورسٹی گئے تھے ریسرچ کے لئے تو وہاں ایک سٹوڈیو اپارٹمنٹ میں رہتے تھے۔ کچھ تصویریں یونیورسٹی کی موجود تھیں۔ ان میں کچھ خواتین کے ساتھ بھی تصویریں موجود تھیں اور ایک تصویر میں ایک لڑکی ساتھ کھڑی ہے اور یہ وہ تصویر ہے جو علامہ محمد اقبال کی یاد میں بنائی گئی شاہراہ پر لی گئی ہے۔ ایسے لگتا تھا وہ سوزین ہے۔ مجھے کوئی تجسس نہیں تھا۔ بس یہ جاننا چاہتی تھی کہ ان کی یادوں میں کیا کچھ بے ترتیب ہو گیا ہے۔ ایک دن کیا ہوا؟

یہ کوئی سردیوں میں بارش کا دن تھا۔ صبح سے جھڑی لگی تھی اور ٹپ ٹپ برسے جا رہی تھی۔ آنس کو میں نے اُن کی سٹڈی میں بہت کچھ اوڑھا کر بٹھا دیا تھا۔ انگیٹھی سامنے موجود تھی اور سامنے کتابیں رکھ دی تھیں کہ شاید وہ اُن کتابوں کے ذریعے وقت کے کسی زاویے میں سانس لینے لگیں کہ اچانک آواز آئی۔ ''کیتھرین! میری چھتری کہاں ہے؟ مجھے برٹش میوزیم پہنچنا ہے۔ وہاں میری پروفیسر چیٹر جی سے ملاقات ہے۔ وہ انڈیا سے آئے ہوئے ہیں۔ جانا بھی مجھے انڈر گراؤنڈ سے ہے۔''

اب میں چونکی۔ سوزین کی جگہ اب کیتھرین لے چکی تھی اور وہ انگلینڈ میں تھی۔ لندن کی یہ بات تھی۔

یہ بھی مجھے معلوم تھا آنس ایک پروجیکٹ کے لئے جرمنی کے بعد لندن میں کچھ عرصے کے لئے رہے تھے۔ لیکن مجھے کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ کیتھرین بھی لگتا ہے یا تو ان کے ساتھ رہتی تھی یا بہت قریب تھی۔ ہو سکتا ہے اُس سے شادی کی ہو اور پھر وہ شادی نہ چلی ہو۔ اور شادی تو سوزین سے بھی ہو سکتی تھی اور ہو سکتا ہے ابھی تک وہ دونوں شادیاں قائم ہوں۔ اس کے بعد ڈاکٹرز سے ملنے گئی۔

ویسے بھی معمول کی ملاقات میں ڈاکٹرز کو اُن کے مریض کی حالت بتانے کے لئے ان سے ہفتے دس دن بعد ملاقات طے ہوتی تھی۔ میں نے انہیں ان دو کرداروں کے متعلق بتایا تو انہوں نے کہا۔

''ہم نے پہلے بھی بتایا تھا کہ رازوں بھرا صندوق کھل چکا ہے۔ ہم سائنس سے یہ ثابت نہیں کرنا چاہتے۔ آپ بہت پڑھی لکھی ہیں کہ انسان اپنے اندر قفل لگا لیتا ہے اور پھر جب اس کیفیت میں کبھی مبتلا ہوتا ہے تو وقت اور شعور کے سب قفل ٹوٹ جاتے ہیں اور دبی ہوئی روحیں باہر آ جاتی ہیں۔ یہ دونوں خواتین اُن کی زندگی میں رہی ہیں اور خاصے عرصے کے لئے رہی ہیں۔ پھر وہ ان سے الگ ہو گئے اور آپ سے شادی ہو گئی۔ اب وہ دونوں آپ کی طرح اُن کی زندگی میں شریک ہیں۔ اب ان خواتین کو موقع ملا ہے کہ وہ پھر سے اُن کی زندگی میں آ گئی ہیں''۔۔۔۔

''ڈاکٹر صاحب مجھے کیسے پتہ چلے گا کہ وہ دونوں کہاں ہوں گی اور آنس کی زندگی میں ان کا کیا کردار رہا ہوگا۔ میں کہانی کار ہونے کی وجہ سے معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ بیوی کی وجہ سے نہیں''۔۔۔۔

''ہاں، اب ایسے مریض کے اندر جو لہریں چلتی ہیں وہ جب اُس کے قابو میں نہیں تو اُس کے معالج کے قابو میں کیسے ہو سکتی ہیں۔''

''ہاں یہ تو میں بھی جانتی ہوں۔''

''تو انتظار کریں کہ آہستہ آہستہ یہ دونوں کردار آپ کی کہانی کی طاقت سے تشکیل پا جائیں۔''

''بہت بڑا چیلنج ہے ڈاکٹر صاحب۔ خیر دیکھتے ہیں۔''

میں آ گئی۔ مریض کی رپورٹ دے آئی۔ سوزین اور کیتھرین میرے لئے تو اتنے اہم ہو گئے کہ جیتے جاگتے کردار تھے اور پھر میرے خاوند سے جڑے ہوئے تھے۔ اب اگر آپ تخیل کو آزاد کریں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ ان سے آنس کے بچے بھی ہوں گے۔ ہو تو سکتے ہیں۔

اب میں دن بھر آنس کے معمول کو ترتیب دیتی رہتی تھی۔ احتیاط سے انہیں نہلاتی اور پھر کپڑے

پہنا کر بٹھاتی۔ کھانے پینے کا جو بھی چارٹ بنا تھا اس پر عمل کرتی۔ ایک دن میں نہلاتے ہوئے کمر پر صابن مل رہی تھی تو کہنے لگے۔ ''سوزین! ذرا نیچے ہاتھ لگائیں۔ مجھے خارش ہو رہی ہے۔''

اب میں ایک اور نتیجے پر پہنچی کہ سوزین تو ان کے بے حد قریب تھی کہ وہ ان کے ساتھ غسل بھی کرتی ہوگی۔ میں نے سوزین بن کے وہی عمل کیا۔ اور پھر انہیں سٹڈی میں بٹھا دیا۔ ایک کتاب اٹھا کر دیکھی اور کہنے لگے۔ ''مشرقی پاکستان ہم سے اس لئے الگ نہیں ہوا کہ ہم نے اُن پر اردو نافذ کر دی تھی۔''

میں چونکی کہ اب کوئی اور موضوع سامنے آ رہا ہے۔ ''ہاں یہ بات تو نہیں ہو سکتی۔ ویسے محمد علی جناح نے کچھ ایسی تقریر اردو کی قومی زبان کے حوالے سے کی تھی۔''

''ارے بھائی بہار کے لوگ بھی تو تھے وہاں۔ بنگال ہی تقسیم نہیں ہوا تھا بہار بھی تقسیم ہوا تھا۔ ویسے کیا کیا تقسیم نہیں ہوا تھا۔ اس کا پتہ محمد علی جناح اور اُن کے ساتھیوں کو نہیں تھا۔''

''نہیں تھا ــــــ یہی تو تاریخ کی سب سے بڑی سچائی ہے۔'' میں نے کہہ ہی دیا۔

''لیکن میری کتابوں کے لئے تو نہ ہندوستان میں وہاں کی حکومتوں نے اجازت دی نہ پاکستان میں اُن کو اجازت ملی۔ میں نے کیسا سچ بول دیا تھا۔ اس کا مطلب ہے گاندھی، نہرو، ابوالکلام، لیاقت علی خان، ماؤنٹ بیٹن اور جناح کا سچ ایک ہی تھا۔''

''ہاں، اُن سب کا سچ ایک ہی تھا۔'' یہ میں نے کہہ دیا اور اُس میں اضافہ یہ کیا کہ ''سچ روحِ عصر کا سچ ہوتا ہے وہ تاریخ کا سچ ہوتا ہے کسی ایک آدمی کا سچ نہیں ہوتا۔'' پھر میں نے کہا۔

''لیکن اس ساری سچائی کا بھید تو سعادت حسن منٹو نے کھولا جو صرف بیالیس سال کی عمر میں پاکستان میں آ کر فوت ہو گئے۔ کیسے فوت ہوئے یہ میں نہیں بتاؤں گی۔ مگر جو انہوں نے لکھا وہ یہ تھا۔ جس پر ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں نے پابندی نہیں لگائی۔''

''میرے ہندوستان کو انگریزوں نے ایسی کند چھری سے کاٹا کہ آدھا گاؤں ایک طرف تو آدھا گاؤں دوسری طرف۔''

''میں ایک دن پہلے پورے ہندوستان کا افسانہ نگار تھا اور دوسرے دن میں ایک چھوٹے سے ملک کا افسانہ نگار ہو گیا۔''

منٹو نے اور بھی بہت کچھ لکھا۔ ہاں میں بتانا چاہتی ہوں کہ کہانی کار ہوں ــــــ کہاں تک سنو گے

کہاں تک سناؤں____

''پنڈت جواہر لال نہرو، قائداعظم محمد علی جناح دونوں کے نعرے بازاروں اور سڑکوں میں گونجے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہندوستان اپنا وطن ہے یا پاکستان اور وہ لہو کس کا ہے جو ہر روز اتنی بے دردی سے بہایا جار رہا ہے۔ وہ ہڈیاں کہاں جلائی یا دفن کی جائیں گی جن پر سے مذہب کا گوشت پوست چیلیں اور گدھ نوچ نوچ کر کھا گئے تھے۔ اب کہ ہم آزاد ہوئے ہیں تو ہم غلام کب ہوئے۔ غلام تو ہندوستان تھا۔ پاکستان تو نہیں تھا۔''

جب میں نے یہ اقتباس پڑھا تو آنس چونکے۔ ''ہاں یہ تو میں لکھ چکا ہوں کہ آزاد تو وہ ہوتا ہے جو پہلے کسی کا غلام رہا ہو۔ ہم نے تو نیا ملک بنایا ہے تو آزادی کس بات کی۔ آزاد تو صرف ہندوستان ہوا ہے۔ جہاں سے انگریز نکلا ہے۔''

میں نے محسوس کیا کہ آنس کی یادداشت بہتر ہو رہی ہے۔ جب میں نے منٹو کا یہ اقتباس پڑھا ''ہندوستان آزاد ہو گیا تھا۔ پاکستان عالمِ وجود میں آتے ہی آزاد ہو گیا تھا۔ لیکن انسان ان دونوں مملکتوں میں غلام تھا۔ تعصب کا غلام، مذہبی جنون کا غلام، حیوانیت و بربریت کا غلام''____

تو آنس نے کہا۔ ''میں بڑا مؤرخ ہوں یا منٹو۔ اس کا تو فیصلہ کرنا پڑے گا۔ باتیں تو میں نے بھی یہی کی ہیں مگر منٹو نے جس طرح کی ہیں میں نہیں کر پایا۔''

میں خوش ہو گئی کہ اب آنس کی یادیں ایک ترتیب میں آ رہی ہیں کہ ساتھ ہی انہوں نے ایک عجیب بات کر دی۔

''میری کتابوں پر کس نے چھاپہ مارا تھا؟ اور ساری کتابیں لوٹ کر لے گئے تھے۔''

''آنس آپ کی تو کئی کتابوں پر چھاپہ پڑا تھا۔ آپ کس کتاب کی بات کر رہے ہیں؟''

''وہ جو بنگلہ دیش بننے کے بعد میں نے لکھی تھی''۔ ''ہاں اُس کا نام تھا Untold History اور وہ اب تک Untold ہے۔ ساری کاپیاں لے گئے تھے۔ پریس سے پلیٹیں بھی کتاب کی لے گئے تھے۔'' میں نے یاد دلایا۔ آنس نے کہا۔ ''مگر وہ ساری تاریخ اب بھی مجھے یاد ہے''۔ ''یاد ہے تو بتاؤ میں لکھتی جاؤں گی۔''

''باغیوں کے شبے میں پورے جنگل کو آگ لگا دی گئی تھی۔'' بس اتنا کہا اور کہیں کھو گئے۔ پھر وقفے سے بولے۔ ''ایک گاؤں تھا کہیں پر۔ بانسوں کے درخت تھے۔ ناریل کے پیڑ بھی تھے وہاں۔ رات کی ہوا

سرسراہٹ پیدا کر رہی تھی۔ آدھی رات ہو رہی تھی۔ گاؤں کے کتے بھی آدھے بھوکے آدھے پیٹ بھرے لوٹ لیٹ چکے تھے۔ ہوا درختوں کے بیچ میں سے خوشگوار تاثر کے ساتھ بہتی جا رہی تھی کہ اچانک کیا ہوا؟ چاروں طرف سے گاؤں کو گھیر لیا گیا۔"

"کن لوگوں نے گھیرا۔" میں نے پوچھ لیا۔

"تاریخ جاننے والوں کو بتانا ضروری نہیں ہے۔ اور پھر خانہ جنگی میں کون کون شامل تھا اور کس کا دھڑا مضبوط تھا اور کیوں تھا؟ یہ سب بتانا میری ذمہ داری نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے آپ جو جانتے ہیں وہ بتا دیں۔" میں نے بات کو روکنا مناسب نہ سمجھا۔

"گاؤں میں گھر نہیں ہوتے۔ رہنے کے لئے جھونپڑے ہوتے ہیں۔ جن کے دروازے نہیں ہوتے۔ آن کی آن میں سب جاگ گئے۔ جسم پہ نام کے کپڑے، بھوک سے نحیف و نزار جسم، موسم کی سختی سے جلے بدن، رنگت رات ہی میں رنگی ہوئی۔ ہم پاکستان کے لوگ ان کو بھوکے بنگالی کہتے تھے۔ بھات کھانے والے کس بات کی غیرت رکھتے تھے۔ یہاں کچھ پڑھے لکھے اس طرح کی بات کرتے تھے۔ مگر میں نے لکھا تھا کہ اردو زبان سے انہیں نفرت نہیں تھی۔ اگر نفرت ہوتی تو صرف چار سالوں میں اردو کی بیالیس فلمیں وہ نہ بناتے اور پورے پاکستان میں ریلیز نہ کرتے۔ اُن میں سے ایک درجن سے زیادہ فلمیں ایک سال سے زیادہ سینماؤں میں لگی رہیں۔ ان کے سائن بورڈ ہاتھ سے پینٹ کرنے والے بناتے تھے۔ یہ بورڈ دو برساتیں نہیں برداشت کر سکتے تھے۔ اس لئے ڈھل جاتے تھے۔ سینما والوں کو انہیں دوبارہ پینٹ کرانا پڑتا تھا۔ جب فیض نے نظم لکھی "ڈھاکہ سے واپسی پر" تو مجھے یاد آیا کہ "خون کے دھبے دُھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد" لیکن شبنم کی تصویر تو ایک ہی برسات میں دُھل جاتی تھی۔ اور پھر شبنم کے ساتھ بھی جو 1971ء میں نہیں ہوا تھا، 1981ء کی دہائی میں ہو گیا ــــ تاریخ نے بنگالیوں کو بخشا نہیں۔" آنس خاموش ہو گئے تو میں نے یاد دلایا کہ آپ ایک بانسوں کے جنگل اور گاؤں کی ایک رات کی بات کر رہے تھے۔ اب وہ چونکے۔

"ہاں وہ حملہ آور ہوئے تھے گاؤں پر اور ہر جھونپڑی سے مفلوک الحال، بھوکے ننگے لوگ باہر آ گئے۔ بچے ماؤں کے پاؤں سے لپٹ گئے۔ سب نے نیند سے نکل کر جو دیکھا وہ اُن کی سمجھ میں نہیں آیا ہوگا۔ پھر یوں ہوا کہ ایک لیڈر نے حکم دیا کہ عورتیں ایک طرف مرد ایک طرف۔ پل کے پل دو حصے بن گئے۔ چیتھڑوں میں لپٹے جسم ایسے تھے جیسے تاریخ میں غلاموں کے گروہ ملتے ہیں۔ حکم ہوا کہ عورتیں اپنا لباس اتار

دیں۔عورتوں کے جسموں پر بریز ئیر تو ہوتے ہی نہیں تھے اور دو چیتھڑے نیچے اور اوپر انہوں نے باندھ رکھے ہوتے تھے۔حکم ملا تو سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔مردوں نے اپنی عورتوں، بیٹیوں اور بہنوں کی طرف دیکھا تو پھر حکم ہوا کہ مردوں کو ایک طرف لے جایا جائے۔مردوں کو دھکیل کر ایک طرف لے گئے اور پھر حکم ہوا کہ ان کو فائرنگ سکواڈ کے سامنے ڈال دیا جائے۔دھڑ دھڑ دھڑ فائرنگ ہوئی اور بھوکے جسم گر گئے اور مٹی کی خوراک بن گئے۔

اب ان عورتوں نے جب مردوں کو گرتے دیکھا تو اپنے اپنے جسموں سے چیتھڑے اُتار کر پھینک دیئے۔ایک عورت غصے اور نفرت سے چیختی ہوئی حکم دینے والے کی طرف بڑھی اور جب وہ اُس کے قریب پہنچتی اُس کا جسم ٹھنڈا ہو چکا تھا۔اب ان عورتوں نے کہ بے لباس ہو چکی تھیں، تو ایسے میں حکم ہوا کہ جن عورتوں کی چھاتیاں ڈھلک گئی تھیں اور جسم بھوک کی وجہ سے اور چہرے کی رنگت کام کی وجہ سے سیاہی مائل ہو چکی تھی، وہ ایک طرف ہو جائیں۔وہ عورتیں ایک طرف ہو گئیں مگر یہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ حاکم کا معیار کیا ہے۔اب ہر عورت نے اپنی چھاتیوں کو دوبارہ دیکھا کہ وہ اس مقررہ معیار پر پوری اُترتی ہیں کہ نہیں ــــــ کچھ نے اپنے آس پاس دیکھا۔چمڑی تو سب کی ایک سی تھی۔بھوک بدن میں داخل ہو چکی تھی۔اب صرف وہ لڑکیاں سامنے رہ گئیں جو ابھی بلوغت کو پہنچ رہی تھیں یا پہنچنے والی تھیں۔'' یہ کہہ کر آنس خاموش ہو گئے۔میں نے چند لمحوں بعد پھر بات چلائی۔''اُس رات کی کوکھ سے جو ناجائز نسل پیدا ہوئی، وہ کن فٹ پاتھوں پر پلی ہو گی۔'' مگر آنس نے بات کو آگے نہیں چلایا بلکہ پوچھنے لگے۔''بہت دنوں سے حبیب جالب ملنے نہیں آیا۔''

''ہاں، سنا ہے وہ بیمار ہیں۔''

''تو چلو اُس سے مل آتے ہیں اور ایک فرمائش بھی کرنی ہے میں نے اُن سے۔''

''ڈاکٹروں نے ملنے پر پابندی لگائی ہے۔آپ نے کیا فرمائش کرنی ہے؟'' میں نے پوچھ لیا تا کہ جان سکوں ان کے دماغ میں کیا الجھن پھنسی ہوئی ہے۔

''میں نے فرمائش کرنی ہے کہ گمشدہ لوگوں پر ایک نظم لکھیں۔مجھے لگتا ہے گمشدہ لوگوں کی فہرست میں میرا نام بھی آنے والا ہے۔'' یہ کہہ کر پھر خاموش ہو گئے۔پھر بس اتنا بولے۔''اگر کوئی دروازے پر میرا پوچھنے آئے تو کہہ دینا۔وہ اُس تاریخ کے کمیشن میں شامل ہیں جو ویت نام میں اجتماعی قبروں کو دیکھنے گیا ہے۔اور انہوں نے ایک رپورٹ مرتب کرنی ہے۔''

''لیکن آپ تو بہت زمانہ ہوا، ویت نام سے آ چکے ہیں۔ آپ نے بتایا تھا۔'' میں نے ہمت کر کے کہا۔

''ہاں، مگر میں آیا کب تھا۔ میں تو ابھی تک وہیں پر ہوں۔ ابھی چاولوں اور سبزی کا سوپ پی کر آیا ہوں۔ مجھے اس کمیشن میں اس لئے شامل کیا گیا تھا کہ میں انگلینڈ کی یونیورسٹی میں پڑھا رہا تھا۔ اور ساؤتھ ایشین سٹڈیز میرا موضوع ہوتا تھا۔''

''ہاں، یہ تو مجھے معلوم ہے۔ پھر آپ نے جو دیکھا وہ لکھا بھی تھا؟''

''کہاں لکھ سکا تھا۔ وہ سب تو میرے اندر ہے۔''

''تو مجھے بتا دیں —— '' اب میں چاہتی تھی کہ وہ اس وقت ایک موڈ میں ہیں تو کچھ باتیں ایسی کر لیں جس سے اُن کے اندر کے رُکے چشمے رواں ہو جائیں۔

''ہاں، وہ ایسے ہے کہ ویت نام میں بارشوں کے جنگل، جھیلیں، تالاب، کھیت اور قدم بہ قدم گاؤں تھے۔ امریکہ کسی بھی شے سے واقف نہیں تھا۔ اُس کی ساری جاسوسی بے حد معمولی درجے کی تھی۔ جیسی جاسوسی افغانستان اور عراق کے حوالے سے تھی۔ اس لئے امریکہ کو بہت بڑا گدھا بھی کہہ سکتے ہیں۔ امریکی عوام اُس سے بڑی گدھی ہے کہ نہیں سمجھ سکی کہ امریکہ کہاں کہاں اپنی شکست کو خود دعوت دیتا رہا ہے۔ اب سارا سچ میں نے تو نہیں بولنا۔ بڑے بڑے ریسرچ کے ادارے تو اُن کے اپنے ہیں۔ جو گمراہ کرنے کے بڑے اڈے ہیں۔ میں کہہ رہا ہوں۔ امریکہ کو امریکیوں نے نہیں بچایا ہوا۔ دنیا کے اُس ٹیلنٹ نے بچا رکھا ہے جو وہاں روزگار کمانے گیا ہوا ہے۔'' آنس ذرا خاموش ہوئے تو میں سمجھ گئی کہ آج کل آنس کے اندر کس طرح کی لہریں چل رہی ہیں۔ میں نہیں بولی۔ ان میں رُکا چشمہ پھر سے پھوٹ پڑا ——

''کیا وجہ ہے کہ امریکہ کی ہر فتح کا انجام شکست میں چھپا ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے امریکی یونیورسٹیاں دنیا کی بڑی یونیورسٹیوں میں شامل ہیں۔ مان لیتا ہوں۔ وہ اس لئے کہ دنیا میں نوبیل انعام یافتہ سائنس دانوں، معیشت دانوں اور سوشل سائنس دانوں کی اکثریت کا ان یونیورسٹیوں سے تعلق ہے۔ مگر کسی نے غور کیا ہے کہ ان نوبیل انعام حاصل کرنے والوں کا تعلق کن ملکوں سے ہوتا ہے۔ میں بتاتا ہوں۔ کینیڈا، انڈیا، آسٹریا، آسٹریلیا، انگلینڈ، سویڈن، جرمنی، فرانس، پولینڈ، برازیل وغیرہ وغیرہ سے ہوتا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے امریکہ دنیا کی ذہانت کو میدان فراہم کرتا ہے۔ یہ بھی تو اُس کا ایک پلس

پوائنٹ ہے۔'' میں نے بات بڑھائی۔

''ہاں، یہ یوں بات ہے کہ امریکہ خود تو گدھا ہے مگر اس کا سسٹم، اُس کی گورننس، اُس کے قانون، اُس کا نیٹ ورک، اُس کے اداروں کی کارکردگی اعلیٰ ہے۔''

آنس ایسے بات کر رہے تھے جیسے لیکچر دے رہے ہوں۔ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ اگرچہ مجھے بار بار باورچی خانے سے خانساماں کھانا تیار ہونے اور لگانے کا اشارہ دے چکا تھا۔ میں اُسے روک رہی تھی۔ ''آپ ویت نام کی اجتماعی قبروں کی بات کر رہے تھے۔''

''ہاں ویت نام سے اگر امریکہ سبق سیکھ لیتا تو باقی دنیا اُس کے عذاب سے بچ جاتی۔ مگر ایسا نہیں ہوا کہ امریکیوں کو ایڈونچر اس لئے پیارا ہے کہ وہ خود ایڈونچر کی پیداوار ہیں۔ کیا تم نہیں جانتی قدیم امریکی قوم ایڈونچر کے نتیجے میں پیدا ہوئی اور امریکہ کو دریافت کیا گیا۔''

''ہاں، میں یہ سب جانتی ہوں۔'' آنس اب اپنے پورے علمی غصے میں تھے۔ میں نے روکنا مناسب نہ سمجھا۔

''تم نہیں جانتی کہ امریکی اُن کلاسیکی قوموں میں شامل نہیں ہیں، جن میں چینی، مصری، یونانی، ہندوستانی، عربی، افریقی اور جاپانی شامل ہیں۔ جن کی ہزاروں سال کی تاریخ ہے۔ اس لئے جب ویت نام میں گھسے تو نکلنے کا راستہ نہ مل سکا۔ پتہ ہے وہاں میں نے جو اجتماعی قبریں دیکھیں ان میں زیادہ قبریں امریکی فوجیوں کی تھیں جنہیں ان کے اسلحہ اور وردی میں لگے دھاتی بکسوؤں سے پہچانا گیا تھا۔''

''آپ نے تو خود دیکھا ہوگا سب؟'' میں نے ذرا بڑھاوا دیا۔

''ہاں ویت نامیوں کی اجتماعی قبریں بھی دیکھی تھیں۔ میں قبر کے کنارے کھڑا تھا اور ہڈیوں کا ڈھیر آپس میں گتھم گتھا ہو رہا تھا۔ چھوٹے قد والے لوگوں کی چھوٹی چھوٹی ہڈیاں ایسا لگتا تھا کہ وہ سب ایک دوسرے کے گلے لگ کر سوئے ہوں گے۔'' وہ خاموش ہو گئے۔ پھر وہ خود ہی بولے۔ ''ویت نامیوں کا عقیدہ ہے کہ جن زمینوں میں ویت نامی لوگوں کی اجتماعی قبریں ہیں، وہ زمینیں زرخیز ہیں۔ سال میں دو دو تین تین فصلیں اگاتی ہیں اور جن زمینوں میں امریکی فوجیوں کی اجتماعی قبریں ہیں وہاں صرف گھاس اُگتی ہے——''

آنس اب خاموش ہو چکے تھے۔ میں نے کھانا لگوایا تو ایک عجیب واقعہ ہوا۔ وہ کھانا کھاتے ہوئے بولے——

''اُستاد دامن کے ہاں جانا ہے۔ استاد کریلے گوشت ایسے بناتا ہے کہ ٹبی گلی کے سارے کنجروں

کے گھروں پر اوس پڑ جاتی ہے۔''میں سارا کلچر چونکہ جانتی ہوں اس لئے میں نے محسوس کیا آنس اب ایک اور رُخ پر چل پڑے ہیں۔ میں نے لقمہ دیا۔''یہ کنجر گوشت کیا ہوتا ہے؟''اب تو آنس کے اندر آبشار پھوٹ پڑی۔

''اصل میں یہ ایک لاہور کے اندرون کے رہنے والوں کا بکرے کے گوشت کے پکوانوں کی ایک ڈش ہے۔اور یہ جو گُنی لوگ ہوتے ہیں۔''

''گُنی سے آپ کی کیا مراد ہے؟''میں جانتی تھی، جان کے پوچھ لیا۔

''گُنی لوگ موسیقی، رقص، شاعری اور تھیٹر سے وابستہ ہوتے ہیں۔ یہ پیدائشی فنکار ہوتے ہیں۔ ان کو اچھی خوراک چاہئے ہوتی ہے اس لئے ان کے استاد ان کے لئے پہلوانوں والی خوراک تجویز کرتے ہیں۔ پہلوانوں کی خوراکیں زیادہ غیر انسانی ہوتی ہیں مگر ان فن کاروں کی خوراکیں بہت اچھی اور اُن کے گلے کی طاقت کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔اس لئے گُنی لوگ بکرے کے گوشت کے پکوان بنانے کے لئے پہلے بکرے کا وزن اور صحت دیکھ کر انتخاب کرتے ہیں پھر اُس بکرے کے جسم کے کچھ حصوں کے حوالے سے یہ تجویز کرتے ہیں کہ بکرے کے جسم کا کون سا گوشت کس کام کے لئے موزوں ہے۔مثلاً اُستاد دامن کہتے تھے میں کریلے گوشت کے لئے بکرے کی پٹھ کا گوشت خود جا کر لیتا ہوں۔پٹھ سے مراد بکرے کی پیٹھ ہے۔اسی طرح استاد دامن نے جب پلاؤ بنانا ہوتا تھا تو وہ بکرے کی گردن، سینہ اور چانپوں کا گوشت لیتے تھے۔اُستاد دامن کے ہاں میں کئی بار فیض احمد فیض کے ساتھ ان کے حجرے میں گیا۔ جہاں اُستاد خود کھانا بناتے تھے اور جب وہ کھانا لگاتے تو یہ ضرور کہتے۔''فیض توں ایس بوٹی نوں پیار نال کھا۔تینوں استاد دا ذائقہ ملے گا۔''ایک دن ایسا ہوا کہ استاد باہر سے روٹیاں لگوا کر آیا جو بہت تازہ تھیں۔لیکن فیض نے بس اتنا کہہ دیا کہ استاد جو مزہ اُستاد کے کلچے میں ہے وہ کہاں۔بس اس پر تو استاد دامن تڑخ گئے۔ کہنے لگے''فیض تم اپنے استاد صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی بات کر رہے ہو۔ جو اپنے بزرگوں کے تندور پر امرتسر میں کلچے لگاتا تھا۔''فیض ناراض ہو گئے اور کہا۔''ہاں، وہ گورنمنٹ کالج میں میرا استاد بھی ہے اور شاعری میں بھی استاد ہے کہ اُس نے سینکڑوں مشورے مجھے دیئے ہیں جو میں نے قبول کئے ہیں۔''اب استاد دامن اور فیض میں ٹھن گئی۔بات یہاں ختم ہوئی کہ میاں فیض ہمیں صوفی صاحب کے ہاتھ کا کلچہ کھانا ہے۔فیض صاحب نے معاملہ طے کر دیا۔لو جی اگلے دن ہم سب صوفی صاحب کے ہاں سنت نگر پہنچے جس کا شاید اب کچھ اور نام ہے۔پھر کیا تھا۔دھوتی باندھے صوفی صاحب

آ گئے۔ استاد دامن نے بھی دھوتی باندھی ہوئی تھی۔ فیض صاحب سوٹ ٹائی میں تھے۔ جب صوفی صاحب تک پورا معاملہ پہنچا تو انہوں نے کہا۔ ''اب میں اپنے آباؤ اجداد کی تکریم کے لئے خود کلچہ لگاؤں گا کہ ہمارا صوفی خاندان امرتسر میں اسی لئے مشہور ہے۔'' اور پھر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے دھوتی باندھتے ہوئے تندور پر روٹی کے آٹے کو دبایا اور کلچے کے لئے تیار کیا اور کلچہ لگایا۔ ایک، دو، تین اور کلچے باہر آئے۔ اب تو استاد دامن، فیض صاحب کو دیکھنے لگے کہ کریلے گوشت کے بعد کلچے کی روایت بھی کامیاب ہوئی۔ یہ لوگ کون تھے اور اب ہمارے گھر کیوں نہیں آتے؟''——

''وہ اصل میں سب مصروف ہیں۔ اس لئے نہیں آتے۔'' میں نے بات بنائی۔

''اچھا تو اُن سے کہہ دو۔ میں جب نہیں رہوں گا تو پھر آئیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ اُٹھ گئے——اور میں نے انہیں سلا دیا——

صبح میں انہیں تیار کرانے لگتی تو کبھی سوزین اور کبھی کیتھرین کہہ کر بات کرتے۔ کوئی بات جو کبھی ان دونوں کے ساتھ کہیں نہ کہیں ہوئی ہوگی۔ اور کبھی مجھے میرے نام سے پکارتے۔ یہ تین عورتیں اُن کی یادوں میں اوپر نیچے ہوگئی تھیں۔ مگر ایک بات تو ثابت ہو رہی تھی کہ سوزین اور کیتھرین اُن کی زندگی میں آئی تھیں اور اُن سے الگ الگ رشتہ بہت قریب کا رہا ہوگا۔ اب میں یہ تو جان ہی گئی تھی کہ دونوں نے ان سے محبت بھی کی تھی اور بے حد خیال بھی رکھا تھا——دن کے پہلے حصے میں وہ اپنی لائبریری میں بیٹھتے تھے اور کتابوں کے ساتھ جو یادیں جُڑی تھیں، وہ کبھی کبھی اُن کے سامنے آجاتی تھیں۔ جو ظاہر ہے فطری بات تھی۔

ایک دن آنس نے کتابوں میں سے ایک کتاب نکالی۔ وہ کے۔ کے۔ عزیز کی کتاب ''مرڈر آف ہسٹری'' تھی۔ کہنے لگے۔ ''یہ کے۔ کے۔ عزیز بھی کافی ہاؤس میں بیٹھتا تھا۔ اس نے کافی ہاؤس کی یادیں لکھی ہیں۔ میں ابھی جوان تھا اور تاریخ میں منہ مار رہا تھا تو یہ کتاب دیکھ لی۔ پہنچا سیدھا کافی ہاؤس، سامنے کے۔ کے۔ عزیز بیٹھے تھے عبداللہ ملک کے ساتھ۔ مجھے دیکھا تو کہا۔ ''آؤ ینگ مین۔ یہاں کے پیٹیز اچھے ہوتے ہیں۔ آؤ بیٹھو۔'' میں بیٹھ گیا۔ پھر میں نے کہا۔ ''آپ کی کتاب دیکھی ہے۔ مرڈر آف ہسٹری۔''

''ہاں، پڑھی بھی کہ بس نام تک بات ہے؟''

''پڑھی ہے۔ مجھے کتاب کے نام پر اعتراض ہے۔ ہسٹری کا مرڈر کوئی نہیں کرسکتا۔ ہسٹری کو کوئی مار نہیں سکتا۔ ہسٹری کو مارنے والا خود مر جاتا ہے۔ ہسٹری زندہ رہتی ہے۔ ہسٹری نقاب اوڑھ کے چھپ جاتی

ہےاور جب وہ وقت گذر جاتا ہےتو پوری طاقت سے پھر سامنے آجاتی ہے۔''

''برخوردار! میں نے بھی یہی بات کی ہے۔جذباتی ہوجاتے ہوتم لوگ۔بڑوں پر چاند ماری کرنے میں ہمیں بھی مزہ آتا تھا۔ٹوئن بی پر میں نے بھی بہت اعتراض اٹھائے تھے۔میں نے بھی بتایا ہے کہ یہ جو سچ ہے یہ کبھی مرے گا نہیں۔اگر چہ تم نے ہسٹری کا مرڈر کرنے کی کوشش کی ہے۔''

''آج مجھے کے۔کے۔عزیز کی بات ٹھیک لگتی ہے۔ویسے وہ کہاں گیا ہے؟ کسی ملک میں سفیر تو نہیں لگ گیا۔ویسے اُسے پاکستان کا سفیر ہونا چاہئے تھا۔''

''کے۔کے۔عزیز پاکستان میں تاریخ کمیشن کا سربراہ تھا۔ہوسکتا ہے اب بھی وہیں ہو۔''میں نے ایسے ہی بات بنائی تو آنس نے اچانک خوشونت سنگھ کی کتاب اٹھالی۔جو اُس کی بائیوگرافی تھی ''Truth, Love and Little Malice''جو میں بھی پڑھ چکی تھی۔اب تو ان کے اندر یادوں نے قیامت مچادی۔

''یہ سِکھڑا بھئی کیا آدمی ہے۔اس نے مجھے اپنی کمینگی کے ایسے ایسے قصے سنائے کہ کیا بتاؤں—— لارنس روڈ پر اپنا سامان اپنے سینئر وکیل کیا نام تھا؟ گولی مارو—— کے ہاں رکھ کے گیا کہ میں واپس آؤں گا اور باپ کا خواب پورا کروں گا۔مطلب وکالت کروں گا۔اب پوچھو سامان میں کیا تھا۔ایک دھوتی،ایک بستر، ایک ٹائی،ایک وہسکی کی خالی بوتل،جاتے جاتے جو بچی تھی وہ بھی پی گیا۔خود اُس نے مجھے بتایا تھا——اور کیا تھا سالے کے پاس۔کچھ یاد ہیں تمہیں ہڈالی ضلع خوشاب کی۔تو خوشاب سے مجھے یاد آیا۔دہلی میں فیض احمد فیض کے ایک چاہنے والے نے مجھے لنچ پر بلایا تھا۔میں چلا گیا تو وہ مجھے اپنے بڑے سے حویلی نما گھر میں لے گیا اور بتایا کہ میں اپنے بزرگوں کے گھر وادی سُون سکیسر میں گیا تھا جو خوشاب کے پاس ہے۔وہاں سے میں مالٹے اور کینو کے پودے اور سُون سکیسر کی مٹی ہندوستان لایا تھا اور پھر میں نے وہ پودے اُگائے۔آج وہ پھل دے رہے ہیں۔''

میں آنس کو خوشونت سنگھ کی یاد پر واپس لانا چاہتی تھی۔''تو پھر خوشونت سنگھ نے آپ سے کیا ملاقات کی؟''—— میں نے آنس کی ایک اور طرف توجہ دلائی۔

''ہاں جب میری پہلی ملاقات دہلی میں خوشونت سنگھ سے ہوئی تو اُس نے مجھے دہلی جمخانہ میں بلایا۔میں وہاں ایک کانفرنس میں گیا ہوا تھا۔دہلی جمخانہ تو لاہور جمخانہ سے بہت مختلف تھا۔انگریزوں نے دہلی کو بہت اہمیت دی تھی۔کئی قسم کے ہال،کئی قسم کے فلور،کئی قسم کی شراب گاہیں،کئی قسم کے ریستوران، میں اور

خوشونت سنگھ لکڑی کے فلور والے ڈائننگ میں بیٹھے تھے۔ اور وہاں کے بیرے، بلیک لیبل کی بوتل، برف کی بالٹی اور خوبصورت گلاس لے کر حاضر ہوئے۔ اور ہم نے اپنا کام شروع کر دیا۔ ایک پیگ ابھی اندر ہی گیا تھا کہ خوشونت سنگھ نے مجھے مخصوص سرداروں والی طنز کے انداز میں دیکھ کر کہا۔ ''اگر میں آپ کے مسٹر جناح کی بات مان لیتا تو ''ٹرین ٹو پاکستان'' لکھنے سے بہت پہلے میری لاش کا ایک ٹکڑا لارنس گارڈن میں چیلیں کھا رہی ہوتیں اور دوسرا ٹکڑا گورنمنٹ کالج لاہور کے اوول گراؤنڈ میں کئی دنوں تک بُو دیتا رہتا۔''

''کیوں؟ جناح صاحب نے آپ سے کیا کہا تھا؟''____

''جناح صاحب کی دہلی میں کوٹھی ہماری کوٹھی کے ساتھ تھی۔ میرے ولیمے پر جناح صاحب تشریف لائے تھے اور مجھے سلامی دے کر چلے گئے تھے۔ میرے ولیمے میں باؤ جی نے لمبی شرابیں، گوروں، ہندوؤں اور آپ جیسے مسلمانوں کے لئے رکھی تھیں۔ مگر جناح صاحب چند لمحے بیٹھ کر چلے گئے۔ مگر پھر واپس آئے اور میرے باؤ جی کو ایک طرف لے گئے اور کچھ کہا____''

''کیا کہا جناح صاحب نے؟ مجھے تو معلوم ہو۔''

''وہی جو آپ جانتے ہو کہ بیٹے سے کہو لاہور والا گھر اپنے پاس رکھے۔ میں نے بھی بمبئی والا گھر رکھا ہوا ہے۔ ہمارا آزادانہ آنا جانا رہے گا۔ پاکستان کے قیام سے ہمارے رشتوں رابطوں میں کوئی خلل نہیں آئے گا۔''

''سنگھ صاحب آپ کی اردو تو قابلِ رشک ہے۔''

''آپ کو کیا معلوم کہ اردو ایک تہذیب ہے۔ اردو زبان نہیں ہے۔ جو گورنمنٹ کالج میں پڑھا ہو آپ اُس سے اردو کی بات کریں گے۔''

''سنگھ صاحب آپ سینئر ہیں۔ مجھے تو خوشی ہو رہی ہے کہ جس سے میں ملنے کی اتنی آرزو رکھتا تھا وہ سامنے ہے۔ اب آپ جناح صاحب کی بات کو آج کہاں دیکھتے ہیں۔''

''جناح صاحب کے ساتھ بڑا دھوکہ ہوا جو ایک عالم فاضل آدمی کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ نہرو اور ماؤنٹ بیٹن گھاٹ گھاٹ کا پانی پئے ہوئے تھے اور جناح صاحب اصول اور قانون کی کتابوں کو جانتے تھے۔ جناح صاحب نے شیکسپیئر تو ضرور پڑھا ہوگا۔''

''آپ کی بات سنگھ صاحب میں سمجھ گیا ہوں۔ ذرا اور وضاحت کر دیں کہ میں وہ مؤرخ ہوں جس

کو پاکستان میں مذہبی حلقوں سے مخالفت کا سامنا ہے۔''

''یہ میں جانتا ہوں۔اس لئے بات کررہا ہوں۔''

''جناح صاحب نے پاکستان کی کامیاب تحریک چلائی۔ ہندوستان کو تقسیم انگریز نے کیا تھا۔ کیا آپ اس بات کو سمجھتے ہیں؟''

''کیا میں نہیں سمجھوں گا۔جس نے اندرا گاندھی کی ایمرجنسی میں کھُل کر احتجاج کیا۔''

''مگر سنگھ صاحب السٹریٹڈ ویکلی کے کالم نگار کا احتجاج اور ہوتا ہے اور سکھ خالصا کا احتجاج اور معنی رکھتا ہے۔''

''That's true ۔مگر آپ نے بھائی صاحب کیا کیا؟ جن مولویوں نے پاکستان کی مخالفت کی تھی،آپ نے اپنا پاکستان انہیں پلیٹ میں رکھ کے پیش کردیا۔اوئے ایک افسانہ نگار تم سب پاکستانی مورخوں اور لیڈروں سے زیادہ دوراندیش نکلا۔جس نے پاکستان بننے کے صرف دوسال بعد انکل سام کے نام خط میں لکھا۔سنو۔''ہندوستان لاکھ ٹاپا کرے آپ پاکستان سے فوجی امداد کا معاہدہ ضرور کریں گے۔آپ کو اس دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے استحکام کی بہت زیادہ فکر ہے اور کیوں نہ ہو۔اس لئے کہ یہاں کا مُلّا روس کے کمیونزم کا بہترین توڑ ہے۔آپ سب سے پہلے ان ملاّؤں کو مسلح کیجئے گا۔ان کے لئے خالص امریکی ڈھیلے، خالص امریکی تسبیحیں اور خالص امریکی جائے نمازیں روانہ کیجئے گا۔اُستروں اور قینچیوں کو سرفہرست رکھیے گا۔خالص امریکی خضاب لاجواب کا نسخہ بھی آپ نے ان کو مرحمت فرمایا تو سمجھئے پوبارہ سوویت روس کو اس کے بعد یہاں سے اپنا پاندان اٹھانا ہی پڑے گا۔''

''ارے سنگھ صاحب! منٹو نے تو اور بھی بہت کچھ لکھا ہے۔پاکستان صرف ملاّؤں کی جنت ہی نہیں بنا۔وہ جو نچلے طبقے کے مسلمان بہتر مستقبل کی تلاش میں ہجرت کر کے گئے تھے،اُن کے لئے بھی جنت بن گیا کہ وہ خرادیے لوہار تھے جو جاتی امرا سے اٹھے اور پھر وہ پاکستان میں فوجی سیاست کے ذریعے لندن کی جائیدادوں کے مالک بھی بنے۔پاکستان کے مختلف مافیاز کے مالک بھی بنے۔انہوں نے مل کر پاکستان کی زراعت پرشب خون مارا۔اور دیکھتے ہی دیکھتے ہرے بھرے کھیت کھلیان اور جنگل بیلے کنکریٹ کے پلازوں، شاپنگ مالوں اور ہاؤسنگ سوسائٹیوں میں تبدیل ہوگئے۔''

''اب آپ کو اندازہ ہوا کہ نہیں پاکستان کو ایک مضبوط فوج کیوں چاہیے تھی کہ بڑے دشمن

ہندوستان سے بچانا تھا۔ گویا پاکستان اپنے ایک بڑے دشمن کے ساتھ وجود میں آیا۔''

''سنگھ صاحب اور انڈیا کے ساتھ کیا ہوا؟ یہاں مسلمان سے ووٹ لینے کے لئے اُسے ہندو سے ڈرایا گیا اور ہندو سے ووٹ لینے کے لئے مسلمان سے ڈرایا گیا اور سکھوں کو تو آپ ڈرا نہ سکے۔''

''میں تو آپ سے بھی دو قدم آگے بات کروں گا کہ جس طرح انگریز نے Divide and Rule کا فارمولا آزمایا تھا۔ نہرو کے جانشینوں نے بھی وہی کیا اور یہ بابری مسجد کیا ہے؟ کیوں شہید ہوئی؟ بہت افسوس تھا اُس دن مجھے جب یہ واقعہ ہوا۔ میں رویا اور میں اُسی طرح رویا جب پاکستان ٹوٹا اور بنگلہ دیش بنا ـــــ میں رویا۔ اس لئے کہ میرا وطن پاکستان دو ٹکڑے ہوا۔''

''تو ثابت ہو گیا ناں کہ ہندوستان کا بٹوارہ انتہا پسندوں کے لئے جنت ثابت ہوا ناں۔ صوفیوں، بھگتوں، سنتوں اور اولیاء اللہ نے جو پیغام پھیلایا تھا اور سب مذاہب کو آپس میں مل جل کر رہنے کا جو راستہ دکھایا تھا، اُسے ہمارے آپ کے لیڈروں نے اپنی ضرورتوں کی بھینٹ چڑھا دیا۔''

''یار پاکستان جب بنا تم تو تھے۔ میں شاید پنگھوڑے یا چلو کہیں رینگ رہا تھا۔ کیا یہ ضروری تھا؟''

''اب میں بکواس کروں گا تو وہ سکھڑے کی بکواس ہوگی۔ خیر میں کسی سے ڈرتا نہیں ـــــ اپنے باپ سے نہ ڈرا۔ جو کہتا تھا بڑے وکیل بن جاؤ۔ جناح صاحب جیسے کامیاب وکیل بن جاؤ اور میں منظور قادر کے چیمبر میں بیٹھا بھی۔ مگر دل نہ مانا۔ وجہ بھی سنو۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے نیو ہوسٹل میں جو میرا کمرہ تھا۔ اس کی کھڑکی لاہور شہر کی کچہری کی طرف کھلتی تھی۔ میں اُٹھ کر باہر دیکھتا تھا تو کیا دیکھتا تھا۔ قیدیوں کی گاڑیاں آتی تھیں۔ ہتھکڑیوں اور لوہے کی بیڑیوں میں جکڑے قیدی اُترتے تھے۔ اور کالے کوٹ پہنے ہوئے وکیل فائلیں اٹھائے اِدھر اُدھر روزگار کے پیچھے بھاگتے دکھائی دیتے تھے۔ اس لئے میرے اندر نفرت بیٹھ گئی کہ میں وکیل نہیں بنوں گا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔ اب پاکستان بننے کے حوالے سے بکواس کب کرو گے؟''

''یہ کون سا پیگ چل رہا ہے؟'' خوشونت گنتی بھول گیا تھا۔

''سنگھ صاحب آپ گنتی بھول گئے۔''

''لو میں جب جوان تھا تو بستر میں بھی گنتی بھول جاتا تھا۔''

''اب ایسے نہ ہیرو بنو۔ تمہاری بائیوگرافی پڑھی ہے۔ بمبئی کی جھونپڑی کی مہاراشٹر کی گھاٹن نے

نچوڑ لیا تھا آپ کو۔۔۔۔''

''چھوڑو یار۔۔۔۔ رات گئی بات گئی۔ بات یہ ہے کہ یہ میرا پانچواں چل رہا ہے اور آخری ہے۔''

''میں نے پوچھا ہے کہ پاکستان بننے کے حوالے سے تمہارے کیا وچار تھے یا ہیں؟''

''اب چونکہ میں سچ بولنے کے آخری نکتے پر ہوں۔ آخری سیڑھی پر ہوں تو سنو۔ اگر ہندوستان کو تقسیم ہی ہونا تھا تو اس طرح تقسیم نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

''تو کس طرح تقسیم ہونا چاہیے تھا؟''

''اگر ہندوستان نے ٹکڑے ٹکڑے ہونا ہی تھا تو تین یا چار مسلم ریاستیں بنی چاہیے تھیں۔ ''United States of Muslim India'' جس میں بنگال، حیدرآباد، بہاولپور، قلات، بنگال، پنجاب کی ریاستیں آنی چاہیے تھیں۔''

''میں بھی تاریخ لکھتا ہوں اور تم بھی کسی بھی طرح سے مسٹر سنگھ۔''

''اب اومُو سلے۔ میں تاریخ نہیں لکھتا۔ تاریخ کی ٹریجڈی لکھتا ہوں اور میں نے وہ ٹریجڈی لکھ دی ہے۔ ایک اور ٹریجڈی میرے ساتھ ہوئی ہے جو میں لکھنا چاہتا تھا لکھ نہیں سکا۔ خواہ مخواہ فضول چیزوں میں شہرت مل گئی۔ میرا کالم لوگوں نے بانس پر چڑھا دیا۔ میں کلچرل ہسٹری لکھنا چاہتا تھا۔ میں آرٹ Historian بن سکتا تھا۔ میں اور ناول لکھ سکتا تھا۔ میں ہندوستان کے کئی خزانوں پہ بیٹھا تھا۔ ان خزانوں کا کھوج نہ لگا سکا۔''

''سکھڑا سچ کہتا تھا۔ اُس شام سچ بول گیا۔'' میں نے اور بات بڑھانے کے لئے آنس سے کہا۔

''اور کیا کیا باتیں ہوئیں؟''

''کون سی باتیں؟ میں پتہ نہیں کیا بات کر رہا تھا۔'' پھر وہ خاموش ہو گئے۔ دیر تک خاموش رہے۔ میں نے دیکھا اب انہیں آرام کرنا چاہیے۔ انہیں سٹڈی سے ٹی وی لاؤنج میں لے آئی۔ انہیں کسی اچھے چینل پر ایک فلم لگا کر دی۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ انگریزی فلموں کے تاریخی پس منظر یا معاشرتی پس منظر میں ایسے گم ہوتے کہ کہیں اور جا نکلتے۔ فلموں نے انہیں ایک نئی دنیا دے دی تھی۔ وہ خود کو فلموں میں خود ہی شامل کر لیتے تھے اور کبھی خود سمجھتے کہ جو کچھ فلم میں ہو رہا ہے وہ ان کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اُس شام میں فلموں کے چینل گھماتے گھماتے ایک ایسی فلم پر آ کر رکی جو میری دیکھی ہوئی تھی ''Bucket List''۔ یہ دو لوگوں کی کہانی ہے دونوں

عمر کے اُس حصے میں ہیں، آنس بھی عین اُسی عمر سے گذر رہے تھے۔ وہ دونوں کردار ہالی وڈ کے دو مشہور اداکاروں جیک نکلسن اور مورگن فری مین نے کئے تھے۔ دونوں کی کہانی آنس سے ملتی جلتی تھی۔ یہ محض اتفاق تھا۔ جیک نکلسن اور مورگن فری مین دو ایسے مریض ہیں جن کی زندگی تقریباً ختم ہونے والی ہے۔ وہ دونوں سوچتے ہیں کہ زندگی تو جا ہی رہی ہے چونکہ دونوں بہت امیر لوگ ہیں تو سوچتے ہیں زندگی میں وہ جو چاہتے تھے نہیں کر سکے تو اپنی خواہشوں کی فہرست بنائیں اور پھر جو زندگی بچی ہے اس میں ان کو پورا کریں۔ تو وہ لسٹ بناتے ہیں۔ یہاں آنس نے کاغذ قلم لیا اور کچھ لکھا اور آنس ان دو کرداروں کے ساتھ شامل ہو گئے کہ یہ دو نہیں اب تین ہیں ـــــ مجھے معلوم تھا یہ فلم ایسے موقع پر لگی ہے کہ آنس اب زمان و مکاں سے خود ہی باہر نکل جائے گا۔ وہ دونوں کردار بہت ذہین ہیں۔ ایک دوسرے سے بحث بھی کرتے ہیں۔ اب اس بحث میں آنس شامل ہو چکے تھے۔ جب دونوں یہ طے کرتے ہیں کہ انہوں نے ساتوں عجوبوں میں سے کم سے کم چار عجوبوں کو دیکھنا ہے تو آنس بولے۔ ''نہیں میں تاج محل دیکھنے نہیں جا رہا۔ میں دیکھ چکا ہوں۔ تم دونوں آپس میں مل گئے ہو۔ اب مجھے جانا تو پڑے گا۔ اچھا دیکھتے ہیں تم دونوں تاج محل کو کیسے دیکھتے ہو۔'' جب تاج محل پر دونوں جاتے ہیں، آنس بہت بے چین ہو کر ان کی باتیں سنتے اور پھر خود بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ جب وہ کہتے ہیں اتنے ہزار رضا کاروں نے تیرہ سال تک تاج محل کی تعمیر میں حصہ لیا تو آنس چیخے۔ ''اتنے ہزار رضا کار نہیں غلام تھے غلام ـــــ '' اور پھر یہ بات کسی اور طرح سے اُن میں سے ایک کردار کرتا ہے تو آنس تالی بجاتے ہیں اور پھر آنس اونچی آواز میں کہتے ہیں۔ ''اے میرے دوستو۔ سنو مجھے بھی سنو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم نہیں جانتے مغل ہسٹری میں جانتا ہوں۔ ممتاز محل تیرہواں بچہ پیدا کرتے ہوئے مری تھی۔ اور وہ بھی کیسے؟ جب ایک جنگی مہم سے واپسی پر قافلے میں ممتاز محل کسی اونٹ کسی گھوڑے کسی بگھی میں سوار تھی اور پھر وہ ہوا جو کسی حاملہ عورت کے ساتھ ہوتا ہے۔'' آنس چیخے۔ میں نے فلم بند کر دی۔

''فلم کہاں گئی۔ میں تو اُن کے ساتھ تھا۔ ابھی تو ہم نے کوہ قاف پہ جانا تھا۔ میں نے بھی کوہ قاف جانا ہے۔''

میں نے فلم دوبارہ لگا دی تو وہ ہانگ کانگ گئے۔ چین کی دیوار چین پر موٹر سائیکل چلائی اور پھر ہمالیہ کی برفوں میں گئے۔ آنس کو لگا کہ کوہ قاف پر چلے گئے اور وہ دیکھنے لگے۔ ایک فلم نے میرے آنس کو یہاں سے فلم کی لوکیشن پر پہنچا دیا تھا۔ اب اسے میں فلم کا میجک کہوں یا آنس کی وقت اور لوکیشن سے علیحدگی کہوں کہ وہ

کوہ قاف پہنچے تو آنس بھی اُن کے ساتھ تھے اور وہاں تینوں، مطلب دونوں نے وعدہ کیا کہ جب وہ مر جائیں گے تو ان کے جسموں کو جلایا جائے گا اور ان کے جسموں کی راکھ یہاں کوہ قاف میں پہنچائی جائے گی۔

آنس نے کہا۔ ''میں تو مسلمان ہوں۔ میری تو قبر بنے گی۔ وہ کوہ قاف میں تو بن نہیں سکے گی۔''
اب ان میں سے ایک مر جاتا ہے اور پھر دوسرا بھی مرتا ہے اور کوہ قاف کی برفوں میں ان کے جسموں کی راکھ وہاں پہنچادی جاتی ہے۔ اب آنس یہ منظر دیکھ کر کہتے ہیں۔ ''وہ چلے گئے۔ مجھے کہاں دفناؤ گے؟ ادھر تو برف ہی نہیں ہوتی۔'' میں نے ٹی وی کا چینل بدل دیا تو اُن کے دماغ کا چینل بھی بدل گیا۔ اور کہنے لگے۔ ''ہم بینگلور سے کب آئے؟''

مجھے معلوم تھا اس بات کو دس بارہ سال ہو چکے ہیں۔ جب اُن کے دو تین لیکچر مسلم ہسٹری پر تھے۔ بینگلور میں جو لیکچر تھا اُس میں بنگال میں ڈوڈومیاں کی سماجی تحریک اور رام موہن رائے کی تحریک پر بات کرنی تھی۔ اُس لیکچر میں مجھے یاد ہے بڑا آڈیٹوریم بھرا ہوا تھا اور وہاں کے پڑھے لکھے لوگ آنس کی گفتگو اس لئے سننا چاہتے تھے کہ وہ پاکستان سے آئے تھے۔ پاکستان کا حوالہ انہیں کھینچ لایا تھا اور جب انہوں نے ان کی تاریخ کے تضادات بتائے تو بہت سوال اٹھے اور لوگوں نے کہا۔ یہ مکالمہ تو ضروری تھا۔ میں نے بات بدلنے کے لئے کہا۔ ''ہاں آپ کو یاد ہے پھر ہم سرنگا پٹم، کاویری ندی اور میسور بھی گئے تھے۔''

''ہاں تو یاد ہے۔ میسور میں میرا لیکچر ہوا تھا۔ کب ہوا تھا؟ کل کی بات ہے۔ ہم کب میسور سے آئے ہیں؟''

''ہم میسور یونیورسٹی سے پچھلے ہفتے آئے ہیں۔ وہاں آپ کا لیکچر مسلم Dynasty پر تھا جو نواب حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے زمانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اور آپ نے ان سوالوں کے جواب دیئے تھے جو ہندوستان کے متعصب ہندو مؤرخ اٹھا رہے تھے اور جن کا جواب بنگلور کے تھیٹر کے رائٹر، اداکار اور سماجی تحریک کے سرگرم کارکن گریش کرناڈ، جو فلم کے اداکار بھی تھے، نے دیا اور اُس کے خلاف ہندو لابی نے محاذ بنا لیا۔ لیکن گریش کرناڈ نے اپنی رائے نہ بدلی۔''

''ہاں گریش کرناڈ تو مجھ سے ملنے لاہور بھی آیا تھا۔ وہ اب کہاں ہے؟ فون ملاؤ۔ مجھے اُس سے بات کرنی ہے۔''

اب میں کیا بتاتی کہ وہ تین سال پہلے فوت ہو چکا ہے۔ تو میں نے اِدھر اُدھر چینل گھمائے تو ایک فلم

مل گئی۔جس کا نام تھا ''Field of Dreams''۔جب فلم چلی تو میرے ہوش اڑ گئے کہ آنس جس کیفیت میں ہیں یہ فلم تو انہیں کہیں سے کہیں اُڑا کے لے جائے گی۔مگر اب فلم لگ چکی تھی۔فلم ہالی وڈ کی تھی اور مرکزی کردار کیون کاسٹر کا تھا۔فلم میں ایک کھیت ہوتا ہے جس میں فصل اُگی ہوتی ہے اور اُس کے سامنے کیون کاسٹر کا گھر ہوتا ہے۔فلم کی کہانی یہ تھی کہ کیون کاسٹر کا باپ اُس کھیت کو بیس بال کا گراؤنڈ بنانا چاہتا تھا۔اس لئے کہ وہ بیس بال کی جس ٹیم کو پسند کرتا تھا اُس پر کسی وجہ سے پابندی لگ جاتی ہے اور وہ ٹیم غائب ہو جاتی ہے۔اور وہ چاہتا ہے کہ وہ اُس ٹیم کو یہاں بلائے اور کھیلنے کے لئے جگہ دے۔مگر وہ فوت ہو جاتا ہے۔اب بیٹے کو خواب آتا ہے کہ تم میرا خواب پورا کرو گے۔کیون کاسٹر کی چھوٹی سی فیملی ہے۔ایک بیٹی،ایک خوبصورت بیوی۔وہ باپ کے خواب پر غور کرتا ہے۔جوں جوں غور کرتا ہے اُسے کھیت کے اندر بیس بال کی ٹیم کے کچھ کھلاڑی نظر آتے ہیں۔جو اُس کے بیوی بچوں کو دکھائی نہیں دیتے۔آہستہ آہستہ وہ ٹیم کے ناموں کی تلاش کرتا ہے تو ایک کھلاڑی کا پتہ چلتا ہے جو مر چکا ہوتا ہے۔اس نام کا ایک لڑکا اُسے ملتا ہے جو بیس بال کھیلنے کا شوقین ہوتا ہے۔وہ اُسے لے کر آتا ہے اور پھر اُسے وہ ساری ٹیم اس کھیت کے اندر سے باہر آتی دکھائی دیتی ہے اور وہاں بیس بال کا گراؤنڈ بناتا ہے اور پھر وہ ٹیم حقیقت میں وہاں کھیلنے لگتی ہے جو ظاہر ہے اُس کا Illusion ہوتا ہے۔جب یہ فلم آنس نے دیکھی تو اُنہیں لگا کہ اُسے اس کھیت میں اُس کی مرضی کے کچھ لوگ دکھائی دے رہے ہیں۔وہ چلائے۔''وہ مجھے بلوچستان کے گمشدہ لوگ دکھائی دے رہے ہیں۔جنہیں غائب کر دیا گیا ہے لیکن تاریخ انہیں غائب نہیں ہونے دے گی۔میں تاریخ کا چوکیدار ہوں۔''

میں نے کہا۔''فلم میں تو اسے بیس بال کے کھلاڑی دکھائی دے رہے ہیں۔''

''ہاں اُسے دکھائی دے رہے ہیں مگر میرے فیلڈ آف ڈریمز میں تو کچھ اور دکھائی دے رہا ہے۔یہ بلوچ ہیں۔یہ پشتون ہیں۔یہ ہزارہ قبیلے کے لوگ ہیں۔یہ پنجاب کے جنجوعے ہیں۔چیمے ہیں۔نقوی ہیں۔زیدی ہیں۔ملک ہیں۔یہ سب جو غائب کر دیئے گئے۔وہ مجھے اس فیلڈ کے اندر سے باہر آتے دکھائی دے رہے ہیں۔''

وہ اب فلم میں داخل ہو چکے تھے۔انہیں فلم میں داخل ہونے میں دیر نہیں لگتی تھی۔وہ اُس کا حصہ بن جاتے تھے پھر لگتا تھا وہ فلم کے اندر اپنی مرضی سے جو دیکھنا چاہتے ہیں وہ دیکھ رہے ہیں۔کبھی کبھی فلم بھی ہماری زندگیوں کا حصہ بن جاتی ہے۔جوں جوں فلم آگے بڑھتی گئی وہ بولتے رہے۔

''وہ دیکھو یہ وہ لوگ اندر سے باہر آ رہے ہیں جو شاہی قلعے کی جیل میں گم ہو گئے تھے۔ یہ تو وہی ہیں۔ یہ حسن ناصر ہے۔ نذیر بلوچ ہے۔ یہ یہ ہے۔ وہ ہے۔ یہ تو وہی ہے وہ کہیں گئے نہیں تھے۔ وہ تو موجود تھے۔ یہ فلم گمشدہ ٹیم کو نہیں پاکستان کے گمشدہ لوگوں پر بنائی گئی ہے۔ وہ کیون کاسٹر نہیں میں ہوں۔ وہ میں ہوں۔'' بات تو وہ ٹھیک کر رہے تھے۔ جس ذہنی کیفیت میں انہوں نے یہ فلم دیکھی، وہ انہیں ماضی میں لے گئی۔ ان کی آواز سن کر گھر کے ملازم کمرے میں آ گئے۔ میں نے انہیں اشارے سے منع کیا وہ چلے گئے۔ ان کے لئے تو روز کا یہ معمول تھا۔ اچانک فلم دیکھتے ہوئے انہیں کچھ اور یاد آ گیا۔

''یہ تو وہ ہیں جنہیں انگریزوں نے دہلی، میرٹھ، لکھنؤ اور آس پاس کے علاقوں سے گرفتار کیا تھا۔ یہ مولوی صدرالدین ہے۔ یہ محمد باقر ہے مولانا آزاد کا والد—— یہ یہ سب گم ہو گئے تھے۔ وہ اس کھیت سے جھانک کر مجھے بلا رہے ہیں۔ ان کے ساتھ سینکڑوں مسلمان بھی ہیں۔ یہ بہادر شاہ ظفر ہے۔ یہ نواب واجد علی شاہ بھی ہے اور یہ وہ لوگ بھی ہیں جو تاریخ میں گم ہو گئے۔ اف اللہ! یہ تو لاکھوں میں ہیں۔ یہ کھیت تو چھوٹا ہے مگر سب یہاں ہیں۔ نازی جرمنی نے گیس چیمبرز میں جن کو جلایا وہ سب بھی گمشدہ لوگ ہیں۔ وہ بھی دکھائی دے رہے ہیں۔ پکاسو بھی ہے۔ ارے ہاں پکاسو جس کے گاؤں ''گورنیکا'' پر فضائی بم باری ہوئی تھی اور پورا گاؤں تباہ ہو گیا تھا۔ اور پھر اُس نے ایک پینٹنگ بنائی اور اس کا نام رکھا ''گورنیکا''۔ اس پینٹنگ کا پرنٹ بھی میرے ڈرائنگ روم میں لگا ہے۔ تم جانتی ہو—— جس میں آسمان کی طرف منہ کر کے ایک عورت، ایک گائے، ایک گھوڑا، ایک بچہ چیخ رہے ہیں۔ یہ چیخیں مجھے سنائی دے رہی ہیں۔ یہ سب اس کھیت میں مجھے دکھائی دے رہے ہیں اور جب پکاسو کے سٹوڈیو پر جرمن فوجیوں نے حملہ کیا تو وہ تصویر انہیں وہاں مل گئی تھی۔ اور انہوں نے پکاسو سے پوچھا تھا۔ ''مسٹر پکاسو! کیا تصویر تم نے بنائی ہے؟'' تو پکاسو نے جواب دیا تھا۔ ''نہیں یہ تصویر تم نے بنائی ہے''——

پھر وہ چپ ہو گئے اور فلم کے کریڈٹ چلنے لگے۔ فلم ختم ہو گئی تھی اور اُن کے دماغ کی فلم بھی ختم ہو چکی تھی——

کتاب ہو یا ٹیلی وژن یا کوئی تصویر۔ مجھے سوچ سمجھ کے اُن کے سامنے رکھنی پڑتی تھی۔ وہ اس میں شامل ہو کر جس بھی واقعے میں چاہتے تھے چلے جاتے تھے۔ تاریخ تو وہ بسر کر چکے تھے۔ اب اُس تاریخ کی

یادیں اُن کا پیچھا کر رہی تھیں ـــــ ایک صبح میں نے اُنہیں تیار کر کے ناشتے کی میز پر بٹھایا۔ ان کی پسند اور ضرورت کے مطابق آج کا ناشتہ کاٹیج چیز اور ڈبل روٹی کا سلائس تھا۔ ساتھ میں دودھ جو انہیں پسند تھا، سامنے رکھا تھا۔ کاٹیج چیز کھاتے ہوئے کہنے لگے۔ ''اولگا چلی گئی۔ ہاں اُسے تو ورلڈ ٹور پہ جانا تھا۔ اپنا چیز مجھے دے گئی تھی۔''

اب میں حیران کہ سوزین اور کیتھرین کے بعد یہ اولگا بھی ان کی زندگی میں رہی ہے۔ میں نے اب معلوم کرنا چاہا کہ اولگا کون ہے؟

''اولگا کب آئی تھی؟''

''اولگا آئی تھی۔ ہاں ہم کافی ہاؤس میں بیٹھے تھے۔ میرے ساتھ صفدر میر تھا شاید اور راولپنڈی سے پروفیسر مسعود تھا جو فیض صاحب کا بھی دوست تھا۔ ہم نے خوب باتیں کیں۔ رات کی گاڑی سے پروفیسر مسعود کو لاہور ریلوے سٹیشن پہ چھوڑنا تھا۔ ہم انقلاب کے سارے نسخے آزما کر پاکستان کا آزاد جمہوری مستقبل سوچ کر اُٹھے کہ شاید اگلی صبح جب دستک دے گی تو ایک آزاد اور خود مختار صبح ہمارا استقبال کرے گی۔ ہم پروفیسر مسعود کو چھوڑنے ریلوے سٹیشن کے لئے نکلے تو راستے میں سائیکل پر پروفیسر اصغر سلیم مل گیا جو سائیکل پر سوار نہیں تھا۔ بس ہاتھ میں سائیکل لئے پیدل چل رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو رُک گیا۔ ایسے میں صفدر میر کا پتہ نہ چلا کہاں گیا۔ کیونکہ پروفیسر اصغر سلیم صفدر میر کا بھائی تھا۔ اب میں، پروفیسر اصغر سلیم اور پروفیسر مسعود ریلوے سٹیشن کے لئے پیدل چل پڑے۔ ابھی ریگل چوک پہنچے تو سرخ ٹائی، نیلی قمیص، کالی پتلون اور سفید کوٹ میں سنہرے بالوں اور سرخ و سفید چہرے کے ساتھ ایک آدمی ملا۔ جس کا نام ظہیر کاشمیری تھا۔ ایک بڑا شاعر ـــــ ایک اور طرح کی صحافتی تاریخ ـــــ اُس نے ہم سب کو دیکھا اور پہچان لیا اور کہا۔ ''یہ قافلہ بہت بے جوڑ ہے۔ یہ کہاں جا سکتا ہے۔'' میں نے کہا'' ہم سرخ انقلاب کو راضی کرنے جا رہے ہیں کیونکہ وہ مان نہیں رہا۔''

''تو پھر ایسے کرو کہ سرخ انقلاب کو راضی کرنے کے لئے شارٹ کٹ کے لئے بیڈن روڈ کی طرف سے جاؤ۔ جلدی آ جائے گا۔''

''اب مجھے تو پتہ تھا کہ ظہیر کاشمیری کا گھر بیڈن روڈ پر ہے۔ میں نے کہا۔ ''سرخ انقلاب کا راستہ بھی بیڈن روڈ نے روک رکھا ہے کیونکہ وہاں ظہیر کاشمیری کا گھر ہے۔'' میری بات سن کر بہت ہنسا اور کہا۔ ''یہ جو پروفیسر اصغر سلیم تمہارے ساتھ ہے یہ تمہیں لاہور ریلوے سٹیشن نہیں واہگہ پار چھوڑ آئے گا کہ یہ کئی بار امرتسر

سائیکل پر آتا جاتا رہا ہے۔"

میں حیران تھی کہ آنس کہاں سے کہاں جا چکے ہیں۔ میں نے پھر ذرا کہانی کو آگے بڑھایا۔ "تو پھر اولگا کہاں گئی؟"

"ہاں وہاں جا رہا ہوں۔ تو اب ہم لکشمی چوک سے گذر کر لاہور ریلوے سٹیشن پہنچے جہاں "بھوانی جنکشن" کی شوٹنگ ہوئی تھی اور فلیٹی ہوٹل میں "ایوا گارڈنر" کے ساتھ ڈائریکٹر اور ان کی ٹیم ٹھہری تھی۔

ہم لاہور سٹیشن پر وفیسر مسعود کو گاڑی میں بٹھا کر باہر نکلے تو پروفیسر اصغر سلیم غائب تھا۔ وہ ایسے ہی حاضر اور غائب کا مجموعہ تھا۔ اب ہے، اب نہیں ہے۔ تو میں اکیلا جب باہر آیا تو دیکھا کہ ایک غیر ملکی لڑکی جس کے کندھے پر سامان تھا اور وہ تانگے والے سے الجھ رہی تھی۔ میں اُس کے پاس پہنچا تو تانگے والے نے کہا۔

"باؤ جی یہ کہاں کا پتہ بتا رہی ہے؟"

میں نے وہ پتہ پڑھا تو لکھا تھا۔ وائی ایم سی اے، مال روڈ۔ میں سمجھ گیا اور میں اُس لڑکی کے پاس گیا اور اُس سے پوچھا۔ "تم کون ہو اور کہاں سے آئی ہو؟" اُس نے کہا۔ "میں پولینڈ سے دنیا گھومنے نکلی ہوں۔ میرا نام ہے اولگا گلِش چنسکا۔"

"اتنا بڑا نام تو ہمارے ملک میں صرف طاقتور لوگوں کا ہوتا ہے۔"

"اب یہی نام ہے میرا۔" اُس نے انگریزی میں کہا۔ اگرچہ اُس کی انگریزی بہت واجبی سی تھی۔ تو اُس نے بتایا وہ انڈیا سے پاکستان میں داخل ہوئی ہے۔ میں نے اُسے کہا۔ "اگر تم شہر کی سچائی دیکھنا چاہتی ہو اور شہر کی شخصیت جاننا چاہتی ہو تو میں تمہیں وائی ایم سی اے تک چھوڑ آتا ہوں۔" لگتا تھا اُسے مجھ پر اعتبار ہے۔ اس لئے کہ وہ مسکرائی تھی۔"

"آپ کو وہ اچھی لگی تھی؟" میں نے ایسے ہی سوال ڈال دیا ——

"نہیں، وہ پہلی نظر میں اچھی نہیں لگی تھی اور دوسری یا تیسری نظر میں بھی اچھی نہیں لگی تھی۔ میں اُسے لے کر لکشمی چوک آیا تو اُس نے کہا۔ "مجھے بہت بھوک لگی ہے۔" آس پاس کھانوں کی دکانیں اُس نے دیکھ لی تھیں۔ میں نے اُسے لاہوری شاہی مرغ چنے کی دکان دکھائی۔ میں وہاں سے کئی دفعہ دوستوں کے ساتھ کھانا کھا چکا تھا۔ اُسے کھانا تھا۔ کچھ بھی مل جاتا۔ اُس نے کُھل کر کھایا اور بتایا کہ انڈیا کے کھانوں سے یہ کھانا بہت اچھا تھا۔ دہلی اور پنجاب کے کھانے اُسے پسند آئے تھے۔ خاص طور پر گول گپے اور سموسے ——"

''آپ نے اسے وائی ایم سی اے چھوڑا پھر؟''

''اُس نے مجھے راستے میں بتایا کہ انڈیا میں وہ دو دفعہ ریپ ہوئی تھی اور اُسے ریپ کرنے والوں کے چہرے بھی یاد نہیں تھے۔ میں نے اُسے کہا۔''مجھ سے نہ ڈرو۔ میں ریپ نہیں کروں گا۔'' کہنے لگی۔''جو لوگ مجھے پسند ہوں میں ان کے ریپ سے نہیں ڈرتی۔''

''پھر آپ نے کیا کہا؟''

''میں نے بس اتنا پوچھا۔''تمہیں کچھ یاد ہے تمہیں کہاں پر ریپ کیا گیا؟'' تو اُس نے عجیب بات بتائی کہ میں راجستھان میں ایک قلعہ اور محل دیکھنے گئی۔ میرے لئے وہ بے حد خوبصورت اور پراسرار تھا۔ اس کے ساتھ جھیل بھی تھی اور اس میں ہاتھی، ہرن اور بہت سے جانور تھے۔ پرائیویٹ چڑیا گھر تھا۔ محل میں بڑے بڑے پورٹریٹ تھے راجوں کے۔ شیر اور چیتے حنوط کر کے رکھے گئے تھے۔ وہاں اور لوگ بھی جو ٹورسٹ تھے موجود تھے۔ مجھے ایک راجستھانی لباس میں وہاں کے گائیڈ نے کہا۔ آپ کو ہمارے راجہ نے بلایا ہے۔ میں نے پوچھا۔ راجہ کیا ہوتا ہے؟ اس نے بتایا اس ساری سٹیٹ کا مالک ہے۔ یہ اُس نے ٹورسٹوں کے لئے کھول رکھا ہے اور خود اندر محل میں رہتا ہے۔ میں اُس کے ساتھ چلی گئی۔ اندر بہت بڑی مونچھوں اور راجوں کے لباس میں ایک آدمی نے مجھے مسکرا کر بٹھایا۔ اس نے محل دکھایا۔ اس کا بار روم بہت بڑا تھا۔ میں نے جب وہاں شرابیں دیکھیں تو وہ میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھی تھیں۔ پھر اُس نے مجھ سے باتیں شروع کیں۔ وہ پولینڈ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے بتایا کہ پولینڈ کے ایک شاعر اوکتاویو پاز کو شاعری کا نوبل انعام ملا ہوا ہے اور یہ کہ پولینڈ کس طرح روس کے زیرِ اثر آیا۔۔۔۔ مجھے وہ سب خواب کی طرح یاد ہے کہ اُس نے مجھے بہت اچھی وہسکی بنا کر دی، خود بھی لی اور اس کے باوردی بیرے طرح طرح کی چیزیں وقفے وقفے سے لے کر آتے رہے۔ میں تو کوئی خواب دیکھ رہی تھی۔ کوئی خواب میں بھی ریپ ہوتا ہے۔ میں ہوگئی۔ مگر وہ جو کچھ میں نے دیکھا وہ تو ایک جادونگری تھی۔ پھر مجھے اتنا یاد ہے وہ مجھے بیڈروم میں لے گیا۔ اس نے میرا اسکرٹ اتارا اور مجھے ہونٹوں پر چوما۔ مجھے تب بھی پتہ نہ چلا میں ریپ ہونے جا رہی ہوں۔''تو تمہیں کب پتہ چلا کہ تم ریپ ہو رہی ہو؟'' میں نے پوچھ لیا۔''یہ بھی یاد نہیں بس میں نے محسوس کیا کہ اُس کا وزن زیادہ تھا اور وہ میرے جسم کو بری طرح دباؤ میں لے رہا تھا۔ پھر مجھے نیند آگئی اور پھر میں کسی چھوٹے سے ہوٹل کے ایک کمرے میں صبح اٹھی تو وہ خواب گم ہو چکا تھا۔'' میں نے کہا۔''ہوسکتا ہے یہ تمہارا خیال ہو اور ایسا کچھ بھی نہ ہوا ہو۔'' اُس نے کہا۔

''نہیں مجھے یاد ہے ایسا سب ہوا تھا اور پھر میں نے ہوٹل والوں سے پوچھا کون مجھے یہاں لایا۔ انہوں نے کہا آپ خود یہاں آئیں۔ آپ نے کمرہ لیا ـــــ اور ہم نے آپ کو ٹھہرا دیا۔'' اب مجھے لگا کہ یہ سچ بول رہی ہے۔ اس کے ساتھ راجہ کا کوئی آدمی آیا ہوگا جس نے اسے یہاں کمرہ لے کر دیا اور ٹھہرا کے چلا گیا۔ میں نے پوچھا۔ ''پھر تم نے کیا کیا؟'' تو اُس نے بتایا کہ میں تو نہیں جانتی تھی کہ وہ کون سی سٹیٹ تھی۔ کون سا محل تھا۔ مجھے تو ایک ٹیکسی والا وہاں لے گیا تھا۔ اس نے تو کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس لئے میں پورا راجستھان تو نہیں دیکھ سکتی تھی۔''

''اس کا مطلب ہے تم نے اس ریپ کو قبول کر لیا؟''

''ہاں قبول کر لیا۔'' یہ اُس نے کہا تھا۔

''پھر مجھے کیوں بتا رہی ہو؟ کیا تم اب بھی اُس لمحے کے اندر سانس لے رہی ہو؟''

''نہیں۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ میرا ریپ ہوا ہے۔ اگر وہ مجھ سے محبت کرتا اور مجھ سے پوچھ لیتا تو میں اُسے اجازت دے دیتی۔''

''اب مجھے سمجھ میں آیا کہ اس لڑکی کا مسئلہ کیا ہے۔ وہی جو ہر یورپ کی رہنے والی لڑکی کا ہوتا ہے کہ رضامندی لے لی جائے تو کیا بُرا ہے۔ مگر راجے مہاراجے تو اپنا کھیل کھیلتے ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ راجہ روزانہ ایک نیا شکار کرتا ہوگا۔ ہرن، چیتا اور تیندوا تو اب انڈیا میں شکار نہیں ہوسکتا تو یورپی ٹورسٹ کو شکار کرنے کا بھی وہی مزہ ہوتا ہوگا۔ میں نے اولگا سے پوچھا۔ ''اگر تمہیں حمل ٹھہر جاتا ہے تو کیا کرو گی؟''

اُس نے کہا۔ ''ابھی مجھے پتہ نہیں اور اگر ٹھہر گیا تو میں اُس رائل پرنس کا بچہ پیدا کروں گی۔'' میں نے پوچھا۔ ''کیا تم اُس کی پراپرٹی کا کوئی دعویٰ کرو گی؟''

اُس نے کہا۔ ''میں نہیں کر سکتی کہ کوئی معاہدہ ہمارے درمیان نہیں تھا۔''

میں نے کہا۔ ''کوئی ڈی این اے کا ٹیسٹ ہوتا ہے۔''

اُس نے کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم۔ میں وہ بچہ پیدا کروں گی۔ اگر بیٹی ہوئی تو اُسے کال گرل بناؤں گی اور لڑکا ہوا تو اُسے میں بھڑوا بناؤں گی۔ چاہے وہ میری بھڑوا گیری کرے۔''

''یہ سب اولگا نے آپ کو اپنی زبان میں کہا تھا؟''

''نہیں ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا تھا۔ میں نے تو اُس کو کہا کہ وہ جا کر اپنی آٹو بائیوگرافی لکھے۔ اُس نے وعدہ کیا تھا لیکن وہ کوئی رائٹر نہیں تھی۔''

''پھر آپ سے اس کا کیا تعلق بنا؟'' ــــــ

''کچھ بھی نہیں۔ اولگا سے ملنے میں وائی ایم سی اے گیا تو اُس نے مجھے کہا کہ میں اپنے ساتھ پولینڈ کا Cheese لے کر آئی ہوں۔ میں نے Cheese کا نام تو سنا تھا اُس وقت میں نے اُسے چکھا نہیں تھا۔ اس لئے Cheese کے نام پر مجھے اولگا یاد آ گئی۔''

''آپ نے اس کا ذکر کبھی کیا نہیں تھا۔'' میں نے پوچھ ہی لیا۔

''ہر بات یاد رکھنے کے لئے تو نہیں ہوتی۔ کچھ دن یہاں رہی پھر چلی گئی تھی۔ اس کے خط مجھے پہلے تو ملتے رہے پھر وہ پولینڈ سے ایسٹرن جرمنی چلی گئی۔ برلن کی دیوار کے اُس پار کہیں رہتی تھی۔ اُس نے مجھے لکھا تھا کہ اُس نے اُس راجہ کے بچے کو جنم دیا ہے اور لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ میں یہ سب بھول گیا۔ اُس کا دوبارہ خط نہیں آیا۔''

''تو یہ اتنا خاص واقعہ تو نہیں تھا جو آج آپ کو اچانک یاد آ گیا۔'' اصل میں، میں آنس کے ہر لمحے کو نوٹ کر رہی تھی۔ اس لئے میں اُن کی یادوں کے حوالے سے کوئی ایسی بات ضرور کر دیتی تھی کہ اگر اُس سے جُڑی کوئی اور بات ہے تو وہ بھی ان کے دھیان میں آ جائے اور ایسا ہی ہوا کہ جب میں نے اسے ایک عام سا واقعہ بتایا تو اُس سے جُڑی ایک اور بات سامنے آ گئی۔

''کوئی بھی واقعہ خاص نہیں ہوتا۔ کسی وجہ سے خاص بن جاتا ہے یا آپ کی یاد میں پڑے پڑے جب اینٹیک بن جاتا ہے تو وہ خاص ہو جاتا ہے۔ جیسے یہ واقعہ اولگا کا ہے۔ اب دیکھو کہ کیا اتفاق تھا کہ جب دیوارِ برلن 1991ء میں توڑی جا رہی تھی تو میں ایک کانفرنس میں وہاں موجود تھا۔ اور کانفرنس میں اسی بات کو زیرِ بحث لایا گیا کہ یہ دنیا میں انوکھا واقعہ تھا۔ ورنہ پنجاب تقسیم ہوا دوبارہ نہیں جُڑ سکا۔ کشمیر تقسیم ہوا ابھی تک تو نہیں جُڑ سکا۔ بنگال تقسیم ہوا کبھی نہیں جُڑ سکے گا۔ اس لئے برلن کی دیوار دنیا کے لئے ایک پیغام تھا۔ اور میں اس پیغام کو دنیا کے لئے پیش کرنے والے مورخوں میں شامل تھا ــــــ مرکزی تقریب برلن کی دیوار کے ساتھ شاہراہ کے اِس طرف تھی۔ یہ وہاں کا سب سے بڑا میوزیم تھا۔ جہاں ہم سب جمع تھے اور تاریخ کے اس اہم لمحے کو آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ میوزیم کے مرکزی دروازے سے باہر نکلے تو برلن کی دیوار کو ایسے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھا جیسے انگریز نے ہندوستان کے ٹکڑے کئے تھے۔ کوئی ٹکڑا کسی کے ہاتھ آیا تو کوئی ٹکڑا کسی کے ہاتھ۔ اور سب ان ٹکڑوں کو تبرک سمجھ کر لے جا رہے تھے۔ آج وہ سب ٹکڑے بڑے لوگوں کے ڈرائنگ

روموں میں سجے ہوئے ہیں۔ میں نے ایک بچے کو دیکھا۔ جسے تاریخ کا کچھ پتہ نہیں ہوگا۔ وہ اپنے وجود سے بڑا سیمنٹ کا ٹکڑا مشکل سے سینے سے لگائے لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے رُک کر اُسے دیکھا تو وہ سمجھا کہ وہ کوئی چوری کر رہا ہے۔ وہ اس ٹکڑے کو پھینک کر بھاگنے لگا۔ میں نے اسے روکا، پیار کیا اور وہ ٹکڑا اٹھا کر اُسے دیا کہ اسے لے جاؤ ـــــ کہ وہ تاریخ ہے جو نئی نسل کو منتقل ہونی چاہئے۔ میں نے وہ تاریخ جو میری نہیں تھی، جرمنی کے ایک بچے کو منتقل کر دی۔ اس پر مجھے لیبیا کی تاریخ پر وہ فلم یاد آ گئی جو لیبیا کے آزادی کے رہنما عمر مختار پر بنی تھی۔ جس میں کرنل معمر قذافی کے باپ عمر مختار کا کردار انتھونی کوئن نے ادا کیا تھا۔ اس آخری منظر میں عمر مختار پھانسی لگنے سے پہلے وضو کرتا ہے اور نماز پڑھتا ہے۔ ہزاروں لوگوں کے سامنے وہ پھانسی گھاٹ پر آتا ہے اپنی قوم کو دیکھتا ہے اور پھر اپنے ہاتھوں سے پھانسی کا پھندہ گلے میں ڈالتا ہے۔ اس نے نظر کی عینک لگا رکھی تھی۔ پھانسی پر جھولنے سے پہلے اس کی عینک دور جا کر گرتی ہے جسے وہ بچہ اٹھا لیتا ہے۔ گویا انقلاب کی ڈور نئی نسل کے ہاتھوں میں آ جاتی ہے۔ ایسے ہی مجھے خیال آیا کہ میں نے اس جرمن بچے کو دوسری جنگِ عظیم کی تاریخ منتقل کر دی ہے۔''

''آپ نے یہ واقعہ اس طرح نہیں سنایا تھا۔'' میں نے پھر کریدا ـــــ کہ شاید کچھ اور نکل آئے۔

''ہاں تو میں یہ واقعہ کیوں سناتا۔ میری زندگی کے ہر لمحے کو تو بیان نہیں کیا جا سکتا۔''

''ہاں یہ تو ہے۔ لیکن یہ واقعہ دلچسپ ہے پھر کیا ہوا؟''

''ہاں پتہ نہیں کیوں دلچسپ ہے۔ بہر حال ہم سب تاریخ دان برلن دیوار کے گرنے کے بعد اندر داخل ہوئے تو حیران ہو گئے کہ وہ تو کچھ اور ہی دنیا تھی۔''

''کیسی دنیا تھی؟ برلن تقسیم ہوا تھا مگر دونوں طرف تو برلن ہی تھا۔ جیسے کشمیر تقسیم ہوا ہے تو دونوں طرف کے نظارے اور لینڈ سکیپ تو ایک ہی طرح کا ہے۔''

''نہیں یہ بالکل ایک اور طرح کی دنیا تھی۔ گویا آدھا برلن جدید دنیا کا عجوبہ اور آدھا برلن زنگ آلود لوہا ـــــ وہ ایسے کہ تمام گھر وہی جو پہلے سے تعمیر شدہ تھے۔ ان گھروں کے پلستر اکھڑ گئے تھے۔ پچاس سال گویا منجمد ہو چکے تھے۔ ایسے ہی ان گھروں میں رہنے والے سانس لئے بغیر منجمد ہو چکے تھے۔ دیوار کیا گری کہ سب کو ہوا محسوس ہوئی۔ میں اُس وفد میں شامل تھا جس نے یہ احساس سب سے پہلے لیا کہ پچاس سالوں تک برلن کے لوگوں کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ حالانکہ میں مارکسسٹ تھا۔ اور اس فلاسفی کو آج بھی دنیا کے دکھوں کی نجات کا

ذریعہ سمجھتا ہوں۔ مگر کیا ہوا؟ کہ میں دیکھ رہا تھا پچاس سالوں میں اُن گھروں کو دیمک نے چاٹ لیا تھا۔ سب گھروں کے سیمنٹ کا پلستر پچاس سالوں کو سہہ نہیں سکا تھا۔ ہم گھروں کے اندر کیا گئے کہ اندر کا حلیہ نہ دیکھ سکے۔ جس گھر میں گئے وہاں بوڑھے، مرد اور عورتیں آسمان کو یا چھت کو تک رہی تھیں۔ بس مرنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ وہاں دور دور تک ہسپتال نہیں تھا۔ ہم تاریخ دان ہر گھر اور اس کے باہر کو دیکھ رہے تھے۔ ہر گھر کے باہر سبزہ تھا۔ گھاس اُگ آئی تھی۔ درخت پھیل چکے تھے۔ جس سے پتہ چلا کہ بارشوں نے یہاں ڈیرہ جمایا ہوا ہے اور کوئی نہیں جو مکانوں کے بیچ اُگتی گھاس اور پودوں کو صاف کر سکے۔ وہاں کوئی بھی نہیں جانتا تھا دنیا کیا سے کیا ہو چکی ہے۔ ایک آہنی پردہ ان پر پڑا ہوا تھا۔ وہ صرف ڈبل روٹی اور سبزیوں کے سوپ کے ساتھ زندگی گذار رہے تھے۔ گویا خوابِ غفلت سے اچانک جاگے تو دیکھا اُن کے وجود کا دوسرا حصہ بھی برلن ہی تھا۔ مگر وہ تو کچھ اور ہو گیا تھا۔ دو جُڑواں بہنیں مختلف جگہ بیاہی گئی تھیں۔ ایک امیر گھرانے میں دوسری غریب گھرانے میں اور اب دونوں ایک دوسرے سے گلے مل رہی تھیں۔ دونوں کو پتہ نہیں تھا کہ کیسے گلے لگنا ہے۔ میں نے برلن ٹوٹتے نہیں دیکھا تھا۔ میرے سامنے برلن اب ٹوٹ رہا تھا اور میں دیکھ رہا تھا۔ بالکل ایسے جیسے فیض احمد فیض کے سامنے ڈھاکہ اُس دن بچھڑا تھا جب انہوں نے وہاں سے واپسی پر نظم لکھی تھی:

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی مداراتوں کے بعد

مجھے یہ نظم یاد آئی اور میں نے سمجھا کہ میں ڈھاکہ میں کھڑا ہوں۔ مگر یہاں تو دونوں حصے آپس میں جُڑ رہے تھے۔ مگر ہم تو کبھی ایک نہیں ہو سکتے تھے۔ اپنی محرومی کا احساس اُس لمحے بہت شدید ہو گیا۔ اب میں نے برلن کے اس حصے پر نظر ڈالی تو مدقوق روشنی میں ہر شے اداسی کی چادر اوڑھے کھڑی تھی۔ شہر پر بمباری کے تمام نشان موجود تھے۔ جیسے نشانی کے طور پر چھلنی شہر کی دیواروں کو محفوظ رکھا گیا ہو۔ جو عمارت جنگ سے متاثر ہوئی تھی وہ اُسی حالت میں موجود تھی۔ رہنے والوں کے لئے برلن کا یہ حصہ جیل خانے میں تبدیل ہو گیا ہوگا۔ مجھے تو ایسے ہی محسوس ہوا۔ جیسے دشمن کی فوجیں قابض ہونے کے بعد وہاں کے رہنے والوں سے سلوک کرتی ہیں۔ ایسا ہی سلوک ان جرمنوں کے ساتھ ہوا ہوگا۔

شہر میں گھومتے ہوئے محسوس ہوا ہر شے بات کرنے والی ہے۔ کچھ بتانا چاہتی ہے۔ درختوں اور راستوں کے پاس چشم دید کہانیاں تھیں جو میں سننا چاہتا تھا۔ جو لوگ وہاں ملے ان کے لباس میں ان کے

چہروں پر گذرے پچاس سالوں کی گرد جمی ہوئی تھی۔ اذیت کے تقریباً پچاس سال کیسے گذرے ہوں گے۔ ایک نسل سے دوسری نسل میں یہ زخم کیسے منتقل ہوئے ہوں گے۔ رشتوں کے تار کیسے اُلجھے ہوں گے۔ میں تاریخ کے اس موڑ پر کیوں تھا؟ محض اتفاق تھا کہ جگہ جگہ پانی کے چھوٹے چھوٹے تالاب گھروں کے آس پاس موجود تھے۔ جن پر پچاس سال کی کائی جمی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا پانی کائی میں تبدیل ہو چکا ہے۔ پانی اندر موجود ہی نہیں ہے۔ مجھے یوں لگا میں ایک بڑی پرانی عمارت میں کھڑا ہوں۔ اونچی دیواریں، اندر گئے تو محسوس ہوا لوہے کے جنگلوں میں چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں۔ کسی نے بتایا یہ جیل خانہ ہے جو اب استعمال نہیں ہو رہا تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہاں مخالفوں کو ایذا دی جاتی تھی۔ ٹارچر سیل دیکھ کر میرے جسم میں چیخیں سنائی دینے لگیں۔ لوہے کے اوزار موجود تھے جو انسانوں پر استعمال ہوتے تھے۔ ایک جگہ ایک لوہے کا سانچہ رکھا تھا جس میں مجرم کا سر رکھا جاتا تھا اور پھر اسے تیز دھار تلوار سے اڑا دیا جاتا تھا۔ وہ سب کچھ موجود تھا جو یہ بتا رہا تھا کہ تاریخ کتنی بے رحم ہے یا انسان بے رحم ہے۔ ایک جگہ ایک بوڑھا کتا جسم زمین پر ڈالے اونگھ رہا تھا۔ آنکھیں کھول کر پوچھنے لگا۔ ''اب آئے ہو۔ جب ہم آخری سانسوں پر ہیں۔''

آگے گئے تو ایک اُجڑا ہوا محل دکھائی دیا۔ ہم اندر گئے۔ وہاں دیواروں پر قیمتی پینٹنگز موجود تھیں۔ جن میں مذہبی کرداروں کو مختلف طریقوں سے دکھایا گیا تھا۔ فنِ مصوری کا کمال دیکھنے میں آیا۔ یہ کیوں محفوظ رہ گئیں۔ کسی نے بتایا کہ یہ جگہ مذہبی بنیادوں پر محفوظ کر دی گئی تھی۔ اور یہاں رائل فیملی رہتی رہی ہے۔

کچھ ایسے مقام بھی آئے جو نسبتاً جدید اور زندگی کی ترقی سے تعلق رکھتے تھے۔ گویا شہر میں امیروں اور متوسط طبقے کے فرق کو قائم رکھا گیا تھا۔ میرے پاس آخری خط اولگا کا جو آیا تھا، اس میں اُس نے بتا دیا تھا کہ اس نے اُس راجہ کی بیٹی کو جنم دیا ہے۔''

''ہاں یہ آپ بتا چکے ہیں۔'' میں نے آنس کو روکا کہ وہ ایسی کیفیت میں نہ آ جائیں کہ باتوں اور یادوں کو دہرانا شروع کر دیں۔ میں اولگا کی کہانی کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ آخر وہ کہانی آ گئی ——

''ہاں، مگر اولگا تو میرے دماغ میں تھی۔ مجھے اتنا اس نے لکھا تھا کہ وہ برلن کے اس حصے میں آ چکی ہے۔ اس سے زیادہ میں نہیں جانتا تھا کہ اچانک کیا ہوا'' اب کہانی رک گئی تھی۔ میں نے آنس کو سوچنے کا وقفہ دیا۔ وہ خاموش ہو گئے اور پھر کہانی اُن کے اندر دوبارہ چلنے لگی۔

''ہمیں ایک اُولڈ ہوم میں لے جایا گیا۔ ایک خوفناک قسم کی بڑی عمارت جیسے پرانے ہسپتال

ہوتے تھے۔ سو بستر ایک جگہ اور اسی طرح سو بستر دوسرے فلور پر۔ گویا یہ ہسپتال ایک پبلک کمیونٹی ہسپتال تھا۔۔۔۔ ہم سب مریضوں کے بستروں سے گذر رہے تھے کہ میں نے ایک نرس کو روکا۔ جو بے حد اداس اور بیزار تھی۔

''یہاں ایک اولگا نام کی عورت ہوگی؟''

''اولگا؟'' اُس نے اپنی یادداشت اور اپنا چارٹ دیکھ کر کہا۔ ''یہاں پندرہ سے زیادہ نام کی عورتیں اولگا ہیں'' اور وہ آگے بڑھ گئی۔

اب مجھے امید بندھ گئی کہ اولگا ان پندرہ عورتوں میں ضرور ہوگی اور میں اُسے پہچان سکوں گا۔ میں نے اپنی یادداشت پر زور دیا تو پتہ چلا میری اولگا کا اصل نام جو اس نے بتایا تھا ''اولگا گلِش چنسکا'' تھا۔ میں نے ایک نرس کو روک کر یہ نام بتایا۔ وہ رکی اور پھر چارٹ دیکھ کر صرف اتنا کہا۔ ''بیڈ نمبر 31 ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مگر اُس کا نام کیا ہے؟''

''ہمارے ہاں نام نہیں ہوتے بیڈ نمبر ہوتا ہے۔''

''اب میں سمجھ گیا اور میں بیڈ نمبر 31 کی تلاش میں نکلا کہ اچانک کسی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ مڑ کے دیکھا تو ایک بیڈ پر عورت سوئی ہوئی تھی اور میں نے جب اُسے دیکھا تو وہ چیخی۔۔۔۔ میں اولگا ہوں۔ آپ لاہور سے ہیں۔ اب جو میں نے مڑ کے دیکھا تو میرا ہاتھ اولگا کے ہاتھ میں تھا اور وہ بیڈ نمبر 31 پر تھی۔ میں نے پہچان لیا تھا۔ میں سٹول پر بیٹھ گیا اور اُس کا ہاتھ تھامے رہا۔ میں نے کہا۔ ''اولگا تم نے جو کہا تھا وہ ایسے تو نہیں تھا۔ تم پولینڈ سے جرمنی کیسے آئیں؟''

''پولینڈ میں خانہ جنگی ہو چکی تھی۔ کسی کو کسی کا پتہ نہیں تھا۔ میری گود میں ایک ناجائز بچہ تھا۔ میں ایک قافلے کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔''

پھر اُس نے رونا شروع کر دیا۔ میں نے اُس کو تسلی دی اور پھر میں نے اُس سے کچھ نہیں سُنا۔ وہ میرا ہاتھ تھامے آنکھیں بند کئے روتی رہی۔ میں نے سوچا چند دنوں کا رشتہ اور یہ صدیوں کی اداسی اس مختصر سی ملاقات میں دور کرنا چاہتی ہے۔ کبھی کبھی یہ انتہائی کمزور اور معمولی رشتہ بھی انسان کی بہت ساری ضرورتوں کو پورا کر دیتا ہے۔''

''اولگا کی بیٹی کہاں تھی؟''۔۔۔۔ میں کہانی کو مکمل کرنا چاہتی تھی۔

''تم اولگا کی بیٹی کو کیسے جانتی ہو؟''____

''ابھی تو آپ نے بتایا تھا کہ اولگا کو کسی راجستھانی ریاست کے راجہ نے ریپ کیا تھا اور وہ اُسے جنم دینے والی تھی۔''

''ہاں ہاں سب غائب ہو جاتا ہے۔ میں کہاں ہوں۔ لاہور میں یا راجستھان میں؟''

''نہیں آپ برلن کی دیوار گرنے کے بعد دوسری طرف کے برلن میں تھے ابھی اور آپ اولگا کو اولڈ ہوم میں دیکھنے گئے تھے۔''

''ہاں، اب میں دیکھ رہا ہوں کہ میں اُس برلن میں ہوں جہاں موت کے سائے اُس اولڈ ہوم پر چھائے ہوئے تھے۔ میں ابھی اولگا سے اپنا ہاتھ چھڑا نہیں سکا تھا کہ ایک چیخ نے پورے اولڈ ہوم کو ہلا کے رکھ دیا۔ بیڈ نمبر 21 اس دنیا میں نہیں رہی تھی۔ اُس کے آس پاس بس ایک لڑکی تھی جو چیخ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ کچھ نرسیں اس بیڈ کے پاس آ گئی تھیں اور جلدی سے انہوں نے سٹریچر پر اُس مردہ خاتون کو لپیٹا اور لے کر چلی گئیں۔ انسانی زندگی کا آخر بس یہ ہے کہ کپڑے میں جسم کے اُس مٹھی بھر وجود کو ایک پوٹلی میں ڈال کر کسی بھی قبر میں دفنایا یا کسی بھی شمشان میں جلایا جا سکتا ہے۔ وہاں کوئی نہیں ہوتا۔ پریم چند کے افسانے ''کفن'' کا محض فریب ہوتا ہے____''

''اولگا کی بیٹی آپ سے ملی؟'' میں پھر آنس کو کہانی کے انجام کی طرف لا رہی تھی۔ لیکن وہ کہانی کو اور آگے بڑھا رہے تھے۔

''ہاں یہ ہوا کہ۔'' اب مجھے امید بندھی کہ کہانی خود کو مکمل کر رہی ہے تو میں نے کہا۔ ''ہاں کیا ہوا؟''

''وہ ایسا تھا کہ اولگا نے آنکھیں کھولیں اور میرے ہاتھ سے اپنے ہاتھ کو الگ کیا اور کہا۔ ''آپ کو معلوم ہے ہم کس زمانے میں ہیں؟'' میں نے کہا۔ ''ہم زمانے میں نہیں ہیں۔ ہم ایک تاریخ میں مل رہے ہیں۔ اب وہ زمانہ کہاں ہے کہاں نہیں ہے۔ کیا معلوم؟''

''تو پھر اولگا نے کیا کہا؟'' میں تو جاننا چاہتی تھی کہ اولگا کی بیٹی کا کیا ہوا؟

''ہاں اولگا نے کہا کہ وہ آتی ہو گی کہ شام ہو رہی ہے۔''

''میں نے اولگا سے کہا تم نے اُسے کال گرل بنانے کا کہا تھا کہ آپ اُس راجستھانی راجہ سے بدلہ لیں گی تو پھر کیا ہوا؟''

اب وہ مجھے دیکھنے لگی اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی۔ ''میں نے یہ بدلہ لینے کا سوچا تھا اور میں اپنی بیٹی کو کسی بھی راستے پر ڈال سکتی تھی۔ مگر میں نے دیکھا کہ تین سال کی بچی کاغذ پر لکیریں ڈال رہی ہے۔ اور ان لکیروں سے کوئی تصویر بن رہی ہے۔ اُس بچی نے ایک دفعہ نہ پوچھا کہ اُس کا باپ کون ہے۔ شاید بچے کو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ باپ بھی ہوتا ہے۔ بچے کو کیا معلوم کہ وہ کیسے دنیا میں آیا ہے اور جو اُسے گود میں خوراک دیتی ہے اور پیار کرتی ہے۔ اُس کے علاوہ بھی کوئی ہو سکتا ہے۔'' اُس پوری سیلن زدہ اور بیوگی کا سوگ اوڑھے اولڈ ہوم کی عمارت میں ہوا بھی پچاس سالوں کی قیدی تھی۔ اولگا کے چہرے پر ایسی ہلکی سی خوشی بکھری ہوئی تھی جیسے وہ اُس ناجائز بیٹی کے متعلق کچھ فخر سے بتانا چاہتی ہے۔ میرے لئے بھی یہ تجسس تھا کہ راجستھان کے ایک راجے کی اُس بیٹی کو دیکھوں۔ کس قد کاٹھ کی ہوگی۔ میں نے زندگی میں ناجائز اولاد......''

یہ کہہ کر آنس رک گئے اور نہیں معلوم کہاں چلے گئے۔ بس اتنا کہا ــــــ ''میں کہاں ہوں؟ اور یہ کون سا وقت ہے؟''

میں نے بتایا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ اولگا کی بیٹی سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ وہ جو راجہ کی بیٹی تھی۔

''راجہ کی بیٹی ناجائز اولاد نہیں تھی۔ کوئی بھی ناجائز نہیں ہوتا۔ ایک فطری عمل کے نتیجے میں پیدا ہونے والے کو کسی بھی طرح سے ناجائز نہیں کہا جا سکتا۔ یہ ہمارے تعصبات ہیں۔ میں کسی کے ساتھ رضامندی سے سیکس کرتا ہوں تو اُس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا بچہ بالکل جائز ہوتا ہے۔ اُسے ہم باپ کا نام کیوں نہیں دیتے۔ یہ ہماری بددیانتی ہے۔''

میں یہ دلیل سمجھ نہ سکی کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔ شاید کوئی اور بات کبھی سامنے آسکتی تھی۔ بس اتنا پوچھا کہ آپ اُسے ملے؟

''ہاں اولگا بتانے لگی کہ وہ آرٹسٹ بن گئی ہے۔ وہ پیدائشی طور پر آرٹسٹ ہے۔ بچپن ہی سے تصویریں بنانے لگی تھی۔ جونہی پیدا ہو کر وہ میری گود میں آئی وہ میری بن چکی تھی۔ راجہ کا اُس سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا مگر میں حیران ہوں وہ اپنے باپ کی شکل ہے۔ میں اُسے اُس کا باپ نہیں مانتی۔ بس ایک جرثومہ تھا جو میرے اندر ڈال دیا گیا تھا۔ میں اُس راجہ سے بدلا لوں اور اُسے سڑک کے کنارے کھمبے کے پاس کھڑی کر دیا کروں یا کسی نائٹ کلب میں بیچ دوں۔ مگر مجھ سے یہ نہ ہو سکا۔ یہ راجہ سے انتقام نہ ہوتا۔ اپنے آپ سے ہوتا۔ مجھے تو وہ رات بھی بھول گئی تھی۔ مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں تھا کہ وہ کوئی تھا بھی کہ نہیں۔ کہنے لگی وہ بہت خوش

ہے کہ برلن کی دیوار گر گئی ہے۔ ہاں میں بتاؤں برلن کی دیوار کے اِس طرف دیوار کو اُسی نے Paint کیا تھا۔ آپ نے ٹوٹی ہوئی دیوار کے ٹکڑے دیکھے جو لوگ لے کر گئے۔ کچھ ٹکڑے اِدھر بھی آئے۔ میری بیٹی لارا کے برش سے جو Stroke لگے اُن کی یاد کے ٹکڑے وہ لے آئی ہے۔ لگتا ہے اُس کی پینٹنگ جو میورل تھی کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور لوگوں نے ان ٹکڑوں کو اپنے اپنے ڈرائینگ روموں میں سجا دینا ہے۔ میں نے بتایا کہ برلن دیوار کے دوسری طرف بھی لوگوں نے طرح طرح کی پینٹنگز بنائی تھیں۔ بلکہ انہیں تو گریفیٹی کہتے ہیں۔"

وہ تڑپ کر بولی۔ "برلن دیوار کے اُس طرف پینٹنگز بنانے والا کوئی نہیں تھا۔ اِس طرف میری بیٹی لارا تھی۔ وہ پیس آف آرٹ تھا جو ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اس کی کچھ تصویریں ہیں میرے پاس۔" وہ بولے جا رہی تھی کہ میں نے کہا۔ "لارا کہاں ہے؟"

"لارا آج پارٹی میں گئی ہے۔"

"پارٹی ـــــ؟"

"ہاں دیوار گرنے کے بعد یہاں کے لڑکے لڑکیاں بہت خوش ہیں اور وہ کسی کلب یا کسی جھیل کے کنارے جمع ہوئے ہیں اور اس لمحے مل کر Celebrate کر رہے ہیں۔ یہ لمحہ اِس معاشرے کے لئے تو خواب تھا۔ اب خواب میں سب گذرے وقت کو اپنی مرضی سے گذارنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"گذرے وقت کو اپنی مرضی سے کیسے گذارا جا سکتا ہے؟"

"وہ ایسے کہ آپ اُس وقت کو یاد کریں۔"

"اولگا تم اُس وقت کو یاد کرو۔ جس رات میں اور تم وائی ایم سی اے کے ایک کمرے میں بیٹھے تھے اور تم نے مجھے پولینڈ کی Cheese کھلائی تھی۔ اور میں تم پر بالکل عاشق نہیں تھا نہ میں نے تمہیں ریپ کرنا تھا۔"

"کاش تم میرے قریب آ کر میرے ہونٹوں پر بوسہ دیتے اور لپٹ جاتے اور میں تمہاری آغوش میں آ جاتی اور پھر یہ جو میری بیٹی آرٹسٹ بنی ہے شاید یہ تمہاری بیٹی ہوتی۔"

اب میں نے اولگا کے ہاتھ کو اور مضبوطی سے پکڑ لیا اور میں چاہتا تھا اُسے اِس اولڈ ہوم سے نکال کر لے جاؤں۔ اولگا مجھ سے بڑی تھی اور میں اولگا سے نہ محبت کرتا تھا نہ اُسے کوئی جذباتی سہارا دے سکتا تھا۔ ہاں اُسے اخلاقی سہارا دے سکتا تھا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا اور مجھے وہاں سے نکلنا تھا کہ میں کچھ لوگوں کے ساتھ تھا۔ میں نے اُسے کہا۔ "اب شاید کبھی ملاقات نہ ہو سکے گی۔ اتنے زیادہ اتفاق نہیں ہوا کرتے۔" میں نے ہاتھ چھڑایا تو

اس نے کہا۔ ''میری بیٹی کی تصویر تو دیکھ لو۔'' اُس نے اپنے تکیئے کے نیچے سے تصویر نکالی۔ میں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ مکمل انڈین نقوش کے ساتھ راجستھانی چوڑا ماتھا، موٹی آنکھیں، بھرے بھرے ہونٹ اور قد کاٹھ راجوں مہاراجوں والا۔ کیا تحفہ انڈیا سے لے کر آئی تھی اور پھر بھی گلہ کرتی تھی کہ اُسے انڈیا میں ریپ کیا گیا۔ میں جانے لگا تو پھر روکا اور برلن کی دیوار کا ایک ٹکڑا دکھایا جو اُس کی بیٹی نے پینٹ کیا تھا۔ اتفاق سے یہ اولگا کے پورٹریٹ کا آدھا حصہ تھا جو اُس نے برلن کی دیوار پر بنایا تھا اور اب اُسے ماں کے لئے بچا کے لے آئی تھی۔ اولگا نے کہا۔ ''کیا تم یہ تحفہ قبول کرو گے؟'' میں نے کہا۔ ''میرے لئے مشکل ہوگا اور پھر اس طرح کے ٹکڑوں کے ساتھ جو جذباتی رشتہ ہے یہ لمحاتی ہے۔ جو لوگ بھی ڈرائینگ روم سجانے کے لئے یہ تاریخ لے کر جا رہے ہیں، کچھ عرصے بعد یہ ان کے ڈرائینگ روموں سے نکال دیئے جائیں گے اور میں آ گیا——''

اب ساری بات تو معلوم ہو چکی تھی۔ آنس ابھی تک برلن میں تھے۔ کہنے لگے۔ ''دیکھو کسی نے آنا تھا۔ میں نے برلن کے مسلمانوں کے قبرستان جانا ہے۔''

میں چونکی یہ کیا کھلنے والا ہے۔ اُس دن مجھے محسوس ہوا کہ ایک تاریخ لکھنے والے اور کہانیاں لکھنے والی کی شادی ایک مثالی تجربہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اگلے ہی لمحے محسوس ہوا۔ میں تو ایک نرس ہوں۔ میری ذمہ داری تو بدل چکی ہے۔ کہانیاں لکھنا بھول چکی ہوں کہ کہانیوں کے نیچے دبتی جا رہی ہوں—— میں کہہ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ برلن میں نہیں ہیں۔ میں نے بات بنائی کہ اتنی دوپہر میں برلن کے مسلمانوں کے قبرستان میں کیا جا کر کریں گے؟''

''وہ دراصل پاکستان سے آتے وقت دو فرمائشیں مجھ سے ایسی کی گئیں جن کا میری تاریخی ریسرچ سے تعلق تھا۔ ایک صاحب نے کہا میرے باپ کی قبر برلن میں ہے۔ اُس کی تصویر لے کر آئیں میں ممنون ہوں گا کہ میں جرمنی نہیں جا سکتا۔ دوسرے صاحب نے کہا میرا باپ زندہ ہے کسی نے آ کر بتایا ہے۔ مگر وہ کسی کو پہچانتا نہیں ہے۔ وہ دیوانگی میں ہے۔ اُس کی تصویر لے کر آئیں۔ یا اُس سے باتیں کر کے دیکھیں کہ کیا وہ منڈی بہاؤالدین کے ایک گاؤں کو جانتا ہے۔''

میں حیران ہو رہی تھی کہ آنس تو ٹھیک ہو رہے تھے۔ ساری باتیں برلن کی ترتیب سے کرتے جا رہے تھے۔ لیکن فوراً ہی مجھے ڈاکٹر کی بات یاد آ گئی کہ جب ان کی یادوں کا کوئی ٹریک شروع ہوگا تو وہ چلتا جائے گا۔ اُسے آپ نہ روکیں۔

''تو پھر برلن میں آپ ابھی جائیں گے پہلے قبرستان دیکھنے۔''میں نے ایسے ہی کہا کہ بات چلتی رہے مگر وہ کہنے لگے۔''میں قبرستان سے ہو کر آ گیا ہوں۔''

''وہاں کیا دیکھا؟''اب مجھے کہنا تھا۔

''دوسری جنگِ عظیم شروع ہونے سے پہلے انگریز نے ہمارے پنجاب اور جو پنجاب اب انڈیا میں ہے، سے سپاہیوں کی بھرتیاں کیں۔ انڈیا کے پنجاب سے تو صرف وہ لوگ گئے جو ملازمت کرنا چاہتے تھے اور ہڈ کاٹھ کے اعتبار سے انگریز کی ضرورت تھے۔ ویسے بھی سکھوں میں دنیا دیکھنے کی تڑپ اور پیسہ کمانے کے لئے کہیں بھی جانے اور محبت کرنے کا جذبہ بہت نمایاں ہے۔ کہتے ہیں اگر دنیا کے کسی بھی کونے میں ایک مقامی باشندہ ہوگا تو دوسرا سکھ ہوگا۔ لیکن ہمارے پاکستانی پنجاب سے کوئی جانے کو تیار نہیں تھا کہ یہاں کے لوگ زراعت سے وابستہ ہونے کی وجہ سے لسی روٹی پر گذارا کر سکتے تھے۔ یہاں انگریز نے یہ چال چلی اور دیکھا کہ جو جاگیردار اور زمیندار گھرانے انگریز کی خوشامد اور انگریز کے کلچر اور زبان سے محبت میں مبتلا ہیں اور انگریز کی جگہ پر اپنی اولاد کو کمشنر ڈپٹی کمشنر لگوانا چاہتے ہیں اور ایچی سن کالج میں داخلے کے خواہش مند ہیں تو پھر اُن سے کام لیا جانا ضروری ہے۔ اس لئے انگریز نے اِدھر کے پنجاب کے وڈیروں، جاگیرداروں اور زمینداروں کو فوج میں بھرتی کے لیے کڑیل جوانوں کی فوجی مراکز پہ پیش کرنے کا حکم دیا اور بدلے میں جاگیریں دینے کی پیشکش کر دی۔ اب تو ''عام لام'' کی اصطلاح سامنے آ گئی۔ جس کا مطلب تھا کہ عوام کو بھرتی کے لئے مجبور کیا گیا اور ''لام بندی'' کے لئے عام آدمی کی لائن لگوا دی گئی۔ جو نہ گورے کی زبان جانتے تھے نہ کوئی اور زبان۔ انہیں تھائی لینڈ کے محاذ پر بھیج دیا گیا۔ ایک بہت بڑا قبرستان تھائی لینڈ میں اس لئے موجود ہے کہ جاپان کی فوجیں اور امریکہ کی فوجیں وہاں لڑی تھیں۔ تو میں جب وہاں گیا تو قبرستان انتہائی آراستہ پیراستہ تھا۔ قبروں کی قطاریں ایسی بنائی گئی تھیں جیسے سکول کے بچے پی ٹی شو میں قطار باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ اب میں ایک ایک کتبہ پڑھ رہا تھا۔ اللہ بخش ولد محمد بخش، قصور پنجاب۔ اللہ دتہ ولد محمد ڈوایا، میاں چنوں پنجاب۔ محمد سبحان ولد احمد علی، گوجرانوالہ پنجاب۔ نعمت علی ولد سلامت علی، چکوال۔ شعبان علی ولد مہربان علی، ڈیرہ غازی خان۔۔۔۔''

میں حیران تھی کہ آنس یہ سب آسانی سے یاد کر کے بول رہے تھے کہ وہ چپ ہو گئے اور کہا۔۔۔ ''برلن کی قبریں بھی یہی تھیں۔ لگتا ہے میں برلن ہی میں تھا۔ تھائی لینڈ بیچ میں کیسے آ گیا۔ لگتا ہے

بھولنے لگا ہوں۔ جب قبریں آپس میں گڈمڈ ہو جائیں تو سمجھو آدمی کے اندر قبریں بننا شروع ہو گئی ہیں۔''

''ہاں آپ نے برلن کے قبرستان میں ایک پاکستانی کے باپ کی قبر دیکھنی تھی۔'' میں نے یاد دلایا۔

''ہاں اُس کا نام محمد شفیع ولد محمد قدیر تھا۔ بہت سی قبروں میں یہ قبر بھی موجود تھی۔ یہ بھی دوسری جنگِ عظیم کے فوجیوں کا قبرستان تھا۔ اور ایک ایسی قبر بھی تھی جس پر لکھا تھا گمنام فوجیوں کی قبر —— اس میں کتنے لوگ تھے۔ ان کے نام کیا تھے۔ اب کیا فرق پڑتا ہے۔ ہندوستان کے دیہاتوں سے لائے گئے یہ کڑیل جوان تاریخ کا ایندھن بن گئے۔ میں نے شکر ادا کیا کہ محمد شفیع ولد محمد قدیر گمنام قبر میں نہیں گیا۔ یہ خوشخبری سنانے کے لئے میں نے وہ تصویر بنائی اور اُس کے بیٹے کے حوالے کی۔ بیٹا بہت خوش ہوا کہ اس کا باپ قبر میں سکون کی نیند سویا ہوا ہے۔ اُسے جسم کے کس حصے میں گولیاں لگیں تاریخ خاموش ہے۔''

''آپ ابھی برلن میں ہیں تو دوسری فرمائش پوری نہیں کریں گے؟''

''ہاں ہاں، وہ تو میں حیران تھا کہ جو فوجی ہندوستان کے شہروں سے تھے۔ جنگ بندی ہوئی اور برلن کی دیوار کھڑی کی گئی تو ہندوستانی فوجی ایسی کیفیت میں تھے کہ وہ جیتے یا ہارے ہیں۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ اُن کا وطن کیا ہے؟ وہ کہاں جائیں گے جو اپنے پیچھے نو بیاہتا دلہنیں یا بچوں کو گود میں لئے بیویاں چھوڑ آئے تھے۔ وہ نیم پاگل ہو کر پوچھتے پھرتے تھے کہ ہندوستان جیتا ہے یا ہارا ہے۔ کوئی انہیں جواب دینے والا نہیں تھا۔ کچھ لوگ پوچھتے یہ ہندوستان کہاں ہے؟ جواب آیا دنیا میں کہیں ہے جہاں سے فوجی آتے ہیں۔ پھر وہ پاگلوں کی طرح پھرتے تھے کہ کون سا بحری جہاز انہیں ان کے گھر لے جائے گا۔ اس کا جواب بھی نہیں آتا تھا کہ نازی جرمنی کو شکست ہو چکی تھی۔ انگریزی بولنے اور سمجھنے والا کوئی نہیں تھا۔ میں اُس جگہ پہنچا جہاں برلن میں ایک علاقہ ایسا ہے کہ جہاں وہ ہندوستانی فوجی جو زندہ ہیں، رہ گئے ہیں۔ ان کی عمریں ستر اسی سال کے آس پاس تھیں۔ انہوں نے جرمن عورتوں سے شادیاں کر لی تھیں اور پھر بچے پیدا کر کے اپنی شناخت اور یادداشت بھول چکے تھے۔ میں ایک عجائب گھر میں داخل ہو چکا تھا۔ ان میں جو ہندوستانی فوجی وہاں رہ گئے تھے، عجیب حلیوں میں موجود تھے۔ کسی نے بیڈ شیٹ کو چادر بنا کے پہنا ہوا تھا۔ کسی نے کوٹ کے نیچے شلوار پہنی ہوئی تھی۔ وہ شلوار اُس کے ساتھ ہی برلن آئی ہو گی —— یہ کون تھے؟ یہ شیخوپورہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ، منڈی بہاؤالدین، قصور، نارووال، ساہیوال، لالہ موسیٰ، جہلم، کھاریاں وغیرہ سے تعلق رکھتے تھے۔ میں تو ایک فوجی کی تلاش میں تھا۔ جس کا نام صدیق ولد عتیق تھا۔ میں جس سے بات کرتا وہ مجھے تکتا اس لئے کہ سب دیوانگی کی آخری حد کو پہنچ

چکے تھے۔ان کی اولادیں جرمن عورتوں سے پیدا ہو چکی تھیں۔اب جو میں نے اُن جرمن عورتوں کو دیکھا تو حلیے سے وہ بے حد موٹی، بدشکل، بے ڈھنگی، بے ڈول اور بے ہیئت تھیں۔اب مجھے پتہ چلا کہ جنگ نے برلن کو کس حال میں پہنچا دیا ہے۔جرمن عورتیں کبھی بھی خوبصورت نہیں تھیں۔بس یوں تھا کہ وہ سفید چمڑی کی وجہ سے ہم ہندوستانیوں کے لئے ایک بے ذائقہ پکوان کی حیثیت رکھتی تھیں جن سے ضرورت پوری ہو سکتی تھی۔جو ہندوستانی فوجی برلن میں رہ گئے تھے وہ نہیں جانتے تھے ایک نیا ملک پاکستان بنا دیا گیا ہے۔کیسے بنایا گیا؟ ان کو کچھ خبر نہیں تھی۔پہلے وہ مختلف کیمپوں میں تھے۔انہیں برلن کے کسی کیمپ میں لایا گیا اور پھر انگریزی فوجوں نے ہندوستانی فوجیوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا کہ اب ہندوستان آزاد ہو رہا تھا۔۔۔۔اب ان فوجیوں سے ان کا کوئی رشتہ نہیں رہا تھا۔غلاموں کو انہوں نے برلن میں آزاد کر کے بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔اب وہ اچانک اپنے آقاؤں سے محروم ہو چکے تھے۔نئے آقا موجود نہیں تھے۔خود انہیں کہ وہ پیشے سے کسان ہوا کرتے تھے، معلوم نہیں تھا کہ وہ دنیا کے کس کونے میں بے وطن ہوئے ہیں۔وطن ہے بھی کہ نہیں۔وطن اغوا تو ہوا تھا۔کیا اب بازیاب ہو گیا ہے یا نہیں؟۔۔۔۔''

''جرمن حکومت نے انہیں وہاں رہنے کی اجازت دے دی؟'' میں بات مکمل کرنا چاہتی تھی۔

''جرمن حکومت کو اس جنگ نے بہت زخم دیئے۔وہ زخم چاٹنے میں مصروف ہو چکی تھی۔کون کہاں تھا کسی کو خبر نہیں تھی۔شہر بمباریوں سے ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔جنگی قیدیوں کو ان ملکوں کی طرف دھکیل دیا گیا جن ملکوں سے وہ تعلق رکھتے تھے۔مگر یہ فوجی تو جس ملک سے تھے، وہ ملک جنگ میں لڑا ہی نہیں تھا۔یہ تو غلام فوجی تھے۔جرمنوں کو اُن کی اِس حیثیت کا پتہ ہی نہیں تھا اور وہ سب جرمن زبان بھی نہیں جانتے تھے۔اب اس ہاری ہوئی فوج کے سپاہیوں نے ٹوٹی پھوٹی جرمن سیکھی اور ان عمارتوں میں رہنے لگے جو جنگ کے دوران اُجڑ چکی تھیں۔بمباری سے ڈھے چکی تھیں۔دن بھر کسی نہ کسی طرح خوراک حاصل کرتے۔بعض جگہ راشن تقسیم ہوتا تو قطار میں لگ جاتے۔اس طرح انہوں نے جرمن عورتوں سے رسم و راہ بنائی تاکہ یہیں رہ سکیں اور پھر اُن شادیوں کے نتیجے میں وہ جہاں سینگ سمائے رہنے لگے۔پھر شاید سرکار نے ایک متروک علاقے کے گھروں میں ان کو ایک ساتھ رہنے کی اجازت دے دی اور میں اب اُس علاقے کی تلاش میں جا رہا تھا۔''

''اُن کی عمریں ستّر ستّر سال کی تو ہو چکی ہوں گی۔اُس وقت جب دیوارِ برلن ٹوٹی تھی۔''

''وہ تھے بھی کہ نہیں، مجھے نہیں معلوم۔ ان کے لئے پاکستان کا کوئی معنی نہیں تھا۔ جیسے منٹو کے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کے لئے پاکستان کا کوئی معنی نہیں تھا بلکہ اب تو اُس کے لئے ہندوستان کا بھی کوئی معنی نہیں رہ گیا تھا۔ اسی لئے تو وہ بولا۔ ''پاکستان اینڈ ہندوستان آف دی دُر رفٹے منہ۔'' وہ جانتے تھے کہ وہ جن گھروں سے نکلے تھے۔ وہ گھر، وہ بستیاں، وہ گاؤں اب موجود بھی ہوں گے کہ نہیں۔ جو اپنی نو بیاہتا بیویاں چھوڑ آئے تھے۔ ان کی یاد بھی جلدی ان کے وجود سے الگ ہو گئی کہ وہ صرف چند راتوں کی بیویوں کو اچھی طرح دیکھ بھی نہیں سکے تھے کہ لام بندی میں آ گئے۔ جن کی بیویوں کے پیٹ میں بچے تھے یا گود میں تھے۔ وہ پاکستان بننے کے بعد اس قابل بھی نہ تھیں کہ اپنے ان خاوندوں کا سراغ لگا سکیں۔ انہیں مردہ سمجھ لیا گیا ہوگا کہ شہید کا تصور تو پاکستان بننے کے بعد وجود میں آیا تھا۔''

''آپ کو جس نے اپنے باپ کی تلاش کے لئے رابطہ کیا تھا۔ اُسے کیسے معلوم ہوا کہ وہ فوجی زندہ ہیں اور جرمنی میں شادیاں کر کے رہ رہے ہیں؟''

''کچھ لوگ جو برلن آتے جاتے تھے۔ انہیں اس کا علم ہوا تو اخبار میں خبریں نکلیں اور اُن میں سے ایک آدھ نے اپنے گھر خط لکھ کر اطلاع بھی دی تھی۔ مگر پیچھے ان کے والدین گذر چکے تھے۔ کوئی اُن کو واپس لانے کے لئے موجود ہی نہیں تھا۔ خط کو شاید کوئی پڑھنے والا نہیں تھا۔ ایک دن کوئی مجھ سے ملنے آیا کہ اُسے بتایا گیا میں دنیا گھومتا پھرتا ہوں۔ وہ کوئی پچاس کے لوگ بھگ آدمی تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ منڈی بہاؤالدین سے آیا ہے۔ اس کا باپ عام لام بندی میں گوروں کی فوج میں بھرتی ہوا تھا۔ میں اُس وقت ماں کی گود سے نکلا ہی تھا۔ ایک مدھم سی باپ کی تصویر کچھ عرصہ گھر کے کچے کوٹھے میں برتنوں کے ساتھ ماں نے فریم کر کے رکھی ہوئی تھی۔ اب تو تصویر بھی موجود نہیں ہے۔ بس اتنا پتہ ہے کہ میرے باپ کا نام صدیق ولد عتیق ہے۔'' ذرا رک کر پھر بولے۔

''اب جب میں برلن کے پچھواڑے اُس پرانے گھروں کی آبادی میں پہنچا تو لگا میں اُس برلن میں آ گیا ہوں جو دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے پر تھا۔ طرح طرح کے چہرے پاکستانی اور جرمن ملاپ سے نکلے ہوئے عجیب ڈب کھڑبے کتوں جیسے لگتے تھے۔ میرا وہاں دَم گھٹنے لگا تو میں نے پاکستان ایمبسی کے افسر سے کہا جو مجھے وہاں لے گیا تھا کہ کسی طرح معلوم کرو صدیق ولد عتیق نام کا کوئی زندہ ہے یا نہیں۔ زیادہ دیر نہیں لگی کہ ہم ایک کمرے میں بٹھائے گئے اور ایک چھ فٹ کا کبڑا بابا آ کر سامنے بیٹھ گیا۔ وہ سب کچھ بھول چکا تھا۔ اُسے

اب یاد دلا نا تھا۔ میں نے کہا۔ ''میں پاکستان سے آیا ہوں۔''

''کون پاکستان ــــ یہ کون ہے؟ کہاں ہے؟ میں ہندوستان سے ہوں۔''

اب مجھے منٹو کا ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' دوبارہ یاد آ گیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ ہندوستان میں ہے کہ پاکستان میں ــــ اسی لئے تو وہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کو دُرّ فٹے منہ کہتا ہے اور پھر ''نومینز لینڈ'' پر گر جاتا ہے۔

میں نے اُسے کہا کہ پاکستان، ہندوستان سے الگ ہو کر ایک ملک بنا ہے۔

''میں اُس ملک کو نہیں جانتا۔ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستانی ہو کر انگریز کی فوج میں بھرتی ہوا تھا۔ میں نہیں جانتا۔ پاکستان کیا ہے؟''

''پاکستان، ہندوستان کی آزادی کے بعد ایک آزاد ملک کے طور پر وجود میں آیا ہے۔''

''کس نے فیصلہ کیا؟ میں نہیں جانتا۔ کیوں پاکستان بنایا گیا؟ میں تو اپنے پنڈ میں خوش تھا۔ مجھے کسی ملک کی ضرورت نہیں تھی۔ میں تو زمین پر ہل چلا رہا تھا جب مجھے وہاں سے اُٹھایا گیا۔ میرا کیا قصور تھا؟ میں نے تو فوج دیکھی بھی نہیں تھی۔'' پھر وہ رُک گیا۔ خلا میں گھورنے لگا۔ میں نے اُسے کہا کہ تم منڈی بہاؤالدین سے ہوناں؟

''ہاں منڈی بہاؤالدین ــــ اب وہ کہاں ہے؟''

''اب وہ پاکستان میں ہے۔ جن علاقوں کو پاکستان میں رکھا گیا ہے وہ اب اُس میں ہے۔''

''ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟''

''وہ بھی پاکستان میں ہے۔'' اب مجھے یقین ہو گیا کہ میں منٹو کے کردار ٹوبہ ٹیک سنگھ سے مل رہا ہوں۔

''تو میں کہاں ہوں؟''

''آپ جرمنی کے شہر برلن میں ہیں۔''

''میں تو دنیا میں کہیں بھی نہیں ہوں کہ جنگ کے بعد مجھے نہیں پتہ میں کہاں ہوں۔''

میں نے اُسے یاد دلایا کہ اس کے بیٹے نے مجھے یہ نام پتہ دیا ہے اور میں آیا ہوں اور تمہارا ایک بیٹا بھی ہے جو منڈی بہاؤالدین میں ایک کسان ہے۔''

''وہ میرا بیٹا کیسے ہو گا؟ میں تو اُن کے لئے مر چکا ہوں۔ جو بندہ دنیا میں نہ ہو وہ کسی کا باپ نہیں ہو سکتا۔''

''جب تم عام لام بندی میں بھرتی ہوئے تھے تو تمہاری بیوی نے تمہارے بیٹے کو پیدا کیا تھا۔''

''تم کون ہوتے ہو مجھے بتانے والے؟ وہ میرا بیٹا تھا کہ نہیں تھا۔ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟''

''نہیں ثبوت تو نہیں ہے۔ اُس نے یہ کہا تھا کہ میرے باپ صدیق ولد عتیق کی تصویر لے آنا۔ میں آپ کی تصویر لے لوں۔''

''تم جرمن خفیہ پولیس کے آدمی ہو۔ تم میری تصویر لے کر مجھے جرمنی سے نکالنا چاہتے ہو۔ جرمن خفیہ پولیس کے لوگ مسلسل میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ میں جرمنی سے نہیں جاؤں گا۔''

مجھے محسوس ہو گیا کہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں کہ منڈی بہاؤالدین میں کوئی ہے۔ یا اُس کا کوئی تعلق بھی ہے۔ میں نے بات نہ کی اور اُٹھ کر جانے لگا۔ چند لمحوں بعد مجھے اُس کے رونے کی آواز آئی۔ میں نے مُڑ کر نہیں دیکھا۔ اُسے تنہائی میں رونے دیا۔ اس کی آواز مجھے آتی رہی——''

کچھ دن بس خلا میں گھورتے۔ کتابوں کو اُلٹ پلٹ کرتے ہوئے گذر گئے۔ کسی خواب سے بھی نہیں گذرے۔ کسی کتاب نے بھی کچھ یاد نہ دلایا۔ میں سمجھی کوئی ایسی لہر نہیں اُبھری جو یادوں کو اُچھال کے لے آئے۔ میں ہر طرح سے ان کا خیال رکھ رہی تھی۔ ایک دن میری ایک دوست سارا سیبن جو انسانی حقوق کے لئے خواتین کے چیپٹر کی کارکن تھیں، نے مجھے بتایا کہ تمہیں گھر کے کام کاج کے لئے عورت چاہئے تھی۔ تو ایک عورت میں آپ کو اس مقصد کے لئے دے رہی ہوں۔ اُس کا آگا پیچھا کوئی نہیں ہے۔ میں نے سارا سے کہا۔ اُس کی ذمہ داری تم لو گی۔'' ہاں میں لوں گی اور وہ تمہارے ہی پاس رہے گی۔ اس کا کوئی گھر نہیں ہے۔'' میرے پاس سرونٹ کوارٹر خالی پڑا تھا۔ جب سے بچے شادیوں کے بعد پاکستان سے باہر جا چکے تھے۔ ہم نے کوئی ملازمہ نہیں رکھی تھی۔ صفائی اور برتنوں کے لئے ایک خاتون آتی تھی اور کام سے زیادہ اپنی زندگی کے حادثوں کا بیان ایسے کر کے جاتی تھی کہ جیسے کوئی محرم کی مجالس میں بیان کرتا ہے۔ میں چاہتی تھی کہ اگر کوئی مستقل آ بسے تو اُس کو اُس کی ضرورت کے پیسے دے کر خود کو بچا لوں۔ ایسا ممکن ہو رہا تھا سو میں نے اُس خاتون کو آنے کی اجازت دے دی۔ سارا سیبن کے حوالے سے جو خاتون

آئی وہ بمشکل بیس سال کی تھی۔ شکل وصورت سے نکھری ہوئی۔ قد بت میں سنبھلی ہوئی۔ نہ اِدھر اُدھر نکلی ہوئی نہ جسم میں اُتھلی ہوئی۔

میں نے نام پوچھا۔ ''بی بی نام تو نام والوں کے ہوتے ہیں۔ ہمیں تو کوئی بھی نام چپکا دو چپک جاتا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''مثلاً'' ــــــ وہ جی جیسے کالو، گلابو، کمو، بھولی۔''

''تو اب تیرا کیا نام ہے؟''

''بی بی سمجھو کملی۔''

''اب میں تمہیں کملی کے نام سے کیسے پکاروں گی؟ اصلی نام بتاؤ۔''

''اصلی نام تو جی بھول گیا ہے ویسے سکینہ نام ہے میرا ــــــ''

اب میرا ماتھا ٹھنکا کہ سارا سبین نے ایک کردار میرے گھر داخل کر دیا ہے۔ لیکن سارا سبین چونکہ انتہائی ذمہ دار دوست ہے تو میں نے کیا بولنا تھا۔ اب یہ ہوا کہ اُس کملی عرف سکینہ نے تقریباً گھر کو سنبھال لیا۔ اب وہ بولتی بھی نہیں تھی۔ اُس کو معلوم تھا کہ ہمارا گھر کس قسم کا ہے۔ ظاہر ہے سارا سبین نے اُسے مکمل طور پر سمجھا کے بھیجا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ آنس کون ہے، اس لئے ایک دن اُس نے مجھے کہا۔ ''بی بی میں صاحب سے ملنا چاہتی ہوں۔''

مجھے کچھ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کیوں ملنا چاہتی ہے اور اُسے آنس کا کیا پتہ ہے۔ وہ تو ایک کام کرنے والی ہے۔ لیکن جب اُس نے بتایا کہ وہ اپنی کوئی بات آنس کو بتانا چاہتی ہے تو میں کیا کر سکتی تھی۔ سامنے پیش کر دیا ــــــ

''یہ ہمارے گھر کام کرتی ہے۔ وہ سارا سبین کے ریفرنس سے آئی ہے اور اب آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔'' میں نے یہ کہہ کر اُسے آنس کے سامنے کر دیا۔

''ہاں تو بی بی کیا کہنا ہے؟''

''وہ جی مجھے کسی نے بتایا ہے کہ آپ لکھتے ہیں۔''

''ہاں لکھتا تو ہوں۔ لیکن کیا لکھتا ہوں۔ نہیں نہیں جو لکھا ہے اُسے مٹانا چاہتا ہوں۔'' اب میں چونکی کہ آنس تو کسی اور ٹریک پر چڑھ گئے ہیں۔ وہ غریب تو ایک کام کرنے والی عورت ہے اُسے یہ سب کیا

معلوم ـــــ لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا ـــــ

’’میں نے جو لکھا۔ وہ کبھی فوج کو پسند نہیں آیا۔ کبھی مذہبی گروہوں کو تو کبھی نظریہ پاکستان کے نمک خواروں کو، تو کبھی تاریخ کی نوکری کرنے والے دانشوروں کو ـــــ میں لڑتا رہا اُن سے لیکن مجھے نہیں پتہ تھا کہ سعادت حسن منٹو آئے گا اور میرا گریبان پکڑ لے گا۔ وہ کل آیا تھا اور اُس نے میرا گریبان پکڑ لیا۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیوں آیا ہے۔ وہ میرا گریبان پکڑے بار بار کہہ رہا تھا۔ تم تاریخ دانوں نے بدمعاشی کی ہے۔ تم سب تاریخ دان ذمہ دار ہو انگریز راج کو لانے میں۔ اور ہندوستان کی ماں بہن کرنے میں۔ تم سب سیاسی پارٹیوں کے آلۂ کار تھے۔ تم سب انکل سام کے پٹھو تھے۔ تم سب گورے کے پالتو کتے تھے۔ تم سب تاریخ دانوں نے میرے ہندوستان کو کُند چھری سے ذبح کیا ہے۔ آدھا گاؤں اِدھر تو آدھا گاؤں اُدھر۔ ظالمو بکری کا گوشت بھی قصائی کاٹتا ہے تو جسم کے حصے کو اس طرح کاٹتا ہے کہ گوشت اور ہڈی کا رشتہ قائم رہ سکے۔ سب نے اپنے اپنے ہیرو بنا لئے۔ کسی نے نہرو کو، کسی نے ابوالکلام آزاد کو کسی نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ـــــ سب کیسے ہیرو بن سکتے ہیں۔ کہاں گیا ولا بھائی پٹیل، عبدالغفار خان ـــــ تم لوگ تاریخ نہیں لکھتے تم لوگ وقت کی دھار لکھتے ہو۔ بلکہ وقت کی دھار پر ناچتے ہو اور میں وقت کی دھار پر دھار مارتا ہوں۔ سمجھے کہ نہیں۔‘‘

اب میں تو سمجھ گیا تھا کہ دھار پہ دھار مارنا کیا ہوتا ہے مگر منٹو کو کون سمجھاتا۔ وہ تو غصے میں تھا۔

تم سب تاریخ کے دلال ہو تم نے ہیرو بنانے کی فیکٹریاں لگا لیں اور سارا ملبہ گاندھی پہ ڈال دیا۔ اور ویسے گاندھی تھا کون؟ ایک بہروپیا اور اُس بہروپیے کی تصویر انڈیا کے کرنسی نوٹ پر چھپتی ہے تو خود اُس کی قوم اُس کا مذاق اڑاتی ہے اور تم سب تاریخ کے تاجروں نے میرے ہندوستان کو خون سے نہلا دیا۔ یاد رکھو ہندوستان میرا تھا۔ میں امرتسر میں پیدا ہوا۔ ابھی بھی وہ گھر موجود ہے۔ میں ایک رات پہلے پورے ہندوستان کا افسانہ نگار تھا۔ اگلے دن میں صرف پاکستان کا افسانہ نگار ہو گیا۔ کس نے میرے نیچے سے چادر کھینچ لی۔ بتاؤ؟ تاریخ کا چوغہ پہننے والے جادوگرو۔ بہت فریب کیا ہے تم لوگوں نے دنیا کی ہسٹری میں۔ بڑا دھوکہ کیا ہے دنیا کی تاریخ کے ساتھ۔ مظلوموں کو رعایا بنا دیا اور طاقتور کو مالک۔ واہ واہ تمہارا انصاف۔ تم لوگوں نے بہادر شاہ ظفر کی غزل کو اتنا اچھالا کہ دنیا رونے لگی۔ شامِ غریباں بنا دیا بہادر شاہ ظفر کو اور غالب کو لطیفوں میں لپیٹ دیا۔ وہ صرف لطیفے پیدا

کرتا تھا۔ کسی نے غالب کا یہ شعر عام کیا کہ جب وہ کہتا ہے ؎

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

پتہ ہے غالب کس کو چیلنج کر رہا ہے۔ اپنے رب کو کہ اس کائنات کو میں نے بس ایک قدم میں پالیا ہے۔ اب میری خواہش ہے کہ میں اس کائنات پر دوسرا قدم کہاں رکھوں۔ کیونکہ میں نے جو دیکھا ہے وہ دشتِ امکاں ہے۔ مطلب یہ کہ ایسا جنگل جس کا یقین نہیں ہے بس ایک امکان ہے کہ ہو یا نہ ہو۔ اور وہ بھی میرے دوسرے قدم کا نقش ہے۔ یہ تھا غالب۔ اے تاریخ کے پجاریو! تم جب غالب کو نہ سمجھ سکے تو منٹو کو کیسے سمجھ سکتے تھے۔ ہاں مگر ایک بنگالی ادیب نے غالب اور منٹو کو اکٹھا کر دیا ہے۔ اب یہ بھی میں تمہیں بتاؤں گا؟ تو سن لو۔ اس کا نام ربی سنکر بال ہے اور اس کے ناول کا نام ''دوزخ نامہ'' ہے۔

منٹو میرا گریبان پکڑے مسلسل چیخ رہا تھا۔ وہ سچ کہہ رہا تھا۔ مجھے سننا تھا۔ اُس کی آواز اس کمرے میں موجود ہے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''کون کہتا ہے منٹو شراب پینے سے مر گیا۔ میں تو اُسی دن مر گیا تھا جب یہاں کے پہلے مورخ نے پہلا جھوٹ لکھا تھا۔ تاریخ لکھنے کی ذمہ داری تمہاری تھی، میری نہیں۔ میں کہانیاں لکھ رہا تھا تاریخ نہیں۔ تم لوگوں نے تاریخ کی ذمہ داری بھی میرے سر پر ڈال دی۔ میں صرف کہانی کار تھا۔ میرا اصل مسئلہ کہانی تھا تاریخ نہیں۔ وہ تم لوگوں نے لکھنی تھی۔ اور تمہارا ترقی پسند فیض احمد فیض جو جاگیرداروں کی ولایتی شرابیں پی کر روسیوں کے قصیدے پڑھتا تھا۔ میرے افسانوں پہ عدالت میں گواہی دینے آیا تھا۔ کہتا تھا ''کھول دو'' اور ''ٹھنڈا گوشت'' کمزور افسانے ہیں۔ میں نے خود روسیوں کے کمزور افسانے ترجمہ کئے ہیں۔ آج اُسے بتاؤ یہ دونوں افسانے کلاسیک کا درجہ لے چکے ہیں اور میری ایک کہانی ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' دنیا کی سو بہترین کہانیوں میں شامل ہو چکی ہے۔ آج میرا ہی بولا ہوا سچ ثابت ہو رہا ہے، جو میں نے انکل سام کے نام خطوط میں بولا تھا۔ یہ بھی کہو کہ بہت کنفیوژن تھا۔ کسی کو کسی بات کا ادراک نہ تھا۔

میں نے منٹو سے گریبان چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''منٹو صاحب! جناح کے اردگرد جاگیردار تھے جن کی مدد سے پاکستان قائم ہوا تھا۔ اور پھر ایک جگہ انہوں نے کہا تو تھا میری جیب میں کھوٹے سکّے ہیں۔'' منٹو اس پر طنزاً ہنسا اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ اے تاریخ لکھنے والو! منٹو صرف یہ جانتا ہے کہ پاکستان صرف اس کے افسانوں پر مقدمے بنانے کے لئے بنایا گیا تھا اور یہ سامراج کی چال تھی۔''

آنس نے ذرا وقفہ لیا تو میں نے کہا۔ ''منٹو صاحب تو چلے گئے۔ آپ سے ملنے یہ سکینہ آئی ہے۔ اسے کملی بھی کہتے ہیں۔''

''ہاں کیا کہنا ہے پوچھو۔ کوئی تاریخ کا راز دینے آئی ہے؟''

''یہ تو معلوم نہیں لیکن ہوسکتا ہے تاریخ ہی کا کوئی راز ہو۔''

''ہاں بولو، کملی نام اچھا ہے۔''

''کملی بولو کیا کہنا ہے؟''

''وہ جی میں ڈر گئی تھی۔ میری کہانی ہے جی۔ کوئی لکھ دے۔''

''میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ تاریخ لکھتا ہوں۔''

''وہ جی ابھی آپ کہانیوں کا ذکر کر رہے تھے۔''

''ہاں وہ تو منٹو بدمعاش آ گیا تھا۔ چھوڑو منٹو خود کو فراڈ کہتا ہے۔ فراڈ تھا۔ اس لئے تو میرے پاس آ جاتا ہے۔''

''میں عمر قید کی سزا کاٹ رہی ہوں۔''

پہلے میں چونکی پھر بولی۔ ''کملی تم نے یاسارا سین نے تو یہ بات نہیں بتائی؟''

''اسے مت روکو۔ یہ واقعی تاریخ میں کوئی ایف آئی آر رجسٹر کرانا چاہتی ہے۔''

''صاحب جی ہم لوگ جیتے نہیں ہیں۔ جینا پڑتا ہے اور جب بڑے ہونے لگتے ہیں تو کہیں اندر سے جلدی بڑے ہو جاتے ہیں۔''

''ٹھہرو، یہ تو تم نے جسم کا فلسفہ بول دیا ہے۔''

''پتہ نہیں جی۔ مجھے تو پتہ بھی نہ چلا کہ کب میرے باپ کو پولیس ماں کے قتل میں لے گئی۔ ہم دو بہنیں باقی رہ گئیں۔''

''ماں کا قتل؟ کیوں ہوا؟'' یہ آنس نے پوچھا___ میں نے کہا۔

''آنس تم کیا تاریخ لکھو گے۔ پاکستان کے نوے فیصد گھروں کے فیصلے کہیں نہ کہیں قتل پر ہوتے ہیں۔'' اب کملی بولی۔

''وہ جی، میں تو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میری بڑی بہن سے کسی نے شادی کر لی جو ہمارے خاندان کا تھا۔ اور مجھے تو وہیں رہنا تھا۔ ایک دن اُس نے مجھے کمرے میں بلایا اور میرے کپڑے اتارے اور میرے ساتھ زنا کیا۔''

''لڑکی تم جانتی ہو، زنا کیا ہوتا ہے؟''

''ہاں جس کے ساتھ زنا ہوتا ہے صرف وہی جانتی ہے کہ کیا ہوا؟''

''تو اب یہ بتاؤ کیا شکایت کرنا چاہتی ہو؟''

''کچھ نہیں جی۔ پوری بات یہ ہے کہ میرے اندر تبدیلی ہوتی رہی۔ مجھے اُس وقت پتہ چلا جب بچہ میری گود میں آ گیا۔ اب میری بہن نے مجھے گھر سے نکال دیا تھا کہ اس کا گھر بچ جائے۔ میں جہاں بھی جاتی تھی لوگ مدد کے بدلے میرا جسم مانگتے تھے۔ ایک دن تنگ آ کر میں نے بچے کے ساتھ خود کو مارنے کی کوشش کی۔ اور میں نے ایک نہر میں چھلانگ لگا دی۔ کوئی ظالم دیکھ رہا تھا۔ مجھے بچانے کے لئے کود گیا اور پھر اس نے مجھے بچا لیا۔ لیکن میرا بچہ مر چکا تھا۔ اُس کے قتل کے جرم میں مجھے عمر قید کی سزا ہو گئی۔ اس دوران تھانیدار، جج اور وکیل نے میرا جسم بوٹی بوٹی کیا۔ پھر جیلر نے اپنا حصہ لیا۔''

''میری دوست سارا سبین جو عورتوں کے حقوق کے لئے کام کر رہی ہے، تجھے کیسے نکال کے لائی؟''

''وہ ایک دن جیل میں وکیلوں کے جھرمٹ میں آئی اور مجھ سے کافی سوال جواب کر کے لکھتی گئی اور یہ کہہ کر گئی کہ وہ میرا کیس دوبارہ لڑے گی۔ پھر وہ میرے لئے پیرول کے آرڈر لے آئی۔ مجھے نہیں پتہ تھا پیرول کیا ہوتا ہے؟''

''مجھے پتہ ہے۔ پیرول میں سزا ختم نہیں ہوتی۔ مجرم کو کسی بھی جگہ لے جایا جا سکتا ہے۔''

''اس لئے وہ مجھے آپ کے پاس لے آئی ہے اور عدالت کو بتایا ہے کہ میں باقی سزا اس گھر میں کاٹوں گی۔''

''اب تم یہیں رہوگی اور سرونٹ کوارٹر میں رہوگی۔''

''بس اتنی سی بات کرنی تھی؟'' آنس بولے۔

''آپ اس ملک کے تاریخ دان ہیں تو آپ کو ایسی تاریخ بھی تو لکھنی چاہئے۔'' میں نے کہا اور پھر میں نے کہا۔ ''کہانی خود گھر چل کے آئی ہے۔ میں اُسے کیوں نکالوں ___ میں تو کہانی کو آسرا دوں گی۔''

''ہاں ہاں اسے اپنی گود میں پال پوس کے بڑا کرو۔ میں بھی تاریخ کے گھونسلے میں چوزوں کو اسی طرح پالتا رہا ہوں۔ اور ہاں یاد آیا ایک دن میرے پاس بھی تاریخ کا ایک کردار چل کے آیا تھا۔ وہ میں تمہیں دکھاتا ہوں۔ پہلے اسے کہو یہ جائے اور استاد دامن جس طرح کریلے گوشت بناتے تھے ویسے بنا کے لے آئے۔ نہیں تو استاد آ جائے گا اور وہ غصے کا بھی بہت سخت ہے۔''

میں نے اشارے سے سکینہ کو جانے کا کہا۔ وہ چلی گئی اور پھر آنس نے ایک کتاب کے اندر سے دو تصویریں نکالیں اور سامنے رکھ دیں۔

''دیکھو یہ دو آدمی ہیں یا ایک آدمی؟''

''یہ تو دو آدمی ہیں۔ ایک کوئی دہشت گرد طالبان میں سے ہے اور دوسرا کوئی آرٹسٹ ہے۔ خوبصورت نوجوان ہے۔ لگتا ہے ابھی ابھی امریکہ سے آیا ہے۔''

''ہاں تم نے ٹھیک کہا۔ مگر آج آرٹسٹ سے یاد آیا میرے پاس شاکر علی صاحب نے آنا تھا ___ ارے بھئی شاکر علی۔ نہیں پتہ۔''

''ہاں ہاں، پتہ ہے۔ میاں اعجاز الحسن، نیر علی دادا اور سلیمہ ہاشمی کا اُستاد، جانتی ہوں۔''

''جانتی ہو تو اُسے لے آؤ۔ وہ فرانس کو اپنے اندر لے کر پھرتا ہے۔ پاگل ہے۔ اکیلا رہتا ہے۔ وان گاگ، پکاسو، مونے، ڈالی، مستر ال اور پتہ نہیں کس کس کے ساتھ رات کو مکالمہ کرتا ہے۔ صبح ڈرائینگ روم میں کرسی پر سویا ہوا پایا جاتا ہے ___ ایسے ہی انتظار حسین بھی کرتا ہے۔ وہ مہا بھارت، بھگوت گیتا، رِگ وید، کافکا، میرامن، میر باقر علی اور چیخوف سے ساری رات باتیں کرتا ہے۔ مگر ظالم صبح اپنے بستر پر سویا ہوا ملتا ہے۔''

اب میں آنس کی اس لہر میں خود بھی بہنا چاہتی تھی۔ ہر لہر کچھ تو اچھال کر باہر لے آتی ہے۔ ایک کہانی لکھنے والی کو اور کیا چاہیے۔ میں نے ایسے ہی کہہ دیا۔ ''شاکر علی تو آج نہیں آئے۔''

''ہاں چھوڑو بے وفا آدمی ہے۔ ہاں صادقین اس وقت میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ وہ ظالم اپنے ساتھ امروہہ کو لے کر سادات کی عزت بچانے کے چکر میں ہے۔ یہ امروہہ والے پاگل تو نہیں ہیں۔ بھئی ہندوستان میں صرف امروہہ نہیں ہے اور بھی سادات کے علاقے ہیں اور پھر ایک تو امروہہ والوں نے جان ایلیا کو پیدا کر دیا۔ بھئی کیا اول جلول ہے۔ مجھے ملا تو فوراً میرے سامنے لیٹ گیا۔ کہا نہیں اٹھوں گا۔ مولا کی قسم جب تک آپ احمد فراز کو بُرا شاعر نہیں کہتے۔ میں نے کہا ہاں فراز واجبی سا شاعر ہے تو زقند بھر کر اٹھا اور درخت پر چڑھ گیا۔ اور کہا اب درخت سے تب اتروں گا جب تک تم احمد ندیم قاسمی کو گھٹیا شاعر نہیں کہو گے۔ میں نے وہ بھی کہہ دیا۔ تو موصوف اُتر تو آئے مگر پھر میرے کندھے پر سوار ہو گئے کہ فیض احمد فیض کو بھی اوسط درجے کا شاعر کہو۔ میں نے وہ بھی کہہ دیا۔ پھر کندھے سے اترے ضرور مگر گلے پڑ گئے کہ پیارے بھائی جب تک جمیل الدین عالی سے سارے ایوارڈ واپس نہ لو، میں تو گلے سے لٹکا ہوں۔ میں نے کہا یہ بھی ہو جائے گا لیکن پہلے تم یہ تو بتاؤ کہ جب تم نے اپنے بھائیوں رئیس امروہوی اور سید محمد تقی کو جمیل الدین عالی کے گھر سے نشے میں دھت ہو کر دو بجے رات کو فون کیا تھا اور اُن سے مکان کا قبضہ لینے کے لئے مارشل لاء کا فوجی افسر بن کر بات کی تھی تو کیا ہوا تھا؟''

''وہ تو ہم سے بھول ہوگئی۔ زبان کے جو میٹھے ہیں۔ ہم نے فون پر فوجی افسر بن کے کہہ دیا۔ بھائی جان ہم مارشل لاء کے افسر بول رہے ہیں تو آگے سے پتہ ہے کیا کہا۔ ابے او چوتیے۔ مجھے چوتیا سمجھتا ہے اور فون بند کر دیا۔'' ''تو پھر جان ایلیا تم نے خود کو برباد کیوں کر دیا؟ خود کو تباہ کر کے بھی تجھے ملال نہیں ہے۔''

''ارے بڑے بھیا ہم خالص شاعر ہیں۔ اندر سے برباد نہ ہوں تو بڑے بھائی شاعری نہیں ہوتی۔ وہ بھڑ بھونجیئے کی بھاڑ ہوئی ناں۔''

''آپ صادقین کی بات کر رہے تھے۔'' میں نے رُخ موڑنے کی کوشش کی۔

''ہاں تو وہسکی کی بوتل لے آؤ۔ جا کر پیش کرتا ہوں۔ صادقین ایسے تو مانے گا نہیں۔ عجیب انسان ہے اللہ نے اُسے انگلیاں نہیں دیں رنگوں کی آبشار کی دھاریں دی ہیں۔ ایک ایک ہاتھ سو سو دھاریں ہیں۔ ظالم اتنا باریک کام کرتا ہے کہ رنگوں کی کشیدہ کاری کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔''

''لیکن صادقین تو آج کل لکھنؤ گئے ہوئے ہیں میں نے کہیں پڑھا ہے۔''

''ہاں بھئی، اُس کی نعل جو امروہہ میں گڑی ہے۔ جاتا رہتا ہے لکھنؤ کے امام باڑے دیکھنے اور

دیواریں تھام کے گریہ کرتا ہے۔امام حسین علیہ السلام کا پُرسہ دیتا ہے۔سوز خوانوں کی منڈلی میں بیٹھ کر مرثیہ پڑھتا ہے۔سنتا ہے اور شامِ غریباں کے غروب ہوتے سورج کی لالی سے امامِ مظلوم علیہ السلام کا سرخ پرچم بناتا ہے اور اپنے ہر میورل اور اپنی ہر خطاطی میں اس پر چم کو بلند کر دیتا ہے۔''

''صادقین جیسا ایک اور مصور بھی تو ہے جو کربلا سے بچھڑا آخری سپاہی ہے۔جو انڈیا میں ہے۔'' میں نے ایسے ہی اشارہ دیا کہ ایم ایف حسین سے بھی تعلق رہا ہے——

''ہاں وہ گھوڑے بناتا ہے اور سارے گھوڑے امامِ مظلوم علیہ السلام کے مختصر سے لشکر سے بچھڑے ہوئے ہیں۔آج تک بچھڑے ہوئے ہیں۔امامِ مظلوم کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور وہ خود ننگے پاؤں ایک امام باڑے سے دوسرے امام باڑے میں ذاکروں کے بیان کی غلطیاں نکالتا پھرتا ہے۔ایک دن لاہور آنکلا تو مجھے کہنے لگا مجھے اندرون موچی گیٹ اور وہاں لے چلو جہاں سے محرم کا تعزیہ اور امام کا علم نکلتا ہے۔میں اُسے لے گیا۔مبارک حویلی گئے پھر کربلا گامے شاہ گئے۔ایم ایف حسین ننگے پاؤں تھے۔لوگ انہیں دیکھ کر رُک جاتے تھے۔ایک دو نے آ کر پوچھا۔ان کی اگر مسجد سے جوتیاں چوری ہوگئی ہیں تو ہم لا کر دیتے ہیں۔میں نے کہا نہیں یہ امامِ عالی مقام کے دربار میں ننگے پاؤں جاتے ہیں اور جہاں جہاں سے تعزیہ گذرتا ہے یہ ننگے پاؤں ہی جائیں گے کہ یہ کربلا سے بچھڑے آخری سپاہی ہیں۔''

میں نے یونہی پوچھ لیا۔''اور انتظار حسین کا کربلا سے کیا رشتہ تھا؟''

''اُن کا رشتہ کیا ہونا تھا وہ تو کربلا کو ساتھ لئے پھرتے تھے۔کربلا کو بُری طرح پکڑ رکھا تھا چھوڑتے ہی نہیں تھے۔جب چاہا کربلا برپا کر دی۔دن رات کربلا ان کے ساتھ رہتی تھی''——

اب میں نے دیکھا کہ بہت دیر پہلے انہوں نے دو تصویریں دکھائی تھیں۔ان کی کیا کہانی ہے تو میں نے دونوں تصویریں اُٹھا کر کہا۔''تو یہ دو مختلف آدمی ہیں؟''

''نہیں،یہ ایک ہی آدمی ہے۔یہی تو بتانا ہے۔''

''کیا یہ بہروپیا ہے؟''

''نہیں یہ ایک واردات ہے جو ہماری موجودہ تاریخ پر گذری ہے۔سنو گی؟''

''ہاں،سننا ہے مجھے۔''

''میں جب کوئٹہ کے سرینا ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا تو میرے میزبان ڈاکٹر بادینی میرے پاس آئے

اور بتایا کہ ایک نوجوان کو آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں کہ اس خطے کی تاریخ میں شاید یہ کردار آپ کے کام آئے۔''

میں چونکا کہ بلوچستان تو ہمیشہ سے ہمیں سرپرائز دیتا آیا ہے۔ ابھی تک نواب اکبر بگٹی کے قتل کو نہ کسی صحافی نے سمجھا ہے نہ لکھا ہے نہ کسی مؤرخ نے اس پر توجہ دی ہے کہ ایچی سن کالج لاہور کا تعلیم یافتہ، انتہائی سلجھا ہوا انسان جو کتابوں سے رغبت رکھتا ہو، کھیلوں کا شوق رکھتا ہو، باذوق ایسا کہ لباس کے چناؤ میں جمالیات کا خیال رکھتا ہو۔ کبھی ہیٹ پہنتا ہے، کبھی بلوچی پگڑی، کبھی مقامی ٹوپی، کبھی جدید کبھی قدیم، ایسے سیاست دان کا قتل یا شہادت۔ اس کا فیصلہ تاریخ کو کرنا ہے اور تاریخ میرے بس میں نہیں ہے۔ وقت کے قابو میں ہوتی ہے۔''

''ہاں تو آپ نواب اکبر بگٹی کو کیسے دیکھتے ہیں؟'' میں نے لقمہ دیا۔

''وہ سخت بلوچ تھا مگر غدار نہیں تھا۔ فوج سے تو کسی کو بھی ناراضگی ہوسکتی ہے۔ اس کا مطلب ہے آپ زمینی ہیروز کو ماردیں۔ سندھ کے ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی چڑھا دیں اور بلوچستان کے نواب اکبر بگٹی کو خشک پہاڑ کی چٹانوں میں زندہ چُن دیں — میرے نزدیک بھٹو اور بگٹی دونوں کو قتل کیا گیا ہے'' —

اب ایک مؤرخ جب بات کر رہا ہو تو کہانی کار کا کیا کام۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کہانی کار اُسے ایک بات پہ روک سکتا ہے۔ وہ ہے انسانی نقطۂ نظر — تاریخ بے رحم ہے مگر کہانی کار اتنا بے رحم نہیں ہوتا۔ میں نے بات کا رُخ پھر اُن دو تصویروں کی طرف موڑ دیا کہ آپ کے پاس ڈاکٹر بادینی کسی کو لے کر آئے۔

''ہاں، وہ ایک نوجوان تھا۔ جس کی دو تصویریں تم نے دیکھی ہیں۔''

''وہ ایک نوجوان کی دو تصویریں ہیں؟''

''ہاں، یہی تو کہانی ہے کہ ایک نوجوان ڈاکٹر بادینی اپنے ساتھ لایا جس کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے اور وہ طالبان کے لباس اور حلیے میں تھا — وہ سامنے آ کر بیٹھا اور ڈاکٹر بادینی نے کہا۔ یہ لڑکا ایک مذہبی مدرسے میں داخل ہوا اور اس نے وہاں سے جو تربیت لی وہ یہ تھی کہ جو استاد کہے اس پر سوال نہیں کرنا۔ جو مرشد کہے اس کو شک سے نہیں دیکھنا۔ یہ لڑکا اپنے والد کے مدرسے میں تھا۔ جہاں سے بارہ تیرہ سال کے لڑکے افغانستان طالبان کی دوسری تربیت کے لئے بھیجے جاتے تھے۔ اس لڑکے کا نام کلیم اللہ ہے۔ اس کے باپ نے کئی گھروں کے بچوں کو جہاد کی تربیت کے بعد افغانستان بھیجا۔ جو کہاں گئے کسی کو معلوم نہیں بس

والدین کو اتنا بتایا گیا کہ وہ آپ کے لئے جنت کمانے گئے ہیں۔ اس زمین پر ان کے لئے دوزخ تھی۔ سو انہوں نے جنت کا وعدہ قبول کر لیا۔ کلیم اللہ کے باپ نے تھوڑی دانائی دکھائی کہ اپنے بیٹے کو خودکش بمبار بننے سے بچالیا اور سولہ سال کی عمر میں طالبان کے سپرد کیا۔ یہ وہ عمر ہے جس میں خودکش بمبار تیار نہیں کئے جاتے۔ وہ طالبان کے دیگر کاموں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ دوسری ڈیوٹیوں میں اغوا کنندگان کی دیکھ بھال، امریکی فوجیوں کو قتل کرنے اور اُن کو ایذا پہنچانے کا کام، اغوا برائے تاوان کے لوگوں کا پہرہ وغیرہ ایسے بے شمار کام تھے جن کے لئے نوجوانوں کی ضرورت ہوتی تھی۔''

''آپ کو یہ ساری باتیں یاد ہیں۔'' میں حیران تھی کہ اب آنس کی یاد بے حد واضح تھی۔

''ہاں، یہ سب کلیم اللہ نے مجھے بتایا تھا اور پھر میں نے ہی اُسے نیشنل کالج آف آرٹس میں داخل کرایا۔ اور جو دوسری تصویر تم نے دیکھی ہے جس میں وہ ماڈرن فن کار دکھائی دے رہا ہے۔ یہ این سی اے کی ہے۔ انہی بالوں کو اس نے تراش خراش کے پیچھے پونی بنائی، داڑھی کو تراش کر ماڈرن کیا اور اس کا خوبصورت چہرہ ظاہر ہو گیا۔''

''یہ تو عجیب وغریب تجربہ ہے۔ آپ نے مجھے نہیں بتایا؟'' میں نے گِلہ کیا۔

''تم اپنی کہانی کے کردار بتاتی ہو، یہ تاریخ کے کردار ہیں۔ یہ کہانی کار کو نہیں بتائے جا سکتے ورنہ کہانی کار تاریخ سے یہ کردار چُرا کر اپنی ہانڈی پکاتا ہے۔ ایسا قرۃ العین حیدر نے بھی کیا ہے، انتظار حسین نے بھی کیا ہے۔''

میں سمجھ گئی کہ آنس اپنی تاریخ کے لئے خود غرض ہیں۔ ہونا بھی چاہئے۔ اس لئے میں نے کچھ نہیں کہا، بس اتنا کہا۔ ''ہاں ٹھیک ہے تو کلیم اللہ کی واردات کیا ہے جو آپ کے پاس ہے؟''

''اُس کے باپ نے کئی گھروں کے چراغ گُل کئے ہوں گے اُس کی Schindler's List معلوم نہیں کتنی بڑی ہوگی؟''

''میں نے فلم 'شنڈلرز لسٹ' دیکھی تھی۔ طالبان کے حوالے سے اس کا کیا مطلب ہے؟''

''تم کہانی کار ہو۔ نہیں معلوم میں کیا کہہ رہا ہوں۔ جن یہودیوں کو گیس چیمبرز میں نازی جرمنی نے قتل کیا تھا اُن کے نام شنڈلرز لسٹ میں شامل تھے اور میں نے برلن میں اُن کی یاد میں قائم کئے گئے میوزیم پر یہ سب نام دیکھے تھے۔ افغانستان میں طالبان نے جن معصوم نوجوانوں سے خودکش بمبار کا کام لیا وہ بھی کسی

شنڈلرز لسٹ میں آنے چاہئیں؟ ـــــ جو تاریک راہوں میں مارے گئے۔"

"جتنے بمبار خودکش حملوں میں مارے گئے وہ اُن یہودیوں جیسے ہیں جن کو بے گناہ شنڈلرز لسٹ میں مارا گیا۔" میں نے بات کو مکمل کیا۔

"قیام پاکستان کے وقت فسادات میں ہندو، سکھ اور مسلمان لاکھوں کی تعداد میں مارے گئے۔ افسانہ نگاروں نے لکھا کہ ان کے مذہب نہ دیکھو یہ کہو کہ لاکھوں انسان مارے گئے۔"

"تو اب آپ تو کلیم اللہ کی کہانی سنا رہے تھے۔" میں نے پھر آنس کو یاد پر فوکس کیا ـــــ

"ہاں وہ کلیم اللہ نے بتایا کہ اُس کے باپ نے اُسے افغانستان بھیج دیا اور پھر جو ہوا وہ اُس نے یوں بتایا کہ اس کو دو تین علاقوں میں آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جایا گیا۔ اُس کی کئی طرح سے آزمائش کی گئی اور خفیہ طور پر کئی سطحوں پر ان کے لوگ ہمارے زیر تربیت خودکش بمباروں اور ان کی معاونت کرنے والے بڑے لڑکوں کی نگرانی کر رہے تھے جس کا ہمیں پتہ نہیں تھا۔ ہم کوئی بھی غلطی کرتے تو فوراً مارے جا سکتے تھے۔ پنجاب کے ایک گاؤں آدم واہن سے ایک لڑکا وہاں موجود تھا۔ ہم لڑکوں کی آپس میں بات نہیں کرائی جاتی تھی۔ جب ہم اکٹھے ہوتے تو ہم پر پہرہ لگا ہوتا تھا ہم کھل کر بات نہیں کر سکتے تھے۔ اس لڑکے کو جب بھی دیکھا اُس کو خوفزدہ اور اداس دیکھا۔ ایک دن رائفل چلنے کی آواز آئی تو پتہ چلا وہ مارا گیا ہے۔ وہ سمجھا کہ بھاگنے کے لئے دروازہ کھلا ہے۔ یہ صبح سے پہلے کا وقت تھا۔ وہ سمجھا میں آسانی سے نکل جاؤں گا۔ بس مارا گیا ـــــ اس کی لاش بھی وہیں دبا دی گئی۔ نہ جنازہ اٹھا نہ نماز ہوئی۔ وہاں یہی ہوتا تھا۔ میں چونکہ مدرسے میں اپنے والد کے ساتھ پروان چڑھا تھا اس لئے میں بے خوف تھا اور میں اس ماحول سے اجنبی نہیں تھا۔ اب ایک مرحلہ آیا" ـــــ

"آپ کو یہ ساری باتیں یاد ہیں؟" میں آنس کی ٹریٹ منٹ بھی کر رہی تھی۔

"کیا مطلب؟ میرے اندر کبھی کبھی ہر شے صاف دکھائی دیتی ہے۔ ہاں میں یہ سب باتیں جانتا ہوں۔"

"تو پھر کلیم اللہ نے کیا کہا۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا ـــــ"

"ہاں وہ......"

"وہ کہہ رہا تھا کہ وہ اس ماحول میں اب سب جان گیا تھا اور ایک مرحلہ آیا۔"

''ہاں ایک مرحلہ آیا کہ مجھے ایک مشن سونپا گیا۔ ایک لڑکے کو خودکش حملے کے لئے تیار کیا گیا۔ مجھ سے دور رکھا گیا۔ مجھے یہ بتایا گیا کہ تم اس کے ساتھ ایک جلوس میں جاؤ گے۔ اور اس نے خود کو اُڑانا ہے۔ اسے جنت دکھائی دے گی اور یہ خود کو اُڑا دے گا۔ اگر یہ ایسا نہ کرے تو جو ریموٹ تمہارے پاس ہے تم اُسے دبا دینا یہ خود بخود اُڑ جائے گا۔ تم واپس آ جانا۔ میں یہ تربیت لے چکا تھا۔ وہ مجھ سے عمر میں چھوٹا تھا۔ وہ جگہ پر پہنچا اور جب اُس نے دیکھا کہ ایک جلوس ہے۔ بے شمار لوگ ہیں۔ وہ غریب بھول گیا کہ اُسے کیا کرنا ہے یا وہ اُس ماحول سے واقف نہیں تھا اور حیرت زدہ ہو گیا تو مجھے وہ ریموٹ دبانا پڑا۔ پھر جو ہوا وہ میں آج یاد کرتا ہوں کہ میں نے کتنے لوگوں کو مار دیا۔۔۔۔۔

اب میرا امتحان ہو چکا تھا۔ طالبان مجھ پر اعتماد کر رہے تھے اور مجھے اگلے عہدے پر لگا دیا۔ اب یہ عہدہ بہت اعتبار والا تھا۔ مجھے آنکھوں پر پٹی باندھ کے ایسی جگہ لایا گیا جہاں مختلف کمرے تھے۔ ایک بڑا دروازہ تھا اور پیچھے کچھ پہاڑ تھے۔ میں بلوچستان کو جانتا تھا وہاں بھی یہی ماحول ہوتا تھا۔ میرے لئے کوئی نیا تجربہ نہیں تھا۔ تو میں اطمینان سے وہاں آ گیا تو مجھے بتایا گیا کہ یہاں وہ لوگ رکھے جاتے ہیں جنہیں تاوان کے لئے یا حکومتوں کو بلیک میل کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔۔۔۔۔ جہاں مجھے رکھا گیا وہاں ایک عورت بلوچستان کے کسی مقام سے لائی گئی اور دو لڑکے پندرہ اور سولہ سال کے وہاں رکھے گئے۔ عورت تیس سال کے آس پاس کی تھی۔ میں نے اُسے ایک بار دیکھا تو مجھے اپنی جوانی کی سرحد نے پکارا تو میں خود ہی میں خاموش ہو گیا۔ وہاں صرف حکم ملتا تھا۔ بات کرنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ اس خاموشی میں کبھی کبھی نیچے سُروں میں رونے کی آوازیں آتی تھیں۔ ایک دن اپنے ایک چھوٹے لیڈر سے اس عورت کی بات میں نے سن لی۔ جس سے پتہ چلا وہ عورت کسی این جی او کے لئے بلوچستان میں کام کر رہی تھی۔ این جی او کا تعلق امریکہ سے تھا۔ اس عورت کے بدلے تاوان لینا تھا اور وہ دو لڑکے کسی بڑے افسر کے بیٹے تھے۔ جو رات بھر روتے تھے۔ ایک دن میں اس عورت کو کھانا دینے گیا تو دیکھا اس کی شلوار خون سے بھری ہوئی تھی خون فرش کی چٹائی پر گرا ہوا تھا۔ میں ڈر گیا کہ اس نے کہیں خودکشی کی کوشش نہ کی ہو۔ حالانکہ کمرے میں کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جس سے کوئی خود کو ہلاک کر سکے۔ اس عورت نے کہا۔ بھائی، کہیں سے تولیہ لا دو۔ یہ عورت ہونے کی سزا ہے۔ مجھے اپنے آپ سے بدبو آ رہی ہے۔ مجھے یہ مہینے والی صفائی کرنی ہے۔ میں گیا اور کچھ کپڑے لے کر آیا اور اُسے دیئے۔ اس نے پھر کہا۔ کہیں سے مجھے عورت کی شلوار لا کر دو۔ میں اسے تبدیل کرنا چاہتی ہوں۔ تب ہمارے لیڈر کو

بات یاد آئی کہ اس بات کا خیال رکھنا چاہئے تھا ـــــ اس عورت نے ایک دن ہمارے لیڈر سے کاغذ قلم مانگا۔ انہوں نے کہا۔ ہم دے دیں گے۔ مگر جو تم لکھو گی ہم پڑھیں گے۔ اس نے کہا ٹھیک ہے اور اسے کاپی قلم دے دیا۔ اب وہ تین دنوں میں کاپی ختم کر دیتی تھی۔ دوسری کاپی دے دی جاتی تھی۔ اس نے جب چھ سات کاپیاں لکھ لیں تو ایک دن میں نے موقع پا کر ایک کاپی اٹھا کر پڑھنے کی کوشش کی۔ تو وہ مجھے عجیب سی شے لگی سمجھ نہ آئی۔ بعد میں پتہ چلا وہ شاعری کر رہی تھی۔

جب میں اُن دونوں بھائیوں کے پاس جاتا تو وہ مجھے اس طرح دیکھتے جیسے کہہ رہے ہوں کسی طرح یہاں سے نکالنے کی ترکیب بتائیں۔ انہیں پنجاب سے اٹھایا گیا تھا۔ میں پنجاب کو بالکل نہیں جانتا تھا۔ میرے دماغ میں بات آئی کہ میں ان کو بلوچستان کے ذریعے راستہ بتا سکتا ہوں لیکن مجھے اپنے اوپر پہرے کا علم تھا اور میں ابھی تک اپنے والد کے حکم پر چل رہا تھا۔ کہ ایک دن مجھے حکم ملا کہ تم نے تین امریکی سپاہیوں کو قتل کرنا ہے۔ شاید یہ میری آزمائش تھی۔ تین امریکی فوجیوں کو لایا گیا۔ ان کے کپڑے اتار دیئے گئے اور مجھے کہا گیا کہ ان کے جنسی اعضاء چھری سے کاٹو۔ ان کی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی۔ اب اگر میرے ہاتھ کانپتے تو اُسے ہر طرح سے دیکھا جا رہا تھا۔ مجھے ایسا کرنا پڑا۔ اس وقت طالبان کے سب رہنما موجود تھے۔ وہ کہہ رہے تھے ہم جہاد کر رہے ہیں اور جہاد میں اللہ اکبر کہنا ضروری ہوتا ہے اس لئے ہر قدم پر اللہ اکبر اونچی آواز میں بولو۔ اب حکم ہوا اس کے بازو کاٹو۔ مجھے یہ کرنا پڑا۔ پھر حکم ہوا اس کی ٹانگیں کاٹو۔ پھر حکم ہوا اس کا جسم چیر دو۔ اس کے پھیپھڑے نکال کے باہر پھینکو۔ اور آخر میں اس کی گردن کاٹو ـــــ ہر حکم پر اللہ اکبر کہنا پڑتا تھا ـــــ یہ سب تین بار ہوا تو میں گر پڑا۔ مجھے قے آئی اور معلوم نہیں میں بے ہوش ہو گیا۔ مجھے معلوم نہیں کیا ہوا۔ مجھے تیز بخار ہو گیا جو اُترنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ اس پر مجھے پتہ چلا کہ میں طالبان کے لئے صحیح نہیں ہوں۔ اس پر انہوں نے میرے باپ سے بات کی تو باپ نے کہا اسے اپنا مال سمجھو۔ اگر یہ کام نہیں آتا تو اسے کاٹ کے فارغ کرو۔"

"آپ کو کلیم اللہ کی باتیں یاد ہیں ان میں کہیں آپ کا تخیل بھی شامل ہو گیا ہے۔" میں نے آنس کو جان بوجھ کے ٹریک سے ہٹانے کے لئے ایسا پوچھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کبھی کبھی ان کے دھیان کی لہر یا رَو کو توڑ کے دیکھیں کہ دوبارہ وہاں آتے ہیں یا کہیں اور نکل جاتے ہیں۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں میں بول رہا ہوں یا کلیم اللہ۔ مگر باتیں تو اسی طرح ہیں۔"

''ٹھیک ہے۔ پھر کیا ہوا؟''

''پھر کلیم اللہ نے بتایا کہ اُسے انہوں نے دوبارہ آزمانے کے لئے ایک موقع دیا۔ اور وہ سمجھ گیا کہ غلطی کی تو اُسے بھی بغیر نمازِ جنازہ مٹی کا رزق بننا پڑے گا۔ اس دوران ان دولڑکوں کی ڈیوٹی پر اُسے لگا دیا۔ میں نے سوچا مجھے بولنا نہیں سننا ہے۔ لیکن وہ دونوں لڑکے نہیں جانتے تھے کہ طالبان کی اصل طاقت جدید ٹیکنالوجی تھی۔ بڑے بڑے آئی ٹی سپیشلسٹ اُن کے ساتھ تھے۔ اور وہ جدید ترین صلاحیت کے ساتھ افغانستان اور پاکستان کے پہاڑی علاقوں کی مکمل خبریں رکھتے تھے۔ اس کا پاکستان کی افواج کو بھی علم تھا۔ اس لئے وہ دونوں لڑکے جو بولتے تھے وہ ریکارڈ ہو جاتا تھا ـــــ اور اُس کے حساب سے طالبان اُن کے والدین اور حکومتِ پاکستان سے معاملات طے کر رہے تھے۔ مجھے اس کی خبر نہیں تھی۔ ایسے میں معلوم ہوا کہ مجھے ایک ایسی فیملی کی ڈیوٹی پر لگایا گیا ہے جو یورپ سے افغانستان میں میڈیا کی کوریج کے لئے آئی ہوئی تھی۔ اور طالبان نے انہیں اغوا کر کے وہاں ایک کمرے میں رکھا۔ دو چھوٹے بچے دونوں دودھ پیتے، ایک ڈیڑھ سال کا دوسرا گود میں۔ میرے لئے یہ ڈیوٹی کہ ان کی دیکھ بھال کرنی ہے اور بولنا نہیں۔ اصل سزا یہی تھی کہ بولنا نہیں ہے۔ میں اُن کو ناشتہ، کھانا، چائے وغیرہ دینے کے لئے جاتا رہتا تھا۔ کبھی یہ بھی دیکھا کہ دونوں میاں بیوی Kissing کر رہے ہوتے تھے۔ مگر وہ طالبان سے ذرا بھی خوفزدہ نہیں تھے۔ اس لئے کہ پوری فیملی ساتھ تھی۔ اس بات کا نفسیاتی مطالعہ ضروری ہے کہ اگر خاندان ایک جگہ خطرے میں ہو تو اُسے کسی بات کی فکر نہیں ہوتی کہ اگر ڈوبے تو سب ڈوبیں گے۔ اس لئے باقی بچ جانے والوں کا دُکھ تو لے کر نہیں جائیں گے۔ اس لئے میرے لئے اتنے مختلف اغوا ہونے والوں کے معاملات کو سمجھنا مشکل تھا۔

ایک دن معلوم ہوا۔ کسی بڑے آدمی کا بیٹا وہاں لایا گیا ہے۔ یہ بہت بڑی خبر تھی۔ یوں معلوم پڑا کہ کسی صوبے کے گورنر کا بیٹا ہے۔ لاہور کے اندر سے اٹھایا گیا ہے۔ اب وہاں زبردست پہرہ لگایا گیا اور ایک بات پر سب خوش تھے کہ اب یہاں ڈرون حملہ کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ میری ڈیوٹی بدلتی رہتی تھی۔ اس لئے کہ کسی کی ڈیوٹی مستقل نہیں تھی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ کوئی مستقل پلاننگ نہ ہو سکے۔

مجھے امریکی فیملی سے ہٹا کر اُس نئے شکار پر لگایا گیا۔ جو گورنر کا بیٹا لگتا تھا۔ مگر ہمیں یہ بات اُڑتی اڑتی معلوم ہوئی تھی، بتائی نہیں جاتی تھی ـــــ اور پھر وہاں کئی زبانیں گردش کرتی تھیں۔ اردو، انگریزی، پشتو، فارسی، پنجابی، بلوچی۔ میں نے اُسے ایک صبح ناشتہ دیا۔ ناشتہ کیا تھا۔ ٹھنڈی چائے اور ایک ٹوسٹ۔ وہ شاید

رات کا بجوکا تھا وہ ایک لمحے میں اپنے اندر انڈیل گیا۔ اُسے بہت تکلیف دی جانے لگی تا کہ وہ اپنے گھر بات کرتے ہوئے روتے ہوئے اور بے حد اذیت میں بات کرے۔ ایک بار یہ ڈیوٹی مجھے دی گئی کہ اس لڑکے کو اس کا اپنا پیشاب پلانا ہے۔ میرے لئے یہ بے حد مشکل کام تھا۔ میں نے کیا اور پھر اُسے اُلٹی آئی اور وہ روتے روتے بے ہوش ہو گیا۔

ڈیوٹی اچانک بدل دی جاتی تھی۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ مختلف جگہوں پر کیا چل رہا ہے۔ کبھی اونچی آواز میں تلاوت کی آوازیں آتیں تو کبھی رونے کی تو کبھی چیخنے کی۔ کبھی لگتا کوئی تقریر کر رہا ہے۔ یہ ایک پاگل خانہ تھا۔ باہر کے حالات کی کسی کو خبر نہیں تھی۔ ہمارے لیڈر بھی بدلتے رہتے تھے۔ کسی کو کسی پر اعتبار نہیں تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ لیڈروں کے لیڈر ہیں۔ کون ڈور ہلا رہا ہے کم سے کم مجھے خبر نہیں تھی۔ ہر روز نیا لیڈر نیا حکم لگاتا تھا۔ اس طرح تھا کہ کوئی شطرنج ہے جسے ہر روز نئے انداز سے کھیلا جاتا ہے۔ ایک رات میں نے دیکھا کہ میں رات کی ڈیوٹی پر جاگ رہا تھا کہ این جی او والی خاتون نے ایک کاغذ اندر سے پھینکا۔ میں اردو پڑھ سکتا تھا۔ میں نے پڑھا تو اُس میں لکھا تھا۔ اگر تم چاہو تو یہ رقعہ اپنے لیڈر کو دے دو۔ اس لئے کہ میں اُس سے نہیں ڈرتی اگر تم چاہو تو میرے ساتھ بھاگ بھی سکتے ہو کہ میں بلوچستان کے سارے علاقے چمن بارڈر سے جانتی ہوں۔ اب میرے اندر بھاگنے اور کسی کو بھگانے کے لئے ایک کشمکش شروع ہو گئی اور میں نے جلد ہی رات کے دو بجے اس مسئلے کو حل کر لیا۔ میں اُن دو لڑکوں کو ساتھ لے کر نکلنا چاہتا تھا۔ جن کے متعلق میرا خیال تھا کہ ان کا باپ اُن کے لئے تاوان نہیں دے سکتا۔ اس لئے اُن کو ساتھ لے جانے کے لئے میں نے سوچنا شروع کر دیا ــــــ''

مجھے معلوم تھا یہ ''میں'' وہ لڑکا ہے جس نے آنس کو اپنی کہانی سنائی۔ اب میں کیا کروں کہانی ہی کہانی کی سہیلی ہوتی ہے اور کئی کہانیاں ایک ساتھ پلتی رہتی ہیں اور کہانی اپنی دوسری کہانی کو سہیلی بنا کر خوش رہتی ہے۔ جہاں بھی دنیا میں کہانیاں لکھی گئی ہیں وہاں کہانیوں نے یہ رشتے ایسے نبھائے ہیں جیسے دو سہیلیاں یہ رشتہ نبھاتی ہیں۔ اس طرح میں نے کہانیوں کو ایسے پالنا شروع کیا جیسے کوئی بلیاں پالتا ہے۔ میں نے آنس کو نہیں روکا تو وہ کہہ رہے تھے۔

''پھر میں نے اُن دو لڑکوں اور این جی او کی لڑکی کو سامنے رکھتے ہوئے ایک ٹائم ٹیبل بنانا شروع کیا کہ کب کب کس کس کی ڈیوٹی ہوتی ہے اور نماز کے اوقات میں کیا حالات ہوتے ہیں۔ نماز کے وقت میں بھی

ہم پر پہرہ مسلسل ہوتا تھا۔ میں نے ہر شے کا ریکارڈ رکھنا شروع کر دیا اور ساتھ میں یہ کہ جا کر پہلا قتل اپنے مولوی باپ کا کرنا ہے جس نے مجھے ان کے حوالے کیا ــــــ اور نہیں جانتا تھا کہ اُس نے بیٹے پر کیا ظلم کیا ہے ــــــ اب میں آنکھوں آنکھوں میں اُس این جی او کی لڑکی سے رابطے میں رہنے لگا جس نے رقعہ بھیجا تھا۔ اس لئے کہ نہ ہم بات کر سکتے تھے نہ کوئی اور حرکت کر سکتے تھے۔ ہر شے انہوں نے کسی نہ کسی آئی ٹی یا کیمرے کے ذریعے کنٹرول کر رکھی تھی۔ یہ جو آنکھوں کا رشتہ تھا یہ پکڑا نہیں جا سکتا تھا۔ اس لئے یہ زبان کام کرنے لگی۔ اور پھر میں نے یہ زبان اُن دو لڑکوں کے ساتھ بھی بنالی جو بہت ڈرے ہوئے تھے اور ان کا تاداں کبھی نہیں آ سکتا تھا۔ اب ہم چار لوگوں کو یہاں سے نکل کے بلوچستان بھاگنا تھا اور میں ہی اس منصوبے کا ماسٹر مائنڈ تھا اور میں ہی ہو سکتا تھا کیونکہ میں طالبان کا کارکن تھا۔ یہ سب کچھ مجھے ہی پلان کرنا تھا۔ یہ سب کچھ نگاہوں کی زبان میں ہو رہا تھا۔ بلکہ جسم کی زبان بھی ہوتی ہے۔ ہم جسم کی زبان استعمال نہیں کر رہے تھے کہ اُس کے پکڑے جانے کا امکان تھا۔ سب سے پہلے میں نے دھیان میں ایک نقشہ بنایا کہ کون سا راستہ نکل کے کدھر جاتا ہے۔ رات کا کون سا وقت ہوگا جب آئی ٹی کے تمام سگنلز کمزور ہوں گے یا آپریٹ نہیں کر رہے ہوں گے۔ اس پر مجھے ایک ہفتہ لگا تو میں ساری بات سمجھ گیا۔ نیند کا بھی ایک وقت ہوتا ہے اور کبھی کبھی وقت بھی آپ کا ساتھ دے رہا ہوتا ہے تو ایسا کچھ ہوا کہ اچانک ایک لیڈر جو اُن کی نظر میں بڑا تھا۔ پاکستانی فوج کی کارروائی میں مارا گیا تو سب نے اُس شام اپنی کوئی میٹنگ بلائی جس کا نچلی سطح پر کسی کو پتہ نہیں تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ وہ لمحہ ہے جب میں کوئی کام کر سکتا ہوں۔ میں نے اُس کمپاؤنڈ میں دو لڑکوں، ایک این جی او کی خاتون اور خود کو بھاگنے کے لئے جو منصوبہ بنایا اُس میں غیر ملکی فیملی شامل نہیں تھی کیونکہ وہ ہائی پروفائل کیس ہونے کی وجہ سے الگ رکھا ہوا تھا۔ نہ ہی کسی گورنر یا وزیر اعظم کے بیٹے وہاں موجود تھے۔ اس لئے میرا سارا انحصار میرے سمیت چار لوگوں پر تھا۔ اب مجھے اپنی یادداشت کو سمجھنا تھا کہ میں کس علاقے میں ہوں۔ اس کے راستوں کا سلسلہ کن راستوں سے جُڑا ہوا ہے؟ کسی اندھے سے کہیں کہ وہ راستہ تلاش کرلے۔ یہ ناممکن ہوتا ہے۔ میری آنکھوں پر پٹی باندھ کے یہاں لایا گیا تھا۔ وہ پٹی تو ابھی تک بندھی تھی۔''

آنس جب یہاں تک پہنچے تو میں نے محسوس کر لیا کہ یہ سارا بیان اُس لڑکے کا نہیں ہے۔ اب اس میں آنس کی اپنی سوچ اور زاویہ بھی شامل ہو چکا ہے۔ مگر میں سننا چاہتی تھی کہ آنس کس Stream of Consciousness میں رہ رہے ہیں۔ وہ جس روانی سے سارے واقعات کو منظم طریقے سے لے کر جا

رہے تھے۔ وہ ان کے اندر کی کوئی کیفیت تھی کہ مجھے حیران کر رہی تھی۔ میں نے کیوں روکنا تھا کہ میں یہ مسلسل سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''پھر بھی میں اس پٹی کو اتارنے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ اندازہ نہیں تھا ہم کہاں ہو سکتے ہیں۔ میں نے حساب لگایا کہ جب مجھے چمن بارڈر سے آگے لے جایا گیا تو کتنے گھنٹے لگے اور وہ فاصلہ کس سمت میں تھا۔ بہت دماغ لگایا اب یہ سارا سفر اندھیرے کا سفر تھا۔ میں نے سارے نقشے بنائے اور یہ سب کام دماغ میں ہوا کہ کاغذ تو ہماری موت تھی۔ کاغذ نہ وہاں تھا نہ وہ ہماری حفاظت کر سکتا تھا۔ پہلی بار کاغذ انسان کے وجود کا دشمن قرار پایا ـــــ اب میں نے یہ سوچا کہ کب ہم چار لوگ کس وقت نکل سکتے ہیں۔ ایسے میں سارے حساب کتاب کے بعد رات کے چار بج کر بارہ منٹ کا نتیجہ نکلا۔ یہ وہ وقت تھا جب سب کو نیند کا ایک غلبہ آتا ہے اور نکلنے کے لئے جان کی قربانی کا تجربہ تو دھیان میں رکھنا ہی پڑتا ہے۔ سو یہ ہوا کہ میں نے دو لڑکوں اور این جی او کی خاتون کو نکالا اور میں نے انہیں بتا دیا کہ موت کو سر پر کفن کی طرح باندھ لو کہ نہ میں راستہ جانتا ہوں نہ میں کسی بھی سمت کا تعین کر سکتا ہوں۔ ہم چار لوگ نکلے۔ مگر ایک ایسے دروازے سے جہاں مسلح گارڈ بیٹھتا تھا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں سے ہم نکل سکتے تھے۔ وہ اُسی وقت پر نیند کے ہاتھوں بے بس ہو جاتا تھا۔ لیکن یہاں بھی ایک پہلو تھا کہ مجھے معلوم تھا سی ٹی وی کیمرے یہاں نہیں تھے۔ اس لئے کہ یہاں سب لوگ کئی طرح کی آزمائشوں کے بعد لگائے جاتے تھے۔ اب میں نے یہ کیا کہ این جی او کی لڑکی کو افغانی برقعہ اوڑھا دیا جو اُس کے پاس تھا۔ میرا حلیہ طالبان کا تھا اور وہ دونوں لڑکے بھی اونچی شلواریں سر پر صافہ اور داڑھی مونچھ نکلتی ہوئی تھی۔ اس لئے ہم جہاں سے بھی گذرے کسی کو شک نہ ہوا کہ ہم فرار ہو رہے ہیں۔ ہم اندھیرے میں زیادہ سے زیادہ چلنا چاہتے تھے کہ روشنی سے پہلے ایک ایسی جگہ پہنچ جائیں جہاں سے ہمیں کوئی کنارا دکھائی دے جائے۔ ہم بے دھیان جو راستہ کسی سمت جاتا دکھائی دیتا اُس پر چل پڑتے۔ اب اس میں یہ بھی خطرہ تھا کہ ہم کہیں دائرے میں سفر کرتے ہوئے واپس اُسی جگہ نہ پہنچ جائیں جہاں سے چلے تھے۔ مگر یہ تو اب ہونا ہی تھا کہ قسمت میں کیا لکھا ہے۔

ایک بات کہیں پڑھی تھی کہ کچے راستے حکومتیں نہیں بناتیں لوگ بناتے ہیں۔ جو آپ کو غلط مقام تک نہیں لے جاتے۔ لوگوں کے پاؤں ہمیشہ منزل کی طرف جاتے ہیں۔ اب اس بنیاد پر ہم کچے راستوں پر چلتے جا رہے تھے۔ معلوم نہیں یہ راستے محمود غزنوی کے زمانے سے بنے تھے، غوری کے زمانے سے، شیر شاہ

سوری کے زمانے سے یا ابدالی کے زمانے سے کہ یہ سب انہی راستوں پہ چل کر ہندوستان پہنچے تھے۔ اب راستے سے راستہ جڑا ہوا تھا تو یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ دوراہا یا سہ راہا میں سے کسی ایک راہ کو منتخب کرنے کا کیا طریقہ ہونا چاہئے۔ یہاں بھی عقل کی جگہ فوری فیصلہ دل نے کرنا تھا۔ سو ہم کرتے گئے۔ جب موت کا خوف مٹ جاتا ہے تو پھر زندگی کی طاقت آپ میں کئی گنا زیادہ ہو جاتی ہے۔ ہمارے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا کہ کسی میں کسی قسم کی نہ گھبراہٹ تھی نہ خوف بلکہ ایک آزادی کا جھونکا تھا جو ہمیں اُڑائے لے جا رہا تھا۔ معلوم نہیں ہم کب تک اڑتے چلے گئے۔ پو پھٹتے ہوئے شاید ہم پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ مشرق پہ روشنی کی پھوار سی محسوس ہوئی تو معلوم ہوا مشرق کدھر ہے اور مغرب کدھر ہے۔ اب کچھ اندازہ ہو گیا کہ ہم کس سمت کو سفر کر رہے ہیں۔ پتہ چلا کہ ہم ٹھیک جا رہے ہیں۔ صدیوں کے قدم غلط سمت میں نہیں اُٹھتے۔

اب روشنی آہستہ آہستہ آسمان پر پھیل رہی تھی۔ کچھ کھیت تھے۔ کچھ ویران جگہ تھی۔ کچھ مکان تھے۔ کچھ درخت تھے۔ کچھ گلِ لالہ کے کھیت تھے جہاں خشخاش پرورش پاتی ہے۔ اس کھیت کی خوبصورتی دنیا میں اگر کسی کے مقابل ہے تو ہالینڈ میں ٹیولپ اُس کے برابر آتا ہے۔ معلوم ہوا کہ گل لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن کہ علامہ اقبال اس پھول کا عاشق تھا۔ اس خشخاش سے جو کچھ بنتا ہے اُس سے علامہ صاحب کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ کہ علامہ صاحب کا تعلق کسی انگریزی محلول سے قائم کرنے کی کوشش کی گئی جو مغرب کے مشروب کے طور پر مشہور ہے۔ یہ سب مجھے اُس نوجوان نے نہیں بتایا یہ میں نے اضافہ کیا ہے۔'' آنس نے ذرا سا رک کر یہ بیان دیا۔ مجھے تو بات سننے کا مزہ آ رہا تھا سو نہیں بولی۔ میں جلدی سے اس کہانی کے انجام پر آنا چاہتی تھی۔ اس لئے میں نے کہا۔ ''تو پھر وہ لوگ کس سمت کو نکلے ـــــ؟''

''تو وہ کدھر کو نکلے؟ وہ کون تھے؟''

اب میں سمجھ گئی کہ آنس وہ واقعہ بھول چکے ہیں۔ ایک خاص ترتیب سے وہ واقعہ میں اُن کے ساتھ لے کر چل رہی تھی۔ اب اچانک وہ واقعہ جو افغانستان سے چلا تھا، غائب ہو گیا تھا۔ اور میں جان چکی تھی۔ بس یہی آنس کے دھیان کی بے ترتیبی تھی جو میں دیکھ رہی تھی۔

''یہ جو جمّی انجینئر کی تصویر میں مغل کورٹ میں شاہ جہاں کا دربار لگا ہے۔ اس میں اورنگ زیب بھی ہے۔ اُس کے درباری گماشتے بھی ہیں۔ کہیں آس پاس کچھ ایسے کردار بھی ہیں جو دارا شکوہ کی حمایت میں یہاں آ گئے ہیں۔ شاہ جہاں جو اپنے آرکیٹیکچر کے ماہرین سے باتیں کر رہا ہے اور باغات کی آرائش کے لئے نقشہ

دیکھ رہا ہے۔ یہ نقشہ شالیمار باغ کا ہے یا تاج محل کا ہے۔ وہ دیکھو شاہ جہاں کے ماتھے پر بل پڑا ہے اور اُس نے نقشہ پھاڑ دیا ہے۔ جسے اورنگ زیب نے اُٹھالیا ہے۔ مجھے اس مغل کورٹ میں سازش محسوس ہو رہی ہے۔''

''مگر پینٹنگ تو ساکت ہے۔ یہ کوئی فلم تو نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''مگر مجھے سب کچھ دکھائی دے رہا ہے۔ مجھے تو پردے کے پیچھے سے جھانکتے کردار بھی دکھائی دے رہے ہیں۔ مجھے تو یہ بھی دکھائی دے رہا ہے کہ مغل شہنشاہ اپنی بیوی ممتاز محل کے ساتھ اختلاط کرنے کے لئے جا رہا ہے اور پھر وہ اختلاط کرتا ہے۔''

''اس پینٹنگ میں تو ایسا کچھ نہیں ہے۔'' میں نے جرأت کر کے کہا۔

''لو پینٹنگ وہ تھوڑی ہوتی ہے جو دکھائی دیتی ہے۔ پینٹنگ تو وہ ہوتی ہے جو اس کے پس پردہ ہوتی ہے۔ جو دکھائی نہیں دے رہی ہوتی۔ میں تو دیکھ رہا ہوں ـــــ مجھے ایسا دیکھنے کا شعور ہے۔''

''ہاں وہ تو ہے کہ آپ ایک مؤرخ ہیں۔''

''صرف مؤرخ نہیں ہوں۔ تاریخ کا سائنس دان ہوں۔ یہ ایک اور قسم ہے تاریخ دانی کی۔ اس لئے مجھے سب دکھائی دے رہا ہے۔ یہ جو جمّی انجینئر کی پینٹنگ ہے یہ حرکت کر رہی ہے۔ اس کے کردار چل پھر رہے ہیں اور جمّی انجینئر نے اس کے پس پردہ جو کہانی سوچی ہے، وہ مجھے صاف دکھائی دے رہی ہے۔ وہ یہ تصویر خواہ مخواہ فوٹو گرافر کی طرح نہیں بنا سکتا۔ تو مجھے دکھائی دے رہا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے گماشتوں کو دارا شکوہ کے خلاف کانوں میں کچھ کہا ہے۔ دارا شکوہ ایک درگاہ میں بیٹھا ہے اور اس کے آس پاس کئی طرح کے مسلمان صوفی ہندو بھگت اور سنت بیٹھے ہیں اور وہ اکبر کے دینِ الٰہی کی وضاحت کر رہا ہے۔''

''آپ کو کیسے پتہ چلتا ہے کہ جو تصویر میں دکھائی نہیں دے رہا وہ آپ کو سنائی دے رہا ہے؟''

''میں نے سوچا میں بھی اس پورے منظر نامے کا حصہ بن جاؤں۔ ہو سکتا ہے مجھے بھی دارا شکوہ دکھائی دینے لگ جائے اور میں اُسے دیکھ رہا ہوں۔ یہ منظر نامہ درباری امراء کا ہے جو بادشاہ گر ہوتے ہیں۔ مجھے ایسے بادشاہ گر پاکستان میں دکھائی دے رہے ہیں۔ مجھے لگتا ہے وہ سب کردار جو پاکستان کی سیاسی تاریخ کے مجذوب کردار تھے اور وہ جو پاکستانی تاریخ کے چیمے چٹھے ٹوانے دولتانے رانے نوابزادے اور میاں میانے سب مجھے دکھائی دے رہے ہیں۔ وہ اس مغل کورٹ کے عقب سے جھانک رہے ہیں۔ کیونکہ انہوں

نے اِن کی جگہ لینی ہے۔ کئی زمانے اوپر نیچے ہو چکے ہیں۔ مغل دربار کو جمّی انجینئرنے پینٹ کرتے ہوئے نہیں سوچا تھا کہ یہ مغل دربار آنے والے زمانوں میں کس طرح انگریزی دربار کی شکل اختیار کرے گا جس میں مغل دربار کے امراؤں کی بچی کھچی اولادیں انگریزوں کے تلوے چاٹتے ہوئے جاگیریں لیں گی۔ راجوں راجواڑوں کی غلام گردشوں اور راہداریوں میں حاملہ ہونے والی کنیزوں کی اولادیں ایک وقت آنے پر ان راجواڑوں اور جاگیروں کی مالک بن جائیں گی۔ اس پینٹنگ سے آگے بھی ایک پینٹنگ ہے جو مجھے دکھائی دے رہی ہے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ جمّی انجینئرنے یہ مغل کورٹ کی پینٹنگ کیوں بنائی کیا اس لئے کہ مغل دربار ایسا ہوتا تھا؟ یہ بات بتانے کی کیا ضرورت تھی سب کچھ تو تاریخ میں لکھا تھا۔ اُس نے یہ اس لئے بنائی کہ وہ اس میں آنے والے زمانوں کی تصویر بھی بنانا چاہتا تھا۔''

اب میں سمجھ گئی کہ آنس کے اندر تاریخ نے کروٹ لے لی ہے اور وہ پینٹنگز کے ذریعے ایک سرریئلسٹک تجربہ کر رہے ہیں۔ جو سارتر نے 1920ء میں متعارف کرایا تھا۔ اور یہ 2018ء کا سال تھا۔ اور مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ ہمارے گھر میں پکاسو کی تصویریں تھیں۔ شاکر علی، عبدالرحمٰن چغتائی، صادقین اور اقبال حسین کی پینٹنگز لگی ہوئی تھیں۔ کچھ تو پرنٹ تھے اور کچھ اوریجنل تھیں۔ خاص طور پر صادقین اور اقبال حسین سے تعلق کی وجہ سے انہیں یہ مل گئی تھیں۔ اور ایک دفعہ ایم ایف حسین جب پاکستان آئے تو خالی کینوس اور قلم ان کے سامنے رکھتے ہوئے آنس جھک گئے۔ ننگے پاؤں کو ہاتھ لگایا تو ایم ایف حسین نے ایسی لکیر لگائی کہ گھوڑے کی آؤٹ لائن وجود میں آ گئی۔ اب میں سوچ رہی تھی کہ وہ کس پینٹنگ کی طرف آتے ہیں۔ اچانک پکاسو کی مشہور تصویر ''گورنیکا'' کو دیکھا۔ ''گورنیکا'' پکاسو کے گاؤں کا نام تھا۔ جس پر جنگِ عظیم میں نازی جرمنی نے فضائی حملہ کیا اور گاؤں تباہ ہو گیا۔ اس کے احتجاج میں پکاسو نے یہ پینٹنگ بنائی جس میں ایک بھینس، ایک گھوڑا، ایک بچہ، ایک عورت آسمان کی طرف منہ کر کے چیخ رہے ہیں۔ اس پینٹنگ نے شہرت پائی اور نازی جرمنی نے یہ سمجھا کہ پکاسو نے ہمارا مذاق اڑایا ہے۔ ہم پر طنز کی ہے۔ اب اس کی سزا تو ملنی چاہئے تھی۔ سو پکاسو کی تلاش ہوئی۔ وہ فرانس میں موجود تھا۔ اُس وقت فرانس جرمنی کے قبضے میں تھا۔ پیرس میں پکاسو کے سٹوڈیو پر چھاپا مارا گیا جس طرح ضیاء الحق نے احمد فراز کے گھر چھاپہ مار کر اس کی نظموں کو ضبط کیا تھا۔ اتفاق سے پکاسو اپنے سٹوڈیو میں موجود تھا۔ فوجیوں نے اس کی تصویروں کو بے دردی سے الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ بالآخر وہ تصویر سامنے آ گئی مگر وہ فوجی نہیں جانتے تھے کہ پکاسو کیا کہنا چاہتا ہے۔ انہوں نے بس اتنا پوچھا۔ ''یہ تصویر تم نے

بنائی ہے؟''اس پر پکاسو نے جواب دیا۔''نہیں، یہ تصویر تو تم نے بنائی ہے''۔۔۔

وہ یہ بات نہ سمجھ سکے اور بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔ جبکہ احمد فراز سے جب پوچھا گیا کہ یہ نظم ''محاصرہ'' تم نے لکھی ہے تو اس نے جواب دیا۔''نہیں، یہ تو تم نے لکھی ہے۔'' یہ بات ضیاء الحق کے فوجیوں کو سمجھ آ گئی اور انہوں نے احمد فراز کی مشکیں کس دیں اور کہا۔''ہم ایسی کئی نظمیں لکھنا چاہتے ہیں۔'' یہ بات آنس نے مجھے بتائی تھی اور اب وہ پکاسو کی تصویر کو گھور رہے تھے۔ پھر کہنے لگے۔''مجھے ان کی چیخوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ اور یہ آوازیں آپس میں مل کے ایک بہت بڑا بین اور نوحہ بن رہی ہیں۔ سپین کا نوحہ۔ سپین کے سارے شاعر مل کر نوحہ کر رہے ہیں۔ وہ سب پکاسو کے مصیبت زدہ گاؤں میں پہنچے ہیں۔ جہاں لاشوں کے ٹکڑے بکھرے ہیں۔ ہر گھر سے چیخوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ بیچ میں ایک بطخ، ایک بکری، ایک مرغی، ایک بچی، ایک گائے، ایک بچھڑا، ایک کتا، ایک بلی اور ایک طوطا کہیں سے اکٹھے ہو کر آ گئے ہیں۔ اور اپنی اپنی آواز میں احتجاج کر رہے ہیں۔ اور شاعر ان کی آوازوں کو شاعری میں ڈھالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

وہ دیر تک اس تصویر کے اندر گم رہے۔ پھر نظریں صادقین کی میورل کے ایک حصے پر لگا دیں۔ جس پر سرخ پرچم بنے ہوئے تھے۔ اچانک بولے۔''ان پرچموں کے اندر سے لہو کی ایک لکیر نکلتی ہوئی پینٹنگ کے کینوس سے باہر آ رہی ہے اور اب وہ دیوار پہ چلتے ہوئے نیچے فرش پر آ رہی ہے اور لہو کی یہ لکیر کربلا سے چلی تھی اور اب اس پینٹنگ تک پہنچی ہے۔ کتنے سال لگ گئے لہو کی اس لکیر کو یہاں تک پہنچنے میں۔''

''لیکن مجھے تو لہو کی لکیر دکھائی نہیں دے رہی۔'' میں نے کہہ ہی دیا۔۔۔

''سنو یہ بات صادقین نے خود مجھے بتائی تھی کہ کربلا سے لہو کی لکیر میری پینٹنگ میں آئی تو میں نے اُسے اپنے سینے میں اُتار لیا تھا۔ اب وہ راستہ پا کر تصویر کے اندر سے نکل پائی ہے۔''

اب میں جان چکی تھی کہ وہ ہر تصویر کو اُس کی امکانی شکلوں میں دیکھ رہے ہیں اور وہ مصور کی سوچ کے متحرک ہونے کا اعلان کر رہے ہیں۔ اور ایسا ممکن بھی ہوتا ہے۔ گویا وہ تخلیق کو آنے والے زمانوں کے امکانات سے جوڑ رہے تھے۔ پھر وہ ایم ایف حسین کے اُس سکیچ پر آئے جس میں ایک گھوڑے کی آؤٹ لائن تھی۔ کہنے لگے''یہ گھوڑا سیدھا کربلا سے آیا ہے۔ یہ معمولی گھوڑا نہیں ہے۔ یہ ذوالجناح ہے۔ اور یاد رکھنا یہ گھوڑا جلدی ذوالجناح سے بُراق میں تبدیل ہو جائے گا۔ اسے پر لگیں گے اور یہ اُڑ کر آسمانوں میں غائب ہو جائے گا اور اس کینوس کو خالی چھوڑ جائے گا۔ براق ہی کربلا کا وہ ذوالجناح تھا جو امامِ عالی مقام کی سواری

بنا تھا۔ جب حضورِ پاک ﷺ نے بتا دیا کہ حسنؓ اور حسینؓ جنت کے شہزادے ہیں اور انہیں اپنی چھاتی مبارک پر کھلایا تو پھر براق ہی تو کربلا میں امامِ عالی مقام کی سواری بننا تھا ـــــ یہ ایم ایف حسین کو پتہ تھا اُس نے ایسے ہی یہ سکیچ نہیں بنایا۔ بڑے مصور کی ایک لائن پانچ سو سال کی تاریخ پر حاوی ہوتی ہے اور کبھی کبھی ہزاروں سال کی تاریخ پر حاوی ہو جاتی ہے۔"

میں نے اس تصویر کو دیکھا تو مجھے بھی اچانک یہی محسوس ہوا کہ جو آنس نے کہا ہے سچ ہے۔ وہ گھوڑا براق بن چکا تھا ـــــ اور کینوس سے اُڑ چکا تھا۔ اب اُن کی نظر اقبال حسین کی ایک پینٹنگ پر آ کر ٹک گئی جس میں ٹبّی گلی کی ایک ڈھلتی ہوئی عمر کی طوائف کی بالکونی میں اُس کے ڈھلکے ہوئے سینے اور گدرائے ہوئے جسم کو معمولی لباس میں دکھایا گیا ہے۔ اور اس طوائف کے چہرے پر جو مایوسی ہے وہ اُس کی عمر بھر کی کہانی کہہ رہی ہے۔ اس پینٹنگ کو دیکھ کر بولے۔

"مجھے اسکی جوانی دکھائی دے رہی ہے۔ چالیس سال پہلے یہاں اسے دیکھنے کے لئے شیام آیا تھا۔ شیام امرتسر سے آیا تھا جب اس کی فلم ریگل سینما میں ریلیز ہوئی تھی اور منٹو جو اُس کا دوست تھا۔ اُس سے ملنے سینما گیا تو وہ مداحوں میں گھر چکا تھا۔ اور وہ منٹو سے ملا اور یہ کہا کہ فلیٹی ہوٹل میں ملتے ہیں۔ منٹو بے چارہ فلیٹی میں انتظار کرتا رہا جس کا خاکہ اُس نے "گنجے فرشتے" میں لکھا تھا۔ شیام آیا اور اُن لوگوں میں گِھرا تھا جو اُسے ٹبّی گلی یا بازارِ حسن میں لے جانا چاہتے تھے۔ شیام نے کہا منٹو تم بھی چلو۔ ہم مجرا دیکھنے جا رہے ہیں۔ منٹو مایوس ہو گیا کہ جن تھکی ہوئی ڈھلکی ہوئی طوائفوں کی وہ کہانیاں لکھتا ہے، اب وہ اُن کو اسی بے بسی کی آخری حد تک دیکھنے کیوں جائے۔ یہ تو اُن طوائفوں کی "ہتک" ہو گی۔ اور شاید منٹو کو اپنا افسانہ "ہتک" اسی جگہ سے ملا ہو گا۔ منٹو اپنے گھر لکشمی مینشن چلا گیا اور بولا ہو گا۔ "کھایا پیا کچھ نہیں گلاس توڑا بارہ آنے۔"

مجھے معلوم تھا وہ ایک بات سے دوسری بات میں خود کو کیسے منتقل کرتے رہتے ہیں۔ اب کمرے میں دو پینٹنگز باقی بچی تھیں۔ ایک چغتائی کی مغل شہزادی کا پورٹریٹ، یہ سب عبدالرحمٰن چغتائی کا تخیل تھا۔ "لگتا ہے چغتائی میں ایک بہت بڑا فیشن ڈیزائنر چھپا ہوا تھا اور اس نے جو جو فیشن شہزادیوں کے لئے ڈیزائن کر کے پینٹ کئے وہ تو آج کل کے ڈیزائنرز کی سوچ سے کوسوں دور تھے۔ قبا کیسی ہونی چاہئے، پوشاک مغل شہزادی پر کیسے پھبن کے ساتھ آئے گی۔ لباس محض ستر پوشی نہیں شہزادی کے اندر کی شخصیت کو کیسے اُبھارے گا۔ اور جسم اور بدن میں جو فرق ہوتا ہے وہ کیسے لباس اور پوشاک سے عیاں ہو گا۔ یہ محض لفظوں کا کھیل نہیں ہے۔ اس میں

روح کا عمل دخل بھی ہوتا ہے۔ چغتائی کے بیٹے نے چغتائی کی پینٹنگز کی نقلیں بنانے کی فیکٹری لگائی اور باپ کو خوب بیچا۔ یہ مجھے کسی نے بتایا تھا۔ سچ کا پتہ نہیں۔''

''اس کا مطلب ہے چغتائی کی بنائی ہوئی مغل شہزادیاں اصلی ہیں یا بیٹے کی بنائی ہوئی نقل؟''

جو پینٹنگ میری دیوار پر لگی ہے یہ اصلی ہے۔ یہاں تک کہ کپڑے کا Texture۔ رنگ کی جھلکیاں جھلملیاں اور رنگ کے ادلتے بدلتے شیڈ سب اس پر دکھائی دے رہے ہیں اور یہی تو دنیا کے عظیم مصوروں کی کمائی ہے۔ آج بھی بڑے مصوروں کی تصویریں جاگ رہی ہیں۔ کیا پکاسو، مائیکل اینجلو، مستر ال، مونے کے شاہکار آج نہیں بول رہے۔ وہ دیکھو مونے (Monnet) کی تصویر ایک میورل کی طرح خوبصورت پھولوں کا کھیت ہے۔ جس میں کئی رنگ ہیں۔ کاسنی نمایاں ہے۔ پیلا، ذرا دبا ہوا۔ ہلکا پیلا، ذرا سا گلابی، ہرے کے ساتھ سبزی مائل۔ یہ سارے رنگ ذرا سے فرق کے ساتھ کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں۔ مونے کی اس پینٹنگ کو میں بدلتے دیکھ رہا ہوں۔''

اب میں پریشان ہوگئی کہ آنس اب کیا بات کرنے لگے ہیں۔

''مجھے لگتا ہے مونے کا رشتہ ژاں پال سارتر سے بھی ہے اور فرانسیسی پینٹرز کی اگلی نسلوں سے بھی ہے اور جرمنوں سے بھی ہے۔ ہیئرک بوش کی پینٹنگ ''Delight of Garden'' جسے انور سجاد نے اپنے ناول ''خوشیوں کا باغ'' میں Illustrate کیا تھا، وہ ایک عجیب بات تھی۔ مگر انور سجاد مر کیسے گیا؟ وہ تو مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اُسے کسی نے قتل کیا ہے؟ وہ لڑکی نہیں اب تو عورت ہوگی بلکہ بوڑھی عورت ہوگی جس نے میرے سامنے انور سجاد کو اپنے دامِ محبت میں پھنسایا۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ ڈاکٹر! بچ جانا اس نے مجھے بھی اپنے قریب لانے کی کوشش کی تھی۔ مگر ڈاکٹر نے نہ سننا تھا نہ سنا۔ اب اور کہانی میں نہیں بولوں گا۔ ڈاکٹر گیا۔ ایک بار ایک قبر میں دوسری بار دوسری قبر میں۔ یہ بھی ایک قصہ ہے۔ ڈاکٹر انور سجاد کو اپنے ہاتھوں سے ایک قبرستان جو کہ اُن کی کالونی میں تھا سپردِ خاک کیا گیا۔ عید کا دوسرا دن تھا۔ لوگ کم آئے۔ گرمی بھی تھی۔ ڈاکٹر کو ہم نے زمین کے حوالے کیا۔ مگر ڈاکٹر اُس زمین میں مضطرب ہوا ہوگا۔ پھر اُن کی چہیتی دوسری بیوی جس سے ان کی ایک بیٹی ہالینڈ میں تعلیم پا رہی تھی، پاکستان آگئی تو ڈاکٹر صاحب کی آخری رہائش گاہ کی زمین تبدیل کی گئی۔ پھر ڈاکٹر صاحب کو کہاں لے گئے اب مجھے معلوم نہیں۔''

''لیکن آپ تو مونے کی تصویر کی بات کر رہے تھے۔'' اب میں نے یاد دلایا۔۔۔

''یہ مونے کون تھا؟''ـــــ

اب میں سمجھ گئی کہ پینٹنگز سے آنس کسی اور دنیا میں خود کو لے جا چکے ہیں۔ اُن کے ہاتھ میں عبدالمجید شیخ کی کتاب ''قصے لاہور کے'' اب میرا ماتھا ٹھنکا کہ ان کے پاس تو قصہ خوانی بازار آچکا ہے اور یہ کئی قصوں کے خود گواہ ہوں گے کہ آخر تاریخ دان کی خورجین میں بھی کھوٹے سکے تو نہیں ہوتے۔ اب جو وہ بولے تو میں سمجھ گئی کہ آنس ایک اور دنیا میں جا چکے ہیں۔

''یہ جو عبدالمجید شیخ ہے بھئی کمال کا گپ باز ہے۔ جسے میں گپاڑی کہوں گا اور ظالم لاہوری خوراک پر ایسے ٹوٹ کے پڑتا ہے کہ لگتا ہے خود کو ہارٹ اٹیک کرا لے گا۔ مگر ہے بہت سیانا۔ اُسے معلوم ہے کب کب کیا کیا کھانا ہے اور کتنا کھانا ہے۔ ایک دن مجھے لے گیا ٹبی گلی۔ جسے کبھی بازارِ حسن کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور اُس سے منسوب قصوں میں علامہ محمد اقبال، فیض احمد فیض، سعادت حسن منٹو اور صوفی تبسم صاحب کا ذکر آتا تھا۔ مگر شیخ لے گیا پھجے کے پائے کھلانے۔ خیر ہم بیٹھ گئے۔ اب پھجا نام کا اصلی باورچی تھا بھی کہ نہیں۔ صرف نام چل رہا تھا۔ جب ہم نے پھجے کے پائے کھائے تو شیخ صاحب بولے کہ بھائی پائے پریشر ککر میں نہیں گلائے جاتے۔ یہ تو دھوکہ ہے۔

عبدالمجید شیخ نے جو قصے کھوج کے نکالے۔ ان میں سے ایک واقعہ تو مجھے برلن میں دیکھنے کو ملا تھا۔ مگر وہ دوسری جنگِ عظیم میں انگریزوں کی فوج میں ہندوستانیوں کی بھرتی سے متعلق تھا۔ اور یہ واقعہ پہلی جنگِ عظیم کا ہے۔ وقت ہے 1914ء کا کوئی دن۔ جہاں جہاں پہلی اور دوسری جنگِ عظیم میں برطانیہ کی فوجیں مختلف محاذوں پر لڑیں، وہاں وہاں ہندوستانیوں نے آقا کے لئے لاکھوں کی تعداد میں جانیں دے دیں۔ ان کے نام دنیا کے مختلف حصوں کے میموریل تختوں پر کندہ ہیں۔ کئی جگہوں کا تو میں بھی گواہ ہوں اور اب ایک گواہی عبدالمجید شیخ دے رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ لاہوری اور بھاٹی دروازوں کی حدود کے شمالی کنارے پر انہیں اللہ بخش ملا۔ جس کی عمر پچانوے سال تھی اور وہ ایک راز دینا چاہتا تھا۔ وہ ایک براؤن رنگ کا پوسٹ کارڈ لایا۔ جس پر غالباً ملکہ کی تصویر کا لوگو بھی تھا۔ جس پر دسمبر 1914ء کی تاریخ موجود تھی۔ جو اُسے اُس کے والد نے آخری بار لکھا تھا اور انگریزی زبان میں تھا۔ اس کا باپ انگریزی نہیں جانتا تھا۔ لکھنے والا لاہور ڈویژن کا سپاہی امیر بخش تھا۔ جو فرانس کی سرحد کیلئے میں گیوانچی کے مقام پر تعینات تھا۔ یہ گیوانچی وہی ہے جس کے نام سے پرفیوم مشہور ہے۔ خط میں بس یہ لکھا تھا کہ میری صحت ٹھیک ہے اور ہم جلد ہی محاذِ جنگ پر جانے والے ہیں۔

برائے مہربانی میرے لئے دعا کریں۔ دعا کو موقع ہی نہیں مل سکا۔ نہ دوبارہ خط آیا نہ اللہ بخش کا باپ آیا۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ مشترکہ پنجاب کے لاکھوں گھرو جوان اپنے پیچھے ایک ایک بچہ اور ایک ایک بیوی یا ایک ایک ماں باپ اور بہن بھائی چھوڑ گئے اور پھر واپس نہ آئے۔

اب جو عبدالمجید شیخ نے تاریخ میں غوطہ لگایا تو معلوم ہوا جنگِ عظیم اول کے شروع میں ہی 18 دسمبر 1914ء کے دن فرانس کے شہر کیلے میں تاریخی اہمیت کے حامل گیوانچی گاؤں پر قبضے کے لئے لاہور ڈویژن اور جرمنی کی فوجوں کے درمیان زبردست لڑائی ہوئی۔ پانچ دن دست بدست جنگ میں چار ہزار سے زیادہ سخت جان لاہوری شہید ہوگئے۔ اب انہیں شہید کہیں گے یا نہیں یہ ایک سوال ہے۔

میں نے گیوانچی کا گاؤں بھی دیکھا ہے۔ کیلے سے کئی دفعہ گذرا ہوں۔ البتہ وہاں اتنے پنجابی جوانوں کی شہادت کی تختی نہیں پڑھی۔ ہوگی کہیں ــــــ''

اب آنس نے عبدالمجید شیخ کی کتاب رکھ دی اور کہیں گم ہوگئے۔ کچھ دن پہلے میں نے انہیں ایک فلم دکھائی تھی جس کا نام تھا ''1917ء''۔ یہ فلم چند دن پہلے آسکر ایوارڈز کے لئے بے حد پسندیدہ تھی اور ساری دنیا اس فلم کے لئے بے چین تھی۔ اس لئے میں نے آنس کو وہ فلم دکھائی۔ فلم کیا تھی ایک نہ ختم ہونے والا تجربہ تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ آنس نے اپنے دوست عبدالمجید شیخ کا یہ واقعہ تو سن لیا۔ اور جو قصہ 1917ء نام کی فلم میں ہے وہ بھی تو اس سے ملتا جلتا ہے۔ اب میں سوچ ہی رہی تھی کہ آنس نے کہا۔ ''وہ کیا فلم تھی؟''

میں نے کہا۔ ''1917ء۔''

''ہاں ہاں وہی تو اُس میں بھی تو یہی واقعہ تھا۔ گیوانچی کا ہی محاذ تھا ــــــ''

''فلم میں یہ نہیں بتایا گیا کہ محاذ کیا تھا۔ صرف اتنا بتایا گیا کہ جرمن فوجیں سرحد کے پار مورچہ لگا کے بیٹھی ہیں اور برطانیہ کی فوج یہ سمجھتی ہے کہ وہ شکست کھا کے واپسی کی طرف جا رہی ہے۔ جبکہ اصل اطلاع یہ ہے کہ وہ چھپ کے بیٹھی ہے اور جونہی برطانوی فوج ان کے سامنے آئے گی تو وہ اُسے بھون کے رکھ دیں گی۔ اس اطلاع پر برطانوی کمانڈر دو نوجوانوں کا انتخاب کرتا ہے۔ اُن میں سے ایک نوجوان وہ ہے جس کا سگا بھائی اگلے محاذ پر برطانوی فوج کے اُس محاذ پر ہے جس میں سولہ سو فوجی جرمنوں پر حملہ کرنے والے ہیں۔ اب اُس نوجوان کو اس لئے منتخب کیا گیا کہ وہ بھائی کو بچانے کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ یہ فلم ایک کیمرہ کے ساتھ بغیر ایڈیٹنگ شوٹ کی گئی۔ اور جس کا بھائی محاذ پر تھا۔ وہ راستے ہی میں جرمنوں کے حملہ میں مارا جاتا ہے۔ اب اُس

کا دوست اس کا مشن لے کر چلتا ہے کہ کسی طرح ایک بھائی کو بچایا جا سکے۔ اور وہ پہنچ جاتا ہے مگر برطانوی فوج جرمنوں پر حملے کا اعلان کر چکی ہے۔ اور اُس میں ہزاروں ہندوستانی دکھائی دیتے ہیں گویا یہ وہی محاذ تھا یا اُس کے آس پاس کا کوئی محاذ تھا جس میں امیر بخش، غلام رسول، محمد بخش، اللہ دتہ، خدا بخش، سوبھا سنگھ، لہنا سنگھ، سکھی سنگھ، کرتار سنگھ قسم کے لوگ فلم میں دکھائی دے رہے تھے۔''

چند لمحے خاموشی رہی تو کہنے لگے۔ ''منٹو نے بھی تو لکھا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے حوالے سے۔ وہ کیا تھا؟''—— ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ بولے۔ ''ڈرائیور سے کہو مجھے منٹو کے گھر لکشمی مینشن لے جائے۔ اور ہاں ایک وہسکی کی بوتل پاکستان ٹائمز کے اخبار میں لپیٹ کر دے دو۔ پولیس اردو اخبار کو پکڑ لیتی ہے۔ انگریزی اخبار سے متاثر ہو جاتی ہے۔ اس پر ہاتھ نہیں ڈالتی۔''

میں نے ایسے ہی کہا جبکہ مجھے معلوم تھا پاکستان ٹائمز کب کا بند ہو چکا ہے۔ اور آنس کو ظاہر ہے پتہ نہیں کیونکہ وہ اس مقام پر نہیں تھے۔ میں نے ''ڈان'' اخبار میں وہسکی لپیٹ کر ڈرائیور کو دے دی اور ڈرائیور سے کہا۔ فون پر رابطے میں رہنا۔ منٹو صاحب کو فوت ہوئے تقریباً پینسٹھ سال ہو چکے تھے۔ میں نے آنس کو کہا کہ منٹو صاحب سے پوچھنا کہ '' آخری سیلوٹ'' افسانہ کس واقعے سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ آنس گاڑی میں بیٹھے اور چلے گئے۔ کچھ دیر بعد ڈرائیور کا فون آیا کہ منٹو صاحب یہ گھر چھوڑ گئے ہیں۔ پتہ نہیں کہاں گئے ہیں۔ صاحب کہہ رہے ہیں اب انتظار حسین کی طرف چلو۔ میں نے کہا انہیں لے جاؤ اور پھر مجھ سے فون پر بات کرنا—— تھوڑی دیر بعد پھر فون آیا کہ انتظار حسین وہاں سے چلے گئے ہیں۔ ان کے مکان میں جو لوگ رہتے ہیں وہ کہتے ہیں وہ واپس ڈبائی اپنے آبائی گاؤں چلے گئے ہیں۔ اور اب صاحب کہتے ہیں اشفاق احمد کے گھر ماڈل ٹاؤن لے جاؤ۔ میں نے کہا۔ انہیں لے جاؤ اور دیکھو وہاں اب اشفاق احمد نہیں رہتے۔ وہ کوٹھی بک گئی ہے تم وہاں جا کر دروازے پر کسی سے بات کرنا اور واپس آ کے بتانا کہ اشفاق احمد بھی واپس ہوشیار پور چلے گئے ہیں اپنے آبائی گھر—— ڈرائیور کا پھر فون نہ آیا۔

دن گذرتے رہے اور خواب، حقیقت اور فریبِ نظر سے الجھتے رہے۔ ایک دن اُٹھے۔ چائے میں نے دی تو کہنے لگے۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے تمہیں پتہ ہے کون آیا تھا؟ فیدل کاسترو میری اُس سے بات ہو رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اگر دنیا کسی بھی انسان سے انصاف کرنے سے انکار کر دے گی تو میرا ملک اُس کو سینے سے

لگائے گا اور انصاف کا سامنا کرے گا۔ اگر کوئی بحری جہاز وبا کی زد میں آتا ہے اور دنیا اُسے اپنے ساحل پر اترنے سے منع کر دیتی ہے تو میرا ملک اُس وبا کی زد میں آئے جہاز کو قبول کر لے گا۔ چاہے وہ وبا ملیریا کی ہو گی، نمونیا کی ہوگی، طاعون کی ہوگی یا کسی ایسے وائرس سے پھیلے گی کہ دنیا اُسے سنبھال نہیں پائے گی۔''

آنس یہ باتیں کر رہے تھے اور مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ یہ کوئی خواب ہے کہ فیدل کاسترو تو فوت ہو چکے ہیں، پھر بھی میں خاموش رہی۔ اس طرح کے خواب اکثر آپس میں گڈمڈ ہو کے کچھ کے کچھ ہو جاتے تھے۔ اور پھر آنس کی دلچسپی ان قوموں کی تاریخ میں رہی ہے جو سامراجی ملکوں کی غلامی سے نکلنے کے لئے لمبی جدوجہد کر کے آزاد ہوئے۔ کیوبا، چلی، ارجنٹائن، اور پیراگوئے قسم کے ممالک کی تاریخ میں انہیں بہت دلچسپی تھی۔ اس لئے اُن کے خوابوں میں بھی اکثر ایسے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔

''فیدل کاسترو نے عجیب و غریب بات کی ہے۔ وہ جانے سے پہلے کہہ رہا تھا کہ امریکہ دنیا میں تیسری جنگ عظیم ہتھیاروں سے نہیں چھیڑے گا وہ کوئی وائرس بنائے گا اور اُسے دنیا میں پھیلا دے گا۔''

''اس کا کیسے پتہ چلے گا کہ دنیا کسی بڑی وبا میں کیسے گرفتار ہوئی؟''

''فیدل کاسترو نے یہ تو نہیں بتایا۔ مگر امریکہ کچھ بھی کر سکتا ہے اور الزام کسی بھی دشمن ملک پہ لگا سکتا ہے۔''

اب مجھے پتا تھا کہ آنس کس خواب سے کسی اور خواب میں بھی جا سکتے ہیں۔ اور یہی ہوا جب انہوں نے کہا۔ ''تمہیں پتہ ہے ڈاکٹر مبشر حسن میرے پاس آئے تھے اور انہوں نے مجھے مرزا غالب اور پھر میر تقی میر کے کلام کا انتخاب جو انہوں نے شائع کیا تھا۔ مجھے پیش کیا اور میرے پاس بیٹھے رہے اور میں نے ان سے کہا۔ مولانا الطاف حسین حالی کے ساتھ جو ہوا وہی آپ کے ساتھ ہوگا۔ تو ڈاکٹر صاحب چونکے۔ کیوں ایسا کیا ہوگا میرے ساتھ جو میرے بزرگ الطاف حسین حالی کے ساتھ ہوا؟ اب یہ تو بتانا پڑے گا کہ ڈاکٹر مبشر حسن، مولانا الطاف حسین حالی کے خانوادے سے تھے اور بے حد قریبی مطلب ہے بھانجے تھے۔ پانی پت سے تعلق تھا اور پھر پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد ڈاکٹر صاحب کے اُس لان میں پڑی جہاں ذوالفقار علی بھٹو، جے اے رحیم، معراج محمد خان، حیات شیر پاؤ، غلام مصطفیٰ کھر اور ڈاکٹر مبشر حسن موجود تھے۔ اسی لان میں مجھے یاد ہے امریکہ سے ایک مارکسی سکالر اقبال احمد خان آیا کرتے تھے اور ڈاکٹر صاحب ان کا لیکچر رکھتے تھے اور ہم سب مل کر آنے والے مستقبل میں امریکہ اور سامراجی ملکوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھتے۔ اقبال احمد خان خود

امریکی یونیورسٹی میں پروفیسر تھے اور وہاں سے ہی آتے تھے۔''

''تو پھر ڈاکٹر مبشر حسن کے سوال کا جواب آپ نے کیا دیا تھا۔ وہ الطاف حسین حالی کے ساتھ کیا ہوا؟''

''ہاں تو میں نے کہا بھلے مانس حالی نے وہ کام کیا، جو اردو ادب اور شاعری میں کوئی اور نہ کر سکا۔ جدید رجحانات کے لئے زمین ہموار کی اور لکھنو والوں کو ہزیمت سے بچانے کی کوشش کی۔ لیکن میلہ سرسید احمد خان لوٹ کے لے گئے۔ کیونکہ انہوں نے سیاسی طور پر مسلمانوں کی ترقی کا نہ صرف خواب دیکھ لیا بلکہ علامہ محمد اقبال کو بھی دکھا دیا۔ پھر وہ خواب علامہ نے محمد علی جناح کو دکھایا۔ اور مولانا حالی ''شاہنامۂ اسلام'' لکھ کر بھی بس بھلے مانس کے بھلے مانس رہے۔ حتیٰ کہ اپنی اس غزل گوئی کی داد بھی نہ پاسکے جو آج بھی جدید اردو غزل کی بنیاد ہے۔''

''تو پھر مبشر حسن نے کیا کہا؟'' میں معلوم کرنا چاہتی تھی۔

''انہوں نے ایک لمبی تقریر کی۔ جو عرب کے صحراؤں سے ہوتی ہوئی کربلا تک پہنچی۔ اور پھر مشرقِ وسطیٰ کی چراگاہوں سے ہوتی ہوئی ایسٹ انڈیا کمپنی کے کلکتہ اترنے تک پہنچی۔ پھر وہاں سے ہوتی ہوئی بہادر شاہ ظفر تک پہنچی۔ پھر وہاں سے پیدل ہوتی ہوئی پارٹیشن تک پہنچی۔ اور پھر سیدھی روس کے انقلاب پہ پہنچی۔ وہاں سے سیدھی امریکی سامراج سے جا ملی۔ بڑی مشکل سے ذوالفقار علی بھٹو تک آئی ہی تھی کہ اُسے جنرل ضیاء الحق نے اُچک لیا۔ اب ڈاکٹر مبشر حسن وہاں سے گلوبالائزیشن کی طرف موڑ کاٹ ہی رہے تھے کہ میں نے روکا اور کہا۔ حضرت بات تو آپ کے بزرگ الطاف حسین حالی کی ہو رہی تھی۔ جو اُن کے ساتھ ہوا۔ وہی تو آپ کے ساتھ ہوا کہ بھٹو صاحب کی پارٹی آپ کے گھر بنی اور میلہ لوٹ لیا آصف علی زرداری نے۔ تو حالی اور مبشر کا حال تو ایک سا ہی ہونا تھا۔ اس پر مسکرائے اور یہ مسکراہٹ ہی میرے لئے داد کا درجہ رکھتی تھی۔''

اب میں خاموش تھی کہ اب آنس کو کس طرح کا زمانہ اور کس طرح کی یاد بجلی بن کے دماغ میں روشنی کرتی ہے۔ کچھ دیر خاموش رہے۔ ابھی کھانے کا وقت نہیں ہوا تھا۔ اخبار پڑے تھے۔ کتابیں پڑی تھیں۔ آرام کرسی پر ذرا سیدھے ہوئے اور میں نے محسوس کیا کہ انہیں نیند کا جھونکا آیا ہے۔ میں اُٹھ گئی۔ ایسا کئی بار دن میں ہوتا تھا۔ مگر یہ نیند عارضی ہوتی تھی۔ ذرا سا کھٹکا ہوا اور جھرجھری لے کر بیٹھ گئے۔ مگر میں کھٹکا نہ ہونے کی پوری تیاری کرتی تھی۔ کچن میں باورچی نہیں ہوتا تھا۔ کام کرنے والی ہمارے آس پاس نہیں منڈلاتی تھی۔

گویا میں نے ہر طرح سے آنس کی یادوں کے لئے دردل وا رکھنے کا بندوبست کیا ہوا تھا۔

اب میں بھی کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ قریب شام ہونے کو آئی۔ موسم گنگنا سا تھا۔ نہ زیادہ سردی نہ زیادہ گرمی۔ اب اُٹھی ہوں تو لگا ایک زمانے بعد اُٹھی ہوں۔ کبھی کبھی چند لمحوں میں زمانے بیت جاتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ میں اب کس کیفیت میں ہوں۔ مجھے لگا کہ میں بھی آنس کے ذہنی جغرافیے میں آ چکی ہوں۔ مجھے بھی نہیں پتہ کہ میں کہاں ہوں اور کیوں ہوں؟ اب میرے اور آنس میں شاید کوئی فرق باقی نہیں رہا تھا اور یہ بے حد خطرناک بات تھی۔ میں کیا کر سکتی تھی کہ میرا بھی ایک دماغی نظام ہے اور میری بھی ایک جسمانی حقیقت ہے۔ تو ایسے میں مجھے نہیں معلوم مجھے آگے کس طرح آنس کے ساتھ چلنا ہوگا۔ اب مجھے بھی محسوس ہوتا تھا صبح شام آپس میں مل گئے ہیں۔ زمانوں کی بساط کو کسی نے جیسے اُتھل پتھل کے رکھ دیا ہو۔ میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ میری یہ آنس کی طرح کی بیماری نہیں تھی۔ میری تو وہ عمر ہی نہیں تھی۔ یہ میری اپنی پیدا کی ہوئی کیفیت تھی اور یہ آنس کی وجہ سے طاقت پکڑ چکی تھی۔ میں اس سے باہر بھی آ سکتی تھی۔ لیکن جب دو ایک دفعہ اس طرح کی کیفیت ہوئی تو مجھے مزہ آنے لگا۔ یہ خطرناک بات تھی کہ میں اس کی عادی نہ ہو جاؤں۔ مگر مجھے خیالوں میں رہنے اور زمانے بدلنے میں لطف آنے لگا۔ اب میں نے بھی فرار کے لئے اپنے خیالوں کا استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ہوا یہ کہ ایک دن مجھے محسوس ہوا کہ ایک عورت نے گھر کی گھنٹی بجائی۔ میں نے دروازہ کھولا تو ایک لڑکی سامنے کھڑی تھی۔ خوبصورت تھی اور جوانی کی دہلیز سے دور جا رہی تھی۔ میں حیران ہوئی کہ یہ کون ہے۔ شاید غلطی سے یہاں آئی ہے یا کسی کو کھوج رہی ہے۔

"کون ہیں آپ؟" میں یہی پوچھ سکی۔

"پہچانا نہیں ہے۔ میں ہوں شمیم——"

"شمیم کون؟"

"کتنی جلدی اپنے کردار کو بھول گئیں۔ تم کہانی کار اپنے کرداروں کو استعمال کرتے ہو اور ٹشو پیپر کی طرح پھینک دیتے ہو۔ اپنی کہانی پر داد وصول کر کے خوش ہوتے ہو۔ تمہارے کردار بے چارے کس حال میں جیتے مرتے ہیں تمہیں اُس سے کیا لینا۔ کردار تو کہانی کار کے لئے کٹھ پتلی ہے۔ جب چاہا مار دیا۔ جب چاہا اُس سے کام لے لیا——"

اب مجھے پتہ چلا شمیم میرے افسانے کا ایک کردار تھی۔ مگر وہ اب اس طرح میرے سامنے آئے گی

یہ میرے تخیل کی کوئی جادوگری ہے یا شاید وہ حقیقی کردار تھا جو موجود تھا اور اب آ گیا ہے۔ میں نے اُسے اندر بلایا۔ وہ آ گئی میں نے اُسے بٹھایا —— چائے کا پوچھا۔ اُس نے جواب دیا ہاں وہ چائے پیئے گی۔ پہلے کھانا کھائے گی وہ دو دن سے بھوکی تھی۔

میرے گھر میں کھانا تو وافر ہوتا تھا اس لئے کوئی مشکل نہیں تھی اور جب میں کھانا لے کر گئی تو وہ صوفے پر سو رہی تھی۔ میں نے انتظار کیا وہ شام تک سوتی رہی۔ پتہ نہیں کب کی جاگی ہوئی تھی —— اب جب میں شام کے قریب گئی تو آہٹ کی کہ وہ جاگ جائے۔ وہ جاگی اور اس نے پہلا جملہ یہ کہا کہ میں سو کہانیاں سو چکی ہوں اور اب سو کہانیوں کے خواب دیکھ کر جاگی ہوں۔

اب میرے لئے مسئلہ تھا کہ وہ سو کہانیاں خواب میں کیا آئی تھیں۔ میں نے پوچھا۔ ”تم نے خواب میں جو کہانیاں دیکھی ہیں کچھ تو بتا دو۔“

”ہاں ابھی ابھی خواب میں آیا تھا وہ ”گلزار —— انڈیا کا رائٹر گلزار“ وہ کہنے لگے تم میری کہانی کا کردار کیوں نہیں بنیں۔ جبکہ میں بھی موجود تھا۔“

اب میں نے سنا اور سوچا کہ واقعی کوئی بھی کہانی کا کردار ہر رائٹر کے لئے ہوتا ہے۔ شمیم بھی تو گلزار کے لئے ایک کردار تھا۔ تو میں نے شمیم سے پوچھا کہ تم میرا کردار تھی تو تمہیں کیا اعتراض تھا۔ اور گلزار صاحب نے تمہیں کس طرح پیش کرنا چاہا تھا؟

اس پر اُس نے کہا۔ ”آپ نے مجھے ریپ کرایا۔ اور پھر ایک پاگل عورت کی شکل میں چھوڑ دیا تھا۔ کہانی ختم ہو گئی تھی۔“

”نہیں کہانی ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ میری کسی اور کہانی میں جاری ہو گئی تھی۔“

”میں تو آپ کے لئے وہیں مر گئی تھی۔ وہ تو کوئی اور ہو گی جو آگے چل کے آپ کی دوسری کہانی میں آئی ہو گی۔“

”ایک کہانی کار کو اپنے کردار سے شرمندہ ہونا ہی پڑتا ہے اور اُسے اس شرمندگی کی عادت ہو جاتی ہے۔ کیا گلزار صاحب اپنے کرداروں سے شرمندہ نہیں ہوئے ہوں گے؟“

”ہاں گلزار صاحب اپنی فلم ”موسم“ کی پہاڑی لڑکی سے ضرور شرمندہ ہوئے ہوں گے جس کی بیٹی کوٹھے پر اپنے باپ کے سامنے شراب پی کر اپنا دھندہ کرنا چاہتی ہے۔“

''ہاں اور بھی کردار ہیں۔ ہر بڑا کردار اپنے رائٹر کو شرمندہ کرنے کے لئے جنم لیتا ہے۔ منٹو صاحب تو اپنے بے شمار کرداروں سے شرمندہ ہوئے تھے''____

''لیکن کاش منٹو صاحب نے آپ کے افسانے سے مجھے اغوا کرلیا ہوتا تو وہ مجھے شاہکار بنا دیتے جیسے اُنہوں نے سوگندھی کو امر کر دیا۔ یا ٹوبہ ٹیک سنگھ کو یا بابو گوپی ناتھ کو یا کالی شلوار کی سلطانہ کو''____

''ہاں میں مانتی ہوں کہ منٹو اور مجھ میں فرق ہے۔ منٹو کے کردار نہ کوئی اغوا کرسکا ہے نہ منٹو کسی اور کے کرداروں کو اغوا کرنے کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ شمیم تم جہاں جہاں بھٹکی ہو۔ وہ میری دوسری کہانیوں میں تمہارا سفر موجود ہے۔''

''نہیں میڈم نہیں، کردار اپنے افسانے میں جیتا ہے اور اُسی تابوت میں دفن ہو جاتا ہے۔ کیا پریم چند کے دو کردار گھیسو اور مادھو جو ''کفن'' میں آئے تھے دوبارہ کہیں نظر آئے۔ وہ اپنی بھوک کے ساتھ ہی اُس افسانے کے تابوت میں دفن ہو گئے تھے۔''

''لیکن اشفاق احمد کے ''گڈریا'' کا کردار ''داؤ جی'' تو افسانے کے تابوت میں دفن نہیں ہوا۔''

''کیسے نہیں ہوا؟''

''وہ کبھی ممتاز مفتی کی شکل میں سامنے آجاتا ہے، کبھی واصف علی واصف کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ کبھی احمد رفیق اختر کی شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ کبھی علامہ جاوید غامدی کی شکل میں سامنے آتا ہے''____

''اب یہ داؤ جی کے وہ روپ ہیں جو نہ افسانہ نگار جانتا تھا نہ اُس نے سوچا تھا۔ یہ تو پڑھنے والوں کے روپ ہیں۔ پڑھنے والے داؤ جی کو جس روپ میں دیکھنا چاہتے تھے وہ روپ داؤ جی اختیار کرتے چلے گئے۔''

''کیا یہ داؤ جی کے کردار کا عروج ہے یا زوال؟''

''نہیں یہ تم فیصلہ نہیں کرسکتی۔ یہ فیصلے اللہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔''

''تو پھر میرے کردار کا فیصلہ کون کرے گا کہ میرے ساتھ انصاف ہوا یا نہیں؟''

''انصاف تو کسی بھی کردار کا نہیں ہوگا____ کیا اولیور ٹوئیسٹ کے کردار کو انصاف ملے گا؟ کیا برادرز کراموزوف کو انصاف ملے گا۔ کیا اینا کرینینا کو انصاف ملے گا؟ کیا ڈاکٹر ژواگو کو انصاف ملے گا؟ کیا

امراؤ جان ادا کو انصاف ملے گا؟ کیا ''کھول دو'' کی سکینہ کو انصاف ملے گا۔''

''پتہ نہیں میڈم۔ آپ نے مجھے جہاں چھوڑا تھا میرا کردار اُس سے آگے بھی تھا۔ آپ نے خبر نہ لی۔ میں ابھی زندہ تھی۔ میں پاگل نہیں ہوئی تھی۔ جو میرے ساتھ ہوا تھا وہ ''کھول دو'' کی سکینہ کے ساتھ بہت شدت سے ہوا تھا۔ پاگل ہونے اور حواس کھونے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ایک افسانہ نگار کو سمجھنا چاہئے تھا۔ منٹو کی سکینہ پاگل نہیں ہوئی تھی حواس کھو بیٹھی تھی۔ اور میرے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ ایک دن مجھے میری ایک دوست اپنے گھر لے گئی۔ دونوں میاں بیوی اکیلے رہتے تھے۔ دونوں کی محبت کی شادی تھی۔ اب یہ باتیں آپ کو معلوم نہیں ہیں کردار آگے تک جاتا ہے۔ میں اوپر کے کمرے میں رہنے لگی۔ کچھ دن مجھے محسوس نہیں ہوا کہ میں کہاں ہوں؟ پھر میں نے اندازہ لگایا کہ کسی نے مجھے ہمدردی میں یہاں پناہ دی ہے۔ وہ دونوں اپنی اپنی ملازمت کرتے تھے۔ دونوں کی سرکاری ملازمت تھی۔ ابھی اولاد نہیں ہوئی تھی یا انہوں نے خود ہی اس کا انتظام کر رکھا تھا۔ دونوں کو کبھی جھگڑا کرتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر میں رہی بھی کتنے دن؟ اب یہ بھی معلوم نہیں۔''

''تو پھر تمہارا کردار آگے بڑھ گیا ــــــ اور تم نے اُس کیفیت سے نجات پائی جو میرے افسانے کا انجام تھا؟''

''ہاں ایسا ہی ہوا تھا ــــــ اب میں اپنے اُس تجربے سے باہر آ رہی تھی اور جس طرح غلام عباس کے افسانے ''اُس کی بیوی'' کی طوائف جب گھریلو زندگی جیتے جیتے عورت کو پا لیتی ہے تو اُسے واپس طوائف خانے میں جانا ہوتا ہے۔ جو اس کا اذیت ناک لمحہ ہوتا ہے۔''

''تو کیا تمہارے ساتھ بھی ایسے ہی ہوا؟'' مجھے کچھ کچھ کھٹکا محسوس ہونے لگا۔ آخر ہوں تو میں کہانی کار جیسی بھی ہوں۔

''ہاں میرے ساتھ کیا مختلف ہونا تھا؟ میں نے اب گھر کے کام کرنے شروع کر دیئے تھے کہ میں سارا وقت اکیلی نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ یعنی میں ایک عورت کا روپ دوبارہ لے چکی تھی۔ صفائی کرتی پھر کچن میں جو کچھ پڑا ہوتا اُس کی کوئی ڈش بناتی اور پھر سوچتی مجھے کیا کرنا ہے؟ کہ ایک دن جب میں کچن میں کام کر رہی تھی تو پیچھے سے میری دوست کا میاں آیا کہ چابی گھر کی اُس کے پاس تھی۔ اس نے مجھے پیچھے سے اپنی گرفت میں لے لیا اور کہا۔ ''تم بہت خوبصورت ہو'' اور پھر مجھے چومنے لگا۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ میں نے مزاحمت کی تو اُس نے پھر وہ کیا جو مرد کو کرنا چاہئے۔ میری شلوار اُتار کے پھینکی اور ساتھ میں بولتا گیا کہ تمہارے ساتھ تو ریپ

ہو چکا ہے۔ اب تم تعلق بناؤ اور یہاں ہمیشہ کے لئے رہو۔ اُس کے کہنے کا مطلب تھا کہ میں اُسی کے گھر رکھیل بن کر رہ سکتی ہوں۔ اور اس کے بدلے میں وہ مجھے روٹی کپڑا اور رکھیل کے لئے پناہ گاہ فراہم کر سکتا ہے۔ وہ اپنا کام کر کے اپنے آفس چلا گیا اور اب مجھے سوچنا تھا کہ مجھے اُس کی دی ہوئی حیثیت کو قبول کرنا ہے یا کچھ اور سوچنا ہے۔''

''تو پھر اس تجربے کے بعد تم نے کیا سوچا؟''

''میں نے سوچا نہیں، فیصلہ کر لیا۔۔۔''

''کیا فیصلہ کیا؟''

''میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے زندہ نہیں رہنا۔ اس لئے میں نے کچن کی بڑی چھری اٹھا لی اور اپنے ساتھ رکھ لی تھی۔ اگلے دن جب وہ آفس سے آیا اور اُس نے کپڑے اُتارے اور میرے اوپر آیا۔ میں نے وہ چھری سیدھی اُس کے سینے میں اتار دی۔ مجھے دوسرا وار نہیں کرنا پڑا۔ وہ چند لمحوں میں ٹھنڈا ہو گیا۔ میں خود ہی تھانے گئی اور پھر مجھے سزا ہو گئی۔''

''تو تم نے سزا پوری کر لی ہے۔۔۔ اور اب کہاں رہتی ہو؟''

''نہیں سزا تو پوری نہیں ہوئی۔ میں جیل توڑ کے آئی ہوں۔''

''جیل کیسے توڑی؟ کسی سے وہاں دوستی ہو گئی کیا؟''

''بس اتنی آپ کی کہانی کی طاقت ہے۔ اتنا سوچ کے فیصلہ کر لیا کہ کسی سے دوستی کی ہو گی اور اُس نے مجھے جیل توڑنے میں مدد دی ہو گی۔ اور کوئی طریقہ جیل توڑنے کا نہیں ہو سکتا۔''

''تو پھر کیسے آئی ہیں؟''

''اب یہ بھی میں آپ کو بتاؤں کہ ایک جرمن رائٹر تھا ہرمن ہیس۔ اُس نے اپنی آٹو بائیوگرافی میں جیل توڑنے کا طریقہ بتایا تھا۔ جب وہ جیل میں تھا ایک معمولی سا جرم اُس نے کیا تھا تو اُس نے جیل توڑنے کا ایک طریقہ استعمال کیا۔ اس نے جیلر سے کوئلہ مانگا۔ اُس کوئلے سے دیوار پر پہلے ریل کی پٹڑی بنائی پھر ریل کے پہیے بنائے پھر ریل بنائی اور جس دن اسے جیل توڑنی ہوتی تھی وہ ریل کے انجن کی چمنی پہ دھواں بنا دیتا تھا اور اس ریل میں بیٹھ کے جیل سے باہر چلا جاتا تھا۔ جب جیلر اُسے دیکھنے آتا تھا تو وہ واپس اُسی سیل میں آ چکا ہوتا تھا۔ میں بھی ایسے جیل توڑ کے آئی ہوں اور اب جا رہی ہوں۔'' اب جو میں

نے دیکھا شمیم وہاں موجود نہیں تھی۔

میرا کردار اب میرا کردار نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے اختیار میں آ چکا تھا۔ اس طرح تو میری کہانیوں کا کوئی کردار بھی میرے کمرے میں آ سکتا تھا۔ میں خود بھی اس طرح کسی کے پاس پہنچ سکتی تھی۔ مجھے اب اپنے کرداروں سے ڈر محسوس ہونے لگا۔ کیا معلوم کب کون سا کردار آ جائے اور مجھے لاجواب کر دے۔ میں نے تو بے شمار کرداروں سے ناانصافی کی ہوگی نہ بھی کی ہو تو کیا میں نے کرداروں کو مشکلات میں نہیں ڈالا ہوگا۔ کردار تو بنتا ہی تب ہے جب کہانی کار اُسے کٹھالی میں ڈالتا ہے۔ جہاں اُسے پگھلانا ہوتا ہے اور پھر کہانی کار اُسے اپنی مرضی سے ڈھالتا ہے۔ ایسے میں وہ کردار تو آئے گا میرے پاس۔ میں گھبرا گئی اور میں نے اس کیفیت سے نکلنے کے لئے آفس کے کمرے کا رُخ کیا۔ وہ سو رہے تھے اب میں سوچنے لگی۔ ابھی خواب میں ہوں گے اور باہر آئے تو خواب حقیقت کا روپ لے چکا ہوگا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اب کیا دیکھتی ہوں کہ میرا دوست ونود ملہوترا ہوٹل کی لابی سے آ رہا ہے۔ وہ لابی میرے خواب میں مکمل پکی ہے اور اب خواب تو خواب نہیں رہا۔ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی خواب میں ہوتے ہوئے بھی خواب میں نہیں ہوتا۔ یہ بنگلور کا عجیب وغریب ہوٹل ہے۔ بڑے بڑے درختوں میں گھرا ہوا ہے۔ چاروں طرف سبزے کی چادریں بچھا دی گئی ہیں۔ بڑی بڑی مورتیاں وسیع وعریض بینکوئٹ ہال میں سجی ہیں۔ چھوٹی مورتیاں ڈانسنگ پوز میں ایستادہ ہیں۔ لابی ہو یا کاریڈور ہو ہر جگہ بنگلور کے اِن ڈور آؤٹ ڈور پلانٹس حیرت انگیز تراش خراش کے ساتھ سجے ہیں۔ گمان ہوتا ہے مصنوعی ہوں گے۔ قریب جائیں تو وہ سانس لے رہے ہوتے ہیں۔ بنگلور کی آب وہوا عجیب ہے گرم مرطوب بھی ہے اور بارشوں کے نظام میں کہیں آتی ہے۔ ہوٹل انڈین آرکیٹیکچر اور انڈین کلچر کی ہر جہت کو تقسیم بنا کے تعمیر کیا گیا ہے۔ اور سجاوٹ میں مسلم کلچر، ہندو کلچر، کرسچین کلچر اور بدھ مت کے کلچر کی ہر بات دھیان سے سوچی گئی ہے۔ لگتا ہے کسی نے سیکولر انڈیا کو زمین پر مصور کر دیا ہے۔ میں جب پہلی بار اس ہوٹل میں داخل ہوئی تو مجھے لگا میں ایسے جہان میں آ گئی ہوں جہاں تین ہزار سالوں کی تاریخ سانس لے رہی ہے اور اب اس تاریخ سے میں نے بھی اپنا سانس حاصل کیا۔ کئی صدیاں جسم میں طراوت پیدا کرتے ہوئے اندر ہی اندر ہلکورے لینے لگیں۔ میں یہاں پہلی بار ایک بین الاقوامی تنظیم کی وجہ سے آئی تھی جو دنیا بھر میں عورتوں کے حقوق کے لئے سرگرم تھی۔ میرے آنے کی وجہ میری کہانیاں تھیں ___ یہ پہلی شام تھی اور ہوٹل میں ڈنر سے پہلے کی سرگرمیاں شروع ہو چکی تھیں۔ بنگلور کے ادیب، مصور، موسیقار، فنکار اور انسانی حقوق سے تعلق رکھنے والے سبھی بڑے

لوگ موجود تھے۔ میں بہت سوں کو جانتی تھی۔ مگر میرے لئے ذاتی پہچان کا شاید کوئی نہیں تھا۔ اس لئے میں ایک ڈرنک اور کاجو پستے اور اخروٹ کی پیالی لے کر ایک خوبصورت پلانٹ کے سامنے بیٹھ گئی۔ میں نے راجستھانی سوتی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ جو میرے لئے میری ایک دوست دہلی کے ایمپوریم سے لے کر آئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم میں کیسی لگ رہی تھی کہ مجھے اس طرح سوچنا کبھی اچھا نہیں لگا۔ انسان کو انسان لگنا چاہئے۔ ہالی وڈ یا بالی وڈ کی ہیروئن لگنا بالکل ضروری نہیں ہوتا۔ ایسے میں ونود ملہوترا ہاتھ میں گلاس لے کر آیا اور کہا۔ ''کیا میں بیٹھ سکتا ہوں۔ میں مصور ونود ملہوترا ہوں اور میری دو پینٹنگز اس ہوٹل میں بھی لگی ہوئی ہیں۔'' میں نے یہ نام سنا ہوا تھا اس لئے میں نے اُسے بیٹھنے کی اجازت دی۔ یہ شام آگے جا رہی تھی۔ ونود ملہوترا اپنا گلاس لے کر آیا تھا۔ اُسے معلوم تھا میں کہانیاں لکھتی ہوں۔ اُسے میرے شہر سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ امرتا شیر گل کو یاد کر رہا تھا۔ پھر چغتائی اور پھر صادقین سے ہوتا ہوا اقبال حسین تک آ گیا اور اُس نے اعتراف کیا کہ وہ اُس سے متاثر رہا ہے۔ خاص طور پر طوائفوں کے پورٹریٹ جو اُس نے بنائے ہیں وہ اُسے فرانس کے مصوروں کی یاد دلاتے ہیں۔ شام آہستہ آہستہ رات میں تبدیل ہو گئی۔ اب ہماری میز کے آس پاس اور لوگ بھی اپنے اپنے گلاس لئے آ گئے۔ ویٹر سب کو ہر شے میز پر پہنچا رہے تھے۔ ہمارے بھی گلاس تر و تازہ ہوتے رہے۔ ایسے میں ونود مجھے لے کر وہاں سے اٹھا کہ میں اُس کی پینٹنگز دیکھ سکوں جو اس ہوٹل کا حصہ ہیں۔ یہ بہت بڑی پینٹنگز تھیں۔ اور ہندوستان کی تاریخ کے کئی زمانوں کو ساتھ لے کر چل رہی تھیں۔ ہم وہاں سوئمنگ پول کی طرف آ کر بیٹھ گئے۔ ونود بتانے لگا کہ وہ ایک غریب کسان گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ ویٹر آتے رہے اور ہمارے لئے سب کچھ لاتے رہے۔ اس ہوٹل میں ڈنر کے لئے آپ کہیں پر ہوں، آپ کو سروس دی جاتی ہے۔ ونود کی ماں بچپن میں پولیو کا شکار ہو گئی تھی۔ اور وہ جب کچی زمین پر چلتی تھی تو جو لکیریں بنتی تھیں ونود کو بچپن ہی میں اُن لکیروں میں کچھ دکھائی دیا۔ اور اُس نے کھیتوں کی کچی زمین پر ہی ان لکیروں کی مدد سے کچھ بنانے کی کوشش کی اور وہ کامیاب ہو گیا۔ زمین پر کوئی نقش موجود تھا۔ وہاں سے وہ کاغذ پر آیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کی پہلی پینٹنگ زمین پر وجود میں آئی تھی۔

پھر اُسے شانتی نکیتن بنگال میں داخل کیا گیا کہ وہ قریب میں تھا اور عام بچوں کو وہاں داخلہ مل سکتا تھا۔ وہاں اُس نے بنگال کی روح کو پایا۔ وہ یہ ساری باتیں اُس شام کیوں مجھ سے کر رہا تھا جبکہ اس محفل میں اُس کے لئے تو بہت کچھ تھا۔ بینگلور کے ادیب، تھیٹر، رائٹرز، ایکٹرز، پینٹرز، اور فنونِ لطیفہ کے ہر شعبے کے

بڑے موجود تھے۔ میں سوچنے لگی یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اُس کے گرد بہت سی خواتین منڈلاتی دکھائی دیں۔ مگر سمجھ گئیں کہ وہ کسی اور سے نہیں ملنا چاہے گا۔ میرے خیال میں شاید میرا اپنا پن اور پھر لاہور اور پھر میرا سب سے مختلف ہونا اور ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا جادو، کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ونود بول رہا تھا اور اس کی باتیں تیرتے ہوئے مجھ سے لپٹ رہی تھیں۔ ایسا میری زندگی میں پہلی بار ہو رہا تھا۔ شاید اُس شام کی مٹھی میں کچھ جادو تھا جو مکمل رہا تھا۔ اُس نے بتایا وہ کلکتہ کے میو سکول آف آرٹس میں پڑھا جہاں سے لاہور کا نیشنل کالج آف آرٹس پیدا ہوا۔ اور لاہور کا میوزیم بھی ــــــ اب مجھے محسوس ہوا کہ اس شام کے مہمان ڈنر سے فارغ ہو کر ایک دوسرے سے گلے مل کر جانے کے لئے تیار ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہے مجھے تو اسی ہوٹل میں رہنا تھا تو میرے لئے تو یہ لمحہ ہی سب کچھ تھا۔ ونود ملہوترا نے ضرور جانا تھا مگر وہ جانا نہیں چاہتا تھا۔ اُس کی وجہ شاید میں نہیں تھی۔ وہ کسی مختلف خاتون سے اپنا حالِ دل بیان کرنا چاہتا تھا اور یہ اُس کی ضرورت تھی۔ اب ایک کہانی کار کو اتنا تو سمجھ جانا چاہئے تھا۔ اب میں اور ونود ایک احساس سے جُڑ چکے تھے۔ میں نے کبھی مردوں کو محبوب کے روپ میں تجربہ نہیں کیا تھا۔ اس لئے کہ مرد کا کوئی بھی روپ ہو وہ اُس کے لیے فائدے کا ہی ہوتا ہے۔ پھر بھی میں نے ونود ملہوترا کو کوئی ایسا اشارہ نہیں دیا کہ وہ اپنی حیثیت کا فائدہ اٹھاتا ــــــ ہاں ایک جگہ جب بات آئی تو اُس نے بتایا کہ وہ اپنے شعبے میں نیوڈ بنانے کے لئے مشہور ہے۔ اب مجھے اپنے کولن ڈیوڈ یاد آئے۔ پھر مجھے یہ بھی یاد آیا کہ ایک دفعہ ایک جماعت کے غنڈوں نے اُس کے سٹوڈیو پہ حملہ کر کے اس کی پینٹنگز توڑ پھوڑ ڈالی تھیں۔ ایسا پاکستان میں اس جماعت کے غنڈے اکثر کرتے رہتے تھے۔ اب جب ونود نے بتایا کہ وہ نیوڈ بنانے کی تربیت فرانس سے لے کر آیا ہے۔ فرانس، اٹلی، جرمنی اور انگلینڈ کے پینٹرز اس آرٹ کو تخلیقی طور پر نہ صرف سمجھتے ہیں بلکہ نیوڈ اور پورنوگرافی کے فرق کا ادراک بھی رکھتے ہیں۔ میں یہ سب جانتی تھی اور جب ونود ملہوترا نے مجھے اپنی نیوڈ اگلے دن اپنے گھر پر دکھائیں تو میں حیران ہو گئی۔ جیسا جسم اللہ نے بنایا ہوتا ہے اُسی جسم کو ونود نے اُسی طرح پینٹ کر دیا تھا۔ جسم کا درجہ حرارت، جسم کا ٹیکسچر، جسم کا فیبرک سب کچھ پینٹنگ میں آ چکا تھا۔ ونود نے مجھے اگلے دن اپنے سٹوڈیو میں آنے کی دعوت دی اور میں نے قبول کر لی۔ وہ مجھ سے الگ ہوا، میں نے اُسے ہوٹل کی لابی کے باہر اُس کی گاڑی میں بٹھایا اور اُس نے کہا۔ وہ اپنی گاڑی بھیجے گا جو مجھے اس کے سٹوڈیو میں لے کر جائے گی۔ یہ سب ہو گیا اور میں اُسی ہوٹل کے کمرے میں آ گئی۔ راجستھانی ساڑھی اتاری اور اپنے بدن کو دیکھا تو مجھے لگا ونود کی خواہش تھی کہ میں اپنا نیوڈ اُس سے بنواؤں۔ ایک مصور راجستھانی ساڑھی میں بھی

اپنے ٹیلنٹ کو بھانپ سکتا ہے۔ ایسا تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا لیکن یہ جو آرٹسٹ ہوتے ہیں یہ بھی اشاروں اور استعاروں میں باتیں کرتے ہیں۔ میں سمجھ تو گئی تھی مگر میں سوچ رہی تھی کہ اُسے کیا جواب دوں۔ پھر میں نے ایک جواب بنا دیا کہ دیکھو ونود اگر تم اتنے بڑے آرٹسٹ ہو تو اس ساڑھی کے اندر سے میرا نیوڈ بنا دو۔ اس پر ونود رُک گیا۔ اُس نے صرف اتنا کہا اب ہم الگ ہوتے ہیں اور وہ چلا گیا۔ میں اپنے بیڈروم میں آ گئی اور سوچنے لگی۔ یہ میرے لئے کیسا تجربہ ہوا ہے۔ اگلے دن تین بجے کانفرنس کا آغاز تھا اور مجھے صبح ونود کے سٹوڈیو جانا تھا۔ مجھے نیچے ناشتے کے لئے جانا تھا۔ میں تیار ہو کر ریستوران میں آئی تو بہت رونق تھی۔ مختلف ملکوں کے مہمان آتے جا رہے تھے۔ ہوٹل تو بنگلور کا شاید سب سے بڑا ہوٹل تھا جہاں آئی ٹی کی دس ہزار تک کی کانفرنسز وہاں ہو سکتی تھیں۔ ہماری تو بہت چھوٹی سی کانفرنس تھی۔ ناشتے کے بینکوئٹ ہال میں دس بارہ مختلف ڈسپلے ایریاز میں ریجنل کوزین، انڈین نیشنل کوزین اور انٹرنیشنل کوزین کی ہر طرح کی خوراک موجود تھی۔ دنیا بھر کا فروٹ، دنیا بھر کے پنیر، دنیا بھر کی ڈبل روٹیاں قسمو قسم کی موجود تھیں۔ یہاں سے فارغ ہو کر میں ونود کا انتظار کرنے لگی کہ اُس نے گاڑی بھیجنی تھی۔ ٹھیک وقت پر ریسیپشن سے فون آیا اور میں نیچے آئی تو ونود خود موجود تھا۔ اور اب وہ مجھے اسی ہوٹل کے ایک کافی بار میں لے گیا جس سے میں واقف نہیں تھی کہ پورا ہوٹل تو میں نے دیکھا ہی کب تھا۔ یہ بھی ایک بڑا تجربہ تھا۔ مختلف آرٹ کے نمونوں اور اوریجنل پینٹنگز سے یہ بار سجا ہوا تھا۔ کہیں ستیش گجرال تو کہیں ایم ایف حسین تو کہیں بنگالی پینٹرز اور کہیں راجستھانی مصوروں کے کمالات موجود تھے۔ میں نے کشمیری کڑھائی کی شال لے رکھی تھی اور بلاک پرنٹنگ کا جے پوری کرتا اور چست پاجامہ تھا — مجھے تو ونود نے بتایا کہ تم نے آدھا ہندوستان اوڑھ رکھا ہے۔

ونود ملہوترا کے سٹوڈیو میں کئی گیلریز تھیں۔ ایک پورٹریٹس تو دوسرا لینڈ سکیپ، تیسرا فیوژن تو چوتھا نیوڈ کا تھا۔ بہت وقت لگا ہر ایک کو جاننے میں۔ اب ہم ونود کے سٹوڈیو میں کافی پی رہے تھے اور میں سوچ رہی تھی کتنی بڑی دنیا ہے ہندوستان میں۔ دنیا تو جان ہی نہیں سکتی کہ ہندوستان کے راجواڑے اور ریاستیں اپنے اندر کیسا اسرار رکھتی ہیں اور کیسے کیسے فن کے آثار کہاں کہاں موجود ہیں۔ میں تو صرف ونود ملہوترا کو دیکھے جا رہی تھی۔ ونود کے لئے دنیا کی کسی بھی عورت سے دوستی کرنا مشکل بات نہیں تھی۔ اس لئے میں سوچ رہی تھی وہ اپنے اندر کے آرٹسٹ کو میرے سامنے کیوں رکھنا چاہتا ہے۔ مجھے تو بس یوں لگا کہ اُسے میرے اندر اُس کی کوئی محبوبہ دکھائی دے گئی ہے یا اُس کی روح میرے چہرے پر دکھائی دے رہی ہے۔ لیکن وہ مجھے اپنے حوالے سے

آگاہ کرنا چاہتے تھے۔ میں نے ونود کو موقع دیا کہ وہ مجھے نیوڈز کے حوالے سے بتائیں کہ یہ کیسا آرٹ ہے؟ اگر چہ میں جانتی تھی مگر میں ایک دنیا کے بڑے نیوڈ پینٹر سے سننا چاہتی تھی۔ ونود نے مجھے کچھ نیوڈز دکھائے۔ بہت بڑے کینوس پر فرانسیسی نیوڈز کی طرز پر بنائے گئے تھے۔ ان میں اُس نے بتایا کہ اُس کی پسندیدہ نیوڈز ادھیڑ عمر عورتوں کی ہیں۔ جن کے جسم ڈھلکے ہوئے ہیں اور چھاتیاں کبھی کبھی تناسب سے بڑی ہوتی ہیں اور وہ عورتیں جن کے جسم فربہی مائل ہوتے ہیں اُن کے نیوڈ پینٹر کے لئے چیلنج ہوتی ہیں۔ جوان عورت کے خوبصورت جسم کو پینٹ کرنے میں کیا چیلنج ہے؟ اس بات کو فرانسیسی بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اس لئے وہ بوڑھی طوائفوں کی نیوڈز بنانے میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ جن کے جسموں پر کئی طرح کے موسم اور زمانے گذر چکے ہوں۔

''تو آپ میری نیوڈ بنانے میں اتنی دلچسپی کیوں رکھتے ہیں؟'' یہ بات میں نے اُس وقت کہی جب اُس کے سٹوڈیو میں کھڑکی سے دھوپ باہر کے درختوں میں چھن کر ایک نیوڈ پر ایسے چھنکی ہوئی تھی جیسے سفید پھولوں کی پھوار اس پر پڑ رہی ہو۔

''اُس کی وجہ آپ کے جسم کی رنگت ہے۔ جو سو میں سے ایک عورت کی ہوتی ہے۔ یہ نہ گورا ہے نہ گلابی ہے، نہ گندمی ہے نہ سانولا ہے، نہ کھلتا ہوا ہے نہ دھوپ میں آیا ہوا۔ تانبے کے آس پاس کی رنگت کا ہے اور پھر جسم کا تناسب بھی نیوڈ پینٹر کے لئے بہت آئیڈیل ہے۔ اس نے بتایا۔

''آپ کو یہ سب کس طرح میرے لباس کے اندر کے جسم کا علم ہو گیا ہے۔''

''ساڑھی..... ساڑھی انڈیا کا واحد لباس ہے جس سے عورت کے جسم کو دیکھے بغیر اُس کا صحیح اندازہ لگا سکتا ہوں اور یہ اس لئے ایجاد ہوا تھا کہ ـــــ'' ونود ایک نئی بات بتانے لگا تھا۔ اس لئے میں توجہ سے سننے لگی۔

''ساڑھی اس وجہ سے وجود میں آئی کہ انڈین مائیتھولوجی میں عورت کا جسم پوتر ہے۔ اس لئے مندروں کے قدیم اتہاس میں پتھروں پر عورت کے جسم کے مختلف زاویوں کو تراشا گیا ہے۔ عورت کے جسم کی اتنی سطحیں قدیم مندروں میں تراشی گئیں اور ہندوستانی کوک شاستر میں عورتوں کے اتنے مختلف آسن کیوں تشکیل دیئے گئے اور عورتوں کو جسمانی طور پر کتنے نام دیئے گئے۔ کامنی، کندن، کابوری، شانتی، شام رنگ اور مادھوری وغیرہ۔ یہ نام قدیم زمانے سے چلے آ رہے ہیں اور اجنتا الورا سے لے کر کھجرا ؤ اور پھر ہندوستان کے

ہر علاقے کے قدیم مجسموں میں یہاں کے مجسمہ سازوں نے عورت کے اعضا کی پر اسرار خوبصورتی کو اپنے اپنے انداز سے اجاگر کیا۔ لیکن کھجوراہو کی کوئی مثال نہیں۔ یہ چھاتیاں مبالغہ آمیز ہیں۔ اسی حساب سے پیچھے کا ابھار ان چھاتیوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ ایسی عورتوں کے مجسمے آپ قدیم مجسموں میں دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں چہرے کو بھی خاص مقام دیا گیا ہے۔ بے حد کھلی چوڑی آنکھیں، ناک ذرا سا موٹا اور اسی نسبت سے بھرے بھرے ہونٹ ——— یہ ہندوستانی ماتھولوجی کی عورت ہے۔"

"شاید اردو کے شاعروں یا فارسی کے شاعروں نے اپنی غزل میں اسی طرح کا سراپا لکھا ہے"——— میں نے ونود کو ٹوک کر کہا، اور پوچھا———

"کیا آپ یہ بات مجھے بتائیں گی۔"

"ہاں ہماری اردو غزل میں جو بے حد حسین آنکھوں والی جو لکھنؤ کی ہو، دلی کی ہو محبوبہ کا سراپا اس طرح کا ہے۔ مثلاً اس کے کمر ہے کہ نہیں۔ اسی طرح آنکھ چشم آہو ہے۔ اگر آپ چشم آہو دیکھیں تو وہ عورت کی آنکھ نہیں ہو سکتی۔"

"اور یہ سارا تصور تو ہندوستانی ماتھولوجی کے نقطۂ نظر سے ہے۔ آپ اگر ہزاروں سال پرانی پینٹنگز اور مجسمے دیکھیں تو آپ کی اردو غزل کی محبوبہ بھی وہی ہے جو ہندوستانی ماتھولوجی کی عورت ہے۔"

اب میں سوچنے لگی کہ اردو غزل کی محبوبہ ایران سے آئی تھی یا وہ ہندوستان ہی کی تھی۔ اور اگر ایران سے آئی تھی تو کیا ایران بھی ہندوستانی ماتھولوجی کے زیر اثر رہا ہے یا نہیں ——— میری اس حوالے سے معلومات ظاہر ہے بہت معمولی تھیں۔ ونود نے تو اس فن کو تاریخی اور دیو مالائی تسلسل کے ساتھ جوڑ دیا۔ اور خود میرے بدن کو بھی اسی میں کہیں بہت اہمیت کے ساتھ ونود نے اپنے آرٹ کی توسیع میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میں تو اس کے لئے تیار نہیں تھی۔ وجہ یہی ہے کہ میں خود ایک تخلیقی فنکار رہوں تو میں کسی اور فن کے لئے استعمال نہیں ہونا چاہتی تھی۔ ونود نے اصرار بھی نہیں کیا تھا۔ مگر اس نے مجھے قائل کرنے کے لئے نیوڈز کی جو تاریخ بتائی اور پھر ہندوستان میں اس کی روایت کیسے چلی۔ تو اس بہانے بہت کچھ معلوم ہو گیا۔ مثلاً یورپ اور روس میں بے حد مضبوط بادشاہتیں تھیں۔ ایسے ہی جاپان، ایشیا اور عرب دنیا میں بہت طاقتور بادشاہ موجود تھے۔ کیمرہ تو تھا نہیں تو ایسے میں ہر قوم کے اپنے مصور ہوتے تھے جیسے ملک الشعراء ہوتے تھے یا گائیک ہوتے تھے یا ہنسانے والے ہوتے تھے۔ بادشاہ کے دربار کو یہ سارے فنون چاہئے تھے۔ ایسے میں مصوروں کی رسائی

بادشاہوں کے حرم اور زنان خانوں تک ہو جاتی تھی۔ بادشاہ اپنی ملکہ کے ساتھ مصور سے تصویریں بنواتے۔ کافی وقت دیتے کہ مصور کئی سیشنز میں اُن کی پورٹریٹ مکمل کریں۔ پھر پورے دربار کو پیش کیا جاتا تھا۔ بعض صورتوں میں جنگوں کے ایکشن سین بھی مصور ہی پینٹ کرتے تھے اور ان کی تخلیقی صلاحیت اتنی زیادہ ہوتی تھی کہ وہ حرکت اور رنگوں کے ساتھ چہروں کے تاثرات کا کوئی لمحہ ضائع نہیں ہونے دیتے تھے۔ ایسے مصور فرانس، جرمنی، روس، انگلستان، بلجیم، آسٹریا، پولینڈ سے لے کر ایشیا اور عرب تک پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے ونودے کہا۔ ''ان سب بادشاہوں کے ذاتی پورٹریٹس یا جنگی سرگرمیوں کی مصوری تو سمجھ میں آتی ہے۔ اس میں ان شہزادیوں کی نیوڈز کی بھی کوئی جگہ تھی؟''

اب جو ونودے نے کہا وہ میں بتا رہی ہوں۔

''مصوروں کی رسائی ملکاؤں اور شہزادیوں کے بیڈروم تک یا زنان خانے تک ہوتی تھی۔ کیونکہ انہوں نے بہت دیر تک کام کرنا ہوتا تھا۔ اور ہر عورت کو اپنی خوبصورتی کو ثابت کرنے کے لئے اس کی ضرورت تھی۔ تا کہ بادشاہ یا شہزادہ اُن سے محبت میں گرفتار رہے۔ اس لئے وہ ہمہ وقت خوبصورت لگنا چاہتی تھیں۔ جن کی صورتیں ذرا اونچی ہوتی تھیں اور جسم چست اور قدبت اچھا تو وہ شہزادوں کی نظروں میں اچھا لگنے کے لئے اپنے جسم کو نمایاں کرنے والے پورٹریٹ بنواتی تھیں۔''

''بات پورٹریٹ سے بڑھتے بڑھتے نیوڈ تک کیسے آئی؟''

اب میں متوجہ ہوئی تو ونودے نے کہا۔ ''وہ ایسے کہ انسان کو خود پسندی کا نفسیاتی عارضہ تو ہر زمانے میں رہا ہے۔ اور ایسی بادشاہتیں جہاں رعایا کے لئے سوچنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی مطلق العنان بادشاہ ہر وقت اپنی عیاشی اور اپنی تفریح کے لئے ہر طرح کا ساز و سامان تیار رکھتے تھے اور اس ساز و سامان میں خوبصورت جسم والی عورتیں سب سے اہم ہوتی تھیں۔ ایسے میں پورٹریٹس میں ہی نیوڈز کا اہتمام ہونے لگا۔ مصور سینے کو نمایاں کرنے لگے۔ بازوؤں اور کولہوں کے ساتھ ٹانگوں کو بھی کچھ کچھ نمایاں کرنے لگے اور پھر آہستہ آہستہ بندِ قبا کھلتے گئے۔ جسم پر نام کے چیتھڑے رہ گئے۔ ایک دن وہ بھی اُتر گئے۔ مگر یہ سب ایک فن کی قدرشناسی کو تسلیم کرتے ہوئے ہوا۔''

یہاں میں چونکی۔ ''اس سے آپ کا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ وہ تو میں فنونِ لطیفہ کی قدردانی میں اتنی اوپر آ چکی تھیں کہ انہوں نے مصوری اور

نیوڈز کو اپنے ذوق کی بلندی کی علامت بنا لیا۔ اس کا ثبوت اُن کے مجسموں کی ایک طویل روایت ہے جو نیوڈز پر مشتمل ہیں اور ہر محل، ہر میوزیم، ہر قلعے، ہر بڑی عمارت کی تزئین و آرائش میں ان کا ایک اہم کردار ہے۔ آپ آج بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اس لئے مجسمہ ساز کے بعد مصور اس فن کی بلندی تک پہنچا اور شروع شروع میں خود بادشاہوں اور شہزادوں نے اپنی محبوباؤں کے نیوڈز بنوائے اور بیڈ رومز کی زینت بنائے۔ اور پھر یہ چلن اُمرا کے طبقے تک پہنچا اور اس آرٹ کو بے حد بلند سطح پر تسلیم کیا جانے لگا کہ اگر چہ سولھویں سترہویں اور پھر اٹھارویں صدی میں یہ فن بادشاہوں اور امراء کے زیر اثر رہا۔ جس طرح ہوتا آیا ہے کہ فن محلوں سے نکل کر پھر عوام کی زندگیوں میں پہنچتا ہے تو جب ان بادشاہوں کو زوال آنے لگا تو یہ فن نیچے منتقل ہونے لگا۔ اس کی ایک مثال لکھنؤ کے حکمران سید واجد علی شاہ کی ہے۔''

ونو دملہوترا فرانس، روس اور آسٹریا سے ہندوستان پہنچ گیا۔ میں پھر چونکی کہ واجد علی شاہ نے کون سی نیوڈ بنوائی تھی۔ مگر وہ بات کچھ اور کر رہے تھے۔

''واجد علی شاہ نے دیکھا کہ عوام کا ذوق بھی بگڑ رہا ہے اور وہ اعلیٰ سطح کی تفریح چاہتے ہیں جو امراء کو حاصل ہے کہ اُمراء بالا خانوں تک رسائی رکھتے ہیں۔ اپنی مرضی کا رقص اور غزل سن سکتے ہیں۔ نیچے بازاروں میں عوام الناس گھنگھروؤں کی جھنکار سے دل بہلاتے ہیں تو اُس نے اس وقت کے ایک ڈرامہ لکھنے والے کو بلایا۔ نام تھا امانت لکھنوی۔ شاعری اور ڈرامے کے فن کو جانتے تھے۔ حکم ہوا کہ ڈرامہ لکھو جسے سٹیج پر پیش کیا جائے گا اور خود نواب واجد علی شاہ اُسے پیش کریں گے۔ کہاں؟ ارے بھئی لکھنؤ کے قیصر باغ میں۔ تو جناب لکھا گیا ڈرامہ جس کا نام تھا ''اِندرِ سبھا'' یعنی راجہ اِندر کی محفل۔ اس میں امانت لکھنوی نے لکھنؤ کے کوٹھے یا بالا خانے کو قیصر باغ کی سٹیج پر لا کھڑا کیا اور عوام الناس کے لئے ایک نہیں بیسیوں مجرے، رقص، کورس اور گائیکی کے تمام اسالیب ایک لڑی میں پرو دیئے۔ کہانی نام کو نہ تھی۔ اگر تھا تو بس رقص و سرود کی محفل تھی۔ نواب واجد علی شاہ لکھنؤ کے آخری زمانے میں یہ کام تو کر گئے قیصر باغ میں یہ کھیلا گیا۔ عوام نے جی بھر کے بالا خانوں کا کلچر دیکھا۔ مگر پھر کیا ہوا؟''

میں چونکی ـــــ ''پھر کیا ہوا؟ ونود.....''

''پھر یہ ہوا کہ نواب واجد علی شاہ نے ذرا دیر کر دی تھی۔ یہ پہلے ہونا چاہئے تھا۔ اب ہوا یہ کہ جب انگریزی فوج دہلی کے بعد لکھنؤ کی طرف گئی تو عوام تو افیون کی پینک میں کہیں گم تھے اور نواب شطرنج کھیل

رہے تھے اور پریم چند کا افسانہ ''شطرنج کے کھلاڑی'' ستیہ جیت رے نے فلم میں ڈھالا ـــــ جو بتاتا ہے کہ انگریزی فوجیں لکھنؤ میں داخل ہو رہی تھیں اور نواب شطرنج کے مُہرے پر ایک دوسرے کو مار رہے تھے۔ ایسے میں نواب واجد علی شاہ کی والدہ حضرت محل نے کچھ مزاحمت کی۔ اور تاریخ میں نام پایا۔ آج بھی لکھنؤ کا مرکزی بازار حضرت محل کے نام سے موسوم ہے۔ لیکن بیٹا نواب واجد علی شاہ کو انگریزوں نے گرفتار کر کے کلکتہ پہنچایا اور میٹا برج ایک ایسی جگہ ہے جہاں سے کلکتہ کا ''ہوڑا برج'' دکھائی دیتا ہے، جو ہُگلی دریا پر ہے، وہاں قید کر دیا۔ یہ ایسی قید تھی جیسی اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے باپ شاہجہاں کو دی اور گرفتار کر کے تاج محل کے بالکل سامنے آگرہ کے قلعے میں قید کر دیا۔ اور جب باپ نے کہا کچھ بچے بھیج دو کہ میں انہیں پڑھا دوں تو بیٹے نے جواب دیا۔ ابھی آپ کے اندر سے خوئے حکمرانی نہیں گئی۔ اب شاہجہاں حسرت سے تاج محل کو دیکھتا ہوا مر گیا۔ ایسے ہی نواب واجد علی شاہ اور بہادر شاہ ظفر کا خاتمہ ہوا ـــــ ایسے ہی تو بی جے پی مسلمانوں کے خلاف شیر بن کر نہیں اُبھری۔ تاریخ کے تابوت میں لاشیں زندہ ہیں اور بی جے پی اُن پر آخری کیل ٹھونکنا چاہتی ہے۔''

ونود کی باتیں میں سن رہی تھی کہ کس طرح اُمرا کا فن بازار میں آتا ہے ـــــ اب ہم دوبارہ فرانس، روس اور برطانیہ کی گلیوں میں چلتے ہیں تو نیوڈز کا فن طوائفوں تک پہنچتا ہے۔ یہاں اگر آپ فلم Titanic کے ہیرو کی نیوڈز کو دیکھیں جو اُس نے پیرس کی طوائفوں کی بنائی تھیں اور پھر اپنی ہیروئن کی نیوڈ بنائی تو آپ کو پاکستان کے اقبال حسین کا آرٹ سمجھ میں آ جائے گا۔

اب میں نے ونود سے سوال کیا کہ ہماری تو بات شروع ہوئی تھی اُمرا اور بادشاہوں کے محلات میں شہزادیوں کے نیوڈ بنانے کی۔ تو بات کو وہاں سے شروع کریں؟

ونود بھی کچھ بھول بھلیوں میں پھنس گیا تھا۔ آخر فنکار کو تاریخ میں گھومنے پھرنے کی عادت تو ہو جاتی ہے۔ پھر وہ گویا ہوا۔

''ایسے میں جب سترھویں اور اٹھارویں صدی میں نیوڈز کی تاریخ کو دیکھتے ہیں تو کئی مصور اپنے برش کے ساتھ سر قلم کرا رہے تھے۔''

''وہ کیسے؟'' اب میرے لئے تجسس بڑھا۔

''وہ ایسے کہ مصور سے اُس شہزادی یا ملکہ کا عشق چل پڑتا تھا کہ مصور خود بھی تو خوبصورت انسان ہوتا تھا یا اُس کے سینے میں بھی دل ہوتا تھا۔ تو ایسے میں ادھیڑ عمر بادشاہ کی نئی نویلی محبوبہ کا دل مصور پہ آ جاتا تھا اور نیوڈ

بناتے ہوئے وہ مصور کو اپنا لیتی تھی۔ ایسے میں آنکھ مچولی بھی چلتی تھی کہ اُمراء اور بادشاہوں نے اپنا جاسوسی نظام بھی رکھا ہوتا تھا۔ اس لئے اگر تو اس جاسوسی کے جال کو توڑنے والی شہزادیاں اپنے عشق میں کامیاب بھی ہو جاتی تھیں تو کسی نہ کسی دن ذرا سی غفلت سے بھانڈا پھوٹ جاتا تھا اور ایسے بہت سے واقعات میں سزا مصور کو ملتی تھی۔ اور شہنشاہ یا شہزادے اپنی شہزادی یا محبوبہ کو بچا لیتے تھے۔ اور مصور کی سزا موت سے کم نہیں ہوتی تھی یا اس کے ہاتھ کٹوا کر ہمیشہ کے لئے عبرت کا نشان بنا دیا جاتا تھا۔

ونود کی باتوں میں پتہ ہی نہ چلا کہ لنچ کا وقت ہو گیا۔ مگر وہ کچھ اور بتانا چاہتا تھا۔ اس لئے اس کے سٹوڈیو کے مینیجر نے ہمارے لنچ کا وہیں انتظام کر دیا۔ وائین، بیئر وغیرہ کا چوائس تھا۔ پھر کئی کورسز میں کھانا قریب کے اٹالین ریسٹورنٹ سے منگایا گیا۔ اب ونود ہندوستان کی اشرافیہ پر آ چکا تھا۔ میرے لئے یہ باتیں سنی سنائی بھی نہیں تھیں۔ ان باتوں کو سننے کے بعد مجھے اُس کی جرأت سمجھ میں آئی جو اُس نے میری نیوڈ بنانے کی خواہش کی تھی۔ ونود مجھے جو بات بتانا چاہتا تھا اُس کے لئے اس نے نیوڈز کی ہسٹری میں جانا ضروری سمجھا تھا۔ اب وہ اصل بات پر آیا۔

"یہ جو ہندوستان ہے۔ دنیا اسے غریبوں کا ملک سمجھتی ہے اور دنیا کو یہ تاثر ہماری حکومتوں نے جان بوجھ کر دے رکھا ہے۔ اور اس میں حکومتیں بالی وڈ کی فلموں کو بھی استعمال کر رہی ہیں۔"

"وہ کیوں؟ اس سے انہیں کیا حاصل ہوتا ہے؟" میں نے ایسے ہی بات بڑھائی۔

"اس سے دنیا سے فنڈنگ ملتی ہے۔ این جی اوز کا کلچر اسی سے آگے بڑھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اُن کی ٹورسٹ انڈسٹری کے لئے بہت کچھ بیچنے کے لئے سامان حاصل ہو جاتا ہے۔ آپ تو اکیسویں صدی میں ہندوستان میں داخل ہوئی ہیں۔ ذرا پچھلی صدی کے آخر میں چلتے ہیں۔ 1990ء کی نئی دہلی آپ کو دکھاتا ہوں ــــ کناٹ پیلس سے لے کر امراء اور اشرافیہ کی نئی دہلی کی طرف جاتے ہیں۔ لودھی گارڈن کے اطراف میں، پارلیمنٹ اور انڈیا گیٹ کے اطراف میں، خان مارکیٹ جو ہندوستان کی بیوروکریسی کا مرکز ہے۔ اور پھر دنیا بھر کے سفارت خانوں کے اطراف کے فٹ پاتھوں پر ایک بدصورت سیٹ لگا ہوا تھا۔ اور یہ سیٹ انڈیا کو شوکیس کرنے کے لیے لگایا گیا تھا۔ جہاں جھونپڑپٹی طرح طرح کے انسانیت سوز مناظر کے ساتھ چیتھڑوں میں ہر عمر کے بچوں اور بوڑھیوں کے ساتھ موجود ہوتی تھی۔ اور وہ ساری مخلوق سڑک پر جب ٹریفک سگنلز پر ٹریفک رکتی تھی وہ دوڑ کے آ کر سڑک پر آ جاتے اور ایک منظر بن جاتا تھا۔ اس پر انہوں نے فلم "ٹریفک

سگنل" بنائی جو اسی مسئلے پر تھی۔ ایسے ہی بمبئی جواب ممبئی نہیں بنا تھا، وہ تو پوری دنیا کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی تھا۔ چرچ گیٹ سے لے کر ہر امیر علاقے تک غریبوں کی بستیاں آباد تھیں اور وہ ہندوستان کی حکومتوں نے خوب بیچیں۔ بالی وڈ اُس کے شانہ بشانہ کام کرتا رہا اور وہ ایسی فلمیں بناتا رہا جس سے انڈیا کی غربت دنیا میں عام ہو جائے اور وہ عام ہو گئی۔ ایسے میں ایک امریکی نے اس سے فائدہ اٹھایا اور اس غربت کو بالی وڈ پر بیچا۔ فلم بنائی جس کا نام تھا Slumdog Millionaire۔ اس کا میوزک اُس وقت کے بڑے موسیقار اے آر رحمان کو دیا گیا۔ اور اُسے آسکر ایوارڈ بھی دلوا دیا گیا۔ یہ سب کچھ طے شدہ تھا اور امیتابھ بچن اور دوسرے اداکاروں کو عزت دے دی گئی۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ ہندوستان دنیا کا واحد ملک ہے جو اپنی غربت کی تجارت کامیابی سے کرتا ہے۔"

"تو پھر 1990ء کے بعد نئی دہلی میں فٹ پاتھوں پر جب غربت سجائی گئی تھی یا بمبئی کے خوبصورت علاقوں کے آس پاس وہ بستیاں بسائی گئی تھیں، اُن کا کیا ہوا؟ کہ آج نئی دہلی بے حد خوبصورت ہے۔"

"حکومت نے اور ملٹی نیشنل کمپنیوں نے غربت کا سیٹ لگایا ہوا تھا۔ جب مطلوبہ نتائج حاصل ہو گئے تو دلی کے فٹ پاتھوں اور ریلوے سٹیشن سے وہ سیٹ ہٹا دیئے گئے اور ایک اور دور شروع ہو گیا۔ Shining India —— Incredible وغیرہ وغیرہ۔"

"تو پھر دنیا کو انڈیا کس طرح شوکیس کیا گیا ہے؟"

"سب سے پہلے انڈیا نے اپنے مرکزی ائیر پورٹس سٹیٹ آف آرٹ بنائے۔ دلی کا اندرا گاندھی ائیر پورٹ آپ دیکھ چکی ہیں۔ ممبئی کا نیا ائیر پورٹ دنیا کے لئے عجوبہ ہے۔ اس میں جو انڈین آرٹ کی آرائش کی گئی ہے اس سے انڈیا شوکیس ہو جاتا ہے۔ دنیا جہان کا ٹورسٹ وہاں اترتا ہے اور پھر انڈیا کے پاس بیچنے کے لئے بہت کچھ ہے۔ مسلمانوں کی ساری تاریخ، کلچر، محلات اور قلعے، پھر اپنا مذہب بندروں سمیت بیچنا آتا ہے۔ پھر بدلتا ہوا لینڈ اسکیپ راجستھان سے کلکتہ تک اور پھر ساؤتھ تک بکھری ہوئی ہیرٹیج، یہ سب بکنے لگا۔ تب دنیا کو معلوم ہوا جسے وہ غریب انڈیا سمجھتے تھے وہ پہلے بھی انگریز کے لئے سونے کی کان تھی اور آج بھی ہے۔"

"دنیا کے امیر ترین خاندان یہاں پر ہیں۔ جو بالی وڈ سٹارز کو کروڑوں روپے ادا کر کے بیٹیوں کی شادی کی رونق بڑھاتے ہیں۔"

''بس آگے سب آپ جانتی ہیں۔ اب جو آپ نہیں جانتیں وہ بتاتا ہوں کہ یہاں سے راجے، مہاراجے، نواب، شہزادے، ٹھاکر، راجپوت اور کنور نام کے سب میر وزیر بساط لپیٹ کر چلے گئے۔ مگر اپنی روحیں، ٹاٹا، برلا، امبانی، لعلوانی اور اُن کے سائے میں پلنے والے بے شمار اور کمپنیوں کے مالکوں میں چھوڑ گئے۔ راجواڑے نہ رہے مگر وہ اپنی جگہ کئی ملٹی نیشنل راجواڑوں کو جنم دے گئے۔ اس لئے انہیں بھی شوق چرایا کہ وہ اپنے اپنے محل نما بنگلوں اور فارم ہاؤسز میں راجوں مہاراجوں کی طرح زندگی گذاریں۔ تو ایسے میں مصوروں کی ضرورت پڑی۔ پہلی سطح پر تو ایم ایف حسین، ستیش گجرال، چغتائی اور بہت سے دوسرے انڈین مصوروں کی بے حد قیمتی پینٹنگز اور فیملی پورٹریٹس اپنے بنگلوں میں لگوائیں۔ پوری انڈین ہسٹری کو اپنا Pride بنا کر انہوں نے راجوں مہاراجوں کی طرح اپنے بنگلوں میں مختلف جگہوں پر آویزاں کیا۔ جس طرح راجے شیر کا شکار کر کے اپنی بندوق اور خاندانی کاسٹیوم کے ساتھ اپنی فضول سی مونچھوں کو چمکا کر شیر کے اوپر پاؤں رکھ کر تصویر بنواتے تھے۔ بالکل ایسے ہی ان نئے راجوں نے بھی اسی طرح کی حرکتیں کیں اور شیر تو نہ مل سکا مگر اپنی اُمپائر کے ساتھ اپنی تصویریں بنوائیں۔ خاص طور پر ہالی وڈ، بالی وڈ اداکاراؤں اور دنیا کے بڑے سیاستدانوں، رائٹرز اور Celebrities کے ساتھ تصویریں اپنے بنگلوں میں لگوائیں۔ یہاں تک تو بات ٹھیک تھی۔ اب آگے بات بڑھی تو نوابوں کے شوق سامنے آنے لگے۔ ان میں سے ایک شوق جو انگلستان، فرانس، بلجیم، روس اور یورپ کے بادشاہوں کا تھا۔ جس کا ذکر ہو چکا ہے کہ وہ اپنے بیڈ رومز میں اپنی شہزادیوں یا محبوباؤں کی پورٹریٹ سجاتے تھے۔ اور وہاں سے ان شہزادیوں یا محبوباؤں کی نیوڈز نے جنم لیا۔ تو ایسے میں ہندوستان میں میرے جیسے نیوڈ پینٹر کا کام چل نکلا۔ یہ جو کچھ تم دیکھ رہی ہو بینگلور میں میرا اسٹوڈیو، میرا گھر، میری حیثیت وہ سب کچھ ان دو نمبر راجوں مہاراجوں کی وجہ سے ہے۔''

''میں انہیں دو نمبر نہیں کہوں گی کہ میں اتنا جانتی ہوں کہ جس طرح پارٹیشن سے پہلے نواز شریف فیملی کے سربراہ میاں شریف جاتی عمرہ میں ایک لوہار تھے، یعنی گھوڑے کے سُم بناتے تھے۔ پاکستان آکر اتفاق فونڈری کے مالک اور پھر بے شمار انڈسٹریز کے مالک بنے اور پھر دنیا بھر میں کاروبار کے حوالے سے سیاست اور حکومت کو استعمال کر کے کہاں سے کہاں پہنچ گئے تو ایسا ہی آپ کے ٹاٹا، برلا اور امبانی نے بھی کیا ہوگا۔ اگر نہیں بھی کیا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ میرا مطلب ہے انڈو پاک کی کاروباری تاریخ تو ایک جیسی ہے۔''

''ہاں مگر کاروباری تاریخ تو ایک جیسی ہے مگر انڈیا کی جمالیاتی تاریخ مختلف ہے۔ یعنی یہاں اگر امبانی نے دولت کے پہاڑ لگائے ہیں تو اس کی کئی طرح کی فلاحی تنظیمیں بھی ہیں اور وہ دولت کے بہاؤ کو نیچے تک لے جانے کا موقع بھی ضائع نہیں کرنا چاہتے۔ بیٹی کی شادی کا موقع ہی کیوں نہ ہو۔''

''لیکن بات تو امراء کی خواتین کی نیوڈز کی ہو رہی تھی۔''

''ہاں تو ہندوستان میں اُمراء کا طبقہ انہی راجوں مہاراجوں کے نقشِ قدم پر چلا اور انہوں نے بھی فیملی پورٹریٹس کے بعد اپنی محبوباؤں اور بیویوں کی نیوڈز بنوانا شروع کر دیں۔ میں نے کئی گھرانوں کی نیوڈز بنائی ہیں اور بہت سے راز بھی میرے پاس ہیں۔''

''مثلاً____''

''مثلاً بھی نہیں بتا سکتا۔ کہ ہر آرٹسٹ کے پروفیشن کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔''

''پھر بھی اشارے میں ہی سہی۔''

''تم جانتی ہو گی۔ ''پاپارازی'' کسے کہتے ہیں؟''

''ہاں جانتی ہوں۔ وہ جرنلسٹ جو مشہور لوگوں کا چھپ کر پیچھا کر کے ان کی ذاتی زندگی کے سکینڈل جمع کر کے اپنے چینل اور اخباروں کا پیٹ بھرتے ہیں۔ جن کی وجہ سے لیڈی ڈیانا کا حادثہ ہوا تھا____''

''تو اب یہ بھی جان لیں کہ ہندوستان میں یہ پاپارازی بہت مضبوط ہے۔ اب ایسے میں جو باتیں میں بتاؤں گا سوچ لو وہ کتنی مشکل ہوں گی۔''

''میں سمجھ رہی ہوں۔ آپ صرف اشاروں میں بات کریں۔ میں سمجھ جاؤں گی۔''

''بالی وڈ کے دو تین بڑے سٹارز کے ساتھ ان امراء کی بیٹیوں اور بیویوں کے باقاعدہ مراسم ہیں۔ اور سوچ سکتی ہو کہ وہ آپس میں کیسے ملتے ہوں گے کہ ذرا سی خبر بھی باہر نہ آ سکے۔''

''یہ رازداری کا آرٹ شاید میں نہیں جانتی۔ تھوڑا سا بتا دیں۔''

''صرف ایک واقعہ بتاتا ہوں کہ جیسے چاول کا ایک دانہ چکھ کر پوری دیگ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس واقعے سے آپ باقی کہانیاں سمجھ جائیں گی۔''

''سمجھ گئی۔ پلیز ارشاد فرمایئے۔''

''تو جناب بات یوں ہے کہ پھر اردو ادب کی داستان سامنے آ گئی ہے۔ جو میں نے بہت پڑھ رکھی

ہیں اور اسی شہر میں ایک تھیٹر کا گرو رہتا ہے، میرا گرو ہے۔''

''میں جانتی ہوں گریش کرناڈ اور وہ انتظار حسین کا بھی دوست ہے۔''

''تو پھر گریش کرناڈ نے ہندو مائیتھولوجی کی ایک کہانی ''بکرم بے تال'' سے لے کر ناٹک کیا۔ وہ کہانی انتظار حسین نے بھی لکھی تھی۔ اس پر دونوں کی دوستی ہو گئی تھی۔''

''ہاں، انتظار حسین کی یہ کہانی میں نے پڑھی ہے۔''

''تو پھر اب بات کو میں پردے سے باہر لاتا ہوں۔ تو جیسے ایک داستان میں لکھا ہے کہ شہزادی اپنے عاشق سے ملنے کے لئے بیتاب تھی تو اُس نے محل سے جنگل تک سرنگ کھدوائی۔ اور ایک خواجہ سرا کے ذریعے شام کے بعد اپنے عاشق کو اس سرنگ سے محل میں لانے کا حکم دیا۔ اور روزانہ وہ عاشق کہ سیاہ فام افریقی تھا۔ کسرتی جسم اور مردانہ اوصاف کی آئیڈیل تصویر تھا۔ خواب گاہ میں داخل ہوتا اور پھر شراب و شباب کی محفل چلتی۔ شراب کے جام لنڈھائے جاتے اور ناؤ نوش کا کاروبار اپنے عروج تک پہنچتا اور جب فجر کی اذان ہوتی تو وہ محل سے باہر چلا جاتا۔ اس میں اے مسلمانو فجر کی اذان بے حد اہم ہے جو داستان گو نے جانے کیوں لکھ دی ہے۔''

''مجھے معلوم ہے کہ کیوں لکھی ہے کہ داستانیں مسلمانوں کی ثقافت کے مطابق لکھی گئی تھیں۔ اس میں یہ سارے عناصر شامل ہوتے تھے۔ مسلمانوں نے اس کلچر اور دیگر مشاغل کو چوری چھپے اپنا رکھا ہے۔''

''آپ نے خود ہی بات مکمل کر دی تو اب میں بتاتا ہوں کہ بالی وڈ کا ایک سپر سٹار ایک بے حد مشہور خاندان کی بہو سے ایک دن اور ایک رات گذارنے کے لئے کیا انتظام کرتا تھا۔''

''یہ تو مجھے سننا ہے۔''

''مجھے معلوم ہے یہ کہانی آپ ضرور سنیں گی۔ اب یوں ہے کہ وہ بڑے خاندان کی بہو کہ خود بھی بڑے خاندان سے تھی۔ اور شادی تو ایک کاروبار کی دوسرے کاروبار سے ہوتی تھی اس لئے جب اُس کی شادی پر بالی وڈ کا وہ سٹار کروڑوں روپے لے کر شریک ہوا تھا تو آنکھ تو لگ گئی تھی اور پھر بات شروع ہو گئی اور پھر جو ہوا وہ یہ تھا کہ جہاں جہاں ملک سے باہر اُس سٹار کی شوٹنگ ہوتی تھی، وہ ہالی ڈے کے لئے اپنی دوستوں کے ساتھ خاموشی سے وہاں کے سیون سٹار ہوٹلوں میں پہنچ جاتی تھی۔ دونوں نے اپنے اپنے سیکرٹ موبائل فون نمبر رکھ لئے تھے۔ ''پاپارازی'' سے احتیاط بے حد ضروری تھی۔ اب اُس امیر ترین بہو کی دوست لڑکیاں جو اُس کے

خرچے پر عیش کر رہی تھیں، اُس کی رازدار بن چکی تھیں اور وہ خود بھی کسی سے کم نہیں تھیں۔ وہ بھی اچھے بزنس فیملی کی لڑکیاں تھیں۔ اُن کے اپنے افیئر تھے تو اُن کے عاشق بھی کچھ تو ہندوستان سے اور کچھ یورپ، امریکہ سے آجاتے تھے تو یوں ایک انڈر گراؤنڈ کلب چلتا رہتا تھا۔ وہ سپر سٹار بہت محتاط تھا اور اصل میں اس کی بیوی نے بھی اُس پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ اب وہ سپر سٹار تمام تر احتیاط کرتے ہوئے کبھی رات کے دو بجے کبھی صبح چار بجے اور اسی طرح کے اوقات میں اپنی ملاقاتیں اُس امیر ترین بہو کے ساتھ پلان کرتا رہتا تھا۔ اور معاملہ بہت زیادہ سامنے نہیں آسکا تھا —— نہ ہی ہندوستان کے میڈیا کو اس کی بھنک پڑی تھی۔ ہندوستانی میڈیا بے حد لالچی، بے رحم، اخلاقی قدروں سے فارغ اور انتہائی بے شرم پہلے دن سے تھا اور آج بھی ہے۔ اس لئے وہ اپنی ماں، بہن، بیوی، باپ اور بھائی کے سکینڈل کو بھی مارکیٹ کرنے سے نہیں کتراتا۔ بھڑوے کو صرف پیسہ چاہئے۔"

ونود ملہوترا اب حقیقت بتانے لگا تھا۔ میں سن رہی تھی اور سُن ہو رہی تھی —— تو وہ بولے جا رہا تھا۔

"تو ایسے میں میڈیا کی اپنی پاپارازی جرنلزم ہمہ وقت سرگرم رہتی ہے۔ ایک ذہین پاپارازی کو کسی نے ایک ٹپ دی کہ یہ سپر سٹار جب بھی دنیا میں کہیں شوٹنگ یا شو یا کسی وجہ سے جاتا ہے تو اُنہی تاریخوں میں یہ امیر ترین بہو اپنی دوستوں کے ساتھ ٹریول کرتی ہے اور سیون سٹار میں اُن کے کمرے بک ہوتے ہیں۔ اب اس ٹپ نے کام کیا اور پاپارازی جرنلسٹ نے دونوں کی ٹریول ہسٹری کا تجزیہ کیا اور پھر وہ ساتھ میں ٹریول کرنے لگا کہ کچھ پانے کے لئے خرچ کرنا پڑتا ہے۔"

"مجھے تو "پاپارازی" نے قائل کر لیا ہے کہ وہ جو محنت کرتے ہیں، انعام اُن کا حق ہے۔"

"ہاں مگر وہ دوسروں کی ذاتی زندگی میں شدید مداخلت کرتے ہیں جو اخلاقی طور پر بے حد ناقابل برداشت ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ پھر ——"

"پھر یہ ہوا کہ پاپارازی نے ایک لوکیشن پر ڈیرے ڈال دیئے۔ کیمرے دن رات کے لئے فکس ہو گئے اور پھر وہ کامیاب ہو گیا۔ اُس نے اُن دونوں کی ملاقات اور اُن کی سیون سٹار کے کمرے میں سیکرٹ وڈیو بنالی۔ جو ہوٹل کے کچھ ویٹرز اور ماڈرن ٹیکنالوجی کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ اس کی تفصیل میں ہمیں نہیں جانا چاہئے۔"

''ہاں یہ میں بھی سوچ رہی تھی۔''

''تو یہ ہوا کہ وہ سیکرٹ فوٹو اور ویڈیو جب اُس ''پاپارازی'' چینل کے پاس تیار ہوگئی، جس پر اُس کا کُل خرچہ ڈھائی لاکھ روپے صرف ہوا تھا۔ تو اُس نے سب سے پہلے اپنی ترجیح کے حساب سے بالی وڈ سپر سٹار کو بلیک میل کرنے کے لئے رابطہ کیا۔ سپر سٹار کا ماتھا ٹھنکا۔ مگر وہ عادی مجرم تھا اُسے بلیک میل ہونے کی عادت نہیں تھی۔ ہاں صرف وہ سپر سٹار بمبئی انڈر ورلڈ یا بال ٹھاکرے سے بلیک میل ہوتا تھا اور ان کو منہ مانگی قیمت ادا کرتا تھا۔ اب اُس کی عزت کا رسک امیر ترین بہو سے کم تھا۔ اس لئے اُس نے ''پاپارازی چینل'' کو بے عزت کر کے بھگا دیا۔ کیونکہ اُسے صرف اپنی بیگم کے سامنے جوابدہ ہونا تھا۔ باقی دنیا میں تو اُس کی عزت ہی بنی تھی تو اس نے بیگم کو بتا دیا کہ میں نے اس عورت سے کروڑوں روپے کسی نہ کسی طرح حاصل کئے ہیں اور جو کچھ ویڈیو میں ہے اُسے تم ایکٹنگ سمجھو۔ یہ میری پرفارمنس ہے جس کے میں پیسے لیتا ہوں۔ بیوی مطمئن ہوئی یا نہیں مگر خاموش ضرور ہوگئی۔

اب وہ پاپارازی چینل اپنے صحیح ٹارگٹ پر پہنچا اور ہندوستان کے امیر ترین آدمی کی بہو کا سکینڈل لے کر سیدھا اُس کے پاس پہنچا۔ ظاہر ہے براہِ راست تو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اُس نے اپنے کارڈز دکھائے اور اُس فیملی کو مجبور کیا کہ وہ بلیک میل ٹیبل پر آئے۔ اور وہ آ گئے۔ انہوں نے سب دیکھا۔ ٹریول ہسٹری دیکھی اور پھر خود ان کی سمجھ میں بھی آیا کہ ان کی بہو کس کس طرح سے فائدہ اٹھا کر ہالی ڈے ٹرپ پلان کرتی تھی۔ اب اُس امیر ترین گھرانے کا بیٹا جو بیوی کے قریب بس ایسے جاتا تھا جیسے اُسے ٹیکس بچانا ہے، تو ایسے میں وہ بہو سے کیا گلہ کرتے۔ انہوں نے اپنی فیملی ساکھ اور عزت کو بچانے کے لئے اُس ''پاپارازی چینل'' کو کروڑوں بلکہ اربوں روپے دے دیئے۔ اور سارے ثبوت حاصل کر لئے۔ معاملہ ختم تو ہو گیا مگر خوف اس فیملی پر طاری رہا۔ ''پاپارازی جرنلسٹ'' وہ کام چھوڑ کر دوبئی میں شاندار زندگی گذار رہا ہے''——

''اُسے ایسا ہی کرنا چاہئے تھا۔''

اب جو میں نے دیکھا تو ونود ملہوترا وہاں نہیں تھا۔ وہ کیسے میرے کمرے میں آیا کیسے گیا۔ میں تو سوچ ہی رہی تھی کہ ونود سے کافی کا پوچھوں مگر وہ کیسے آیا۔ نہ ویزا نہ ٹکٹ وہ اتنا وقت گذار گیا۔ میرے خواب سے باہر آیا تھا یا میرے خیال میں اس نے جنم لیا تھا۔ اب میں کسی بھی وقت آنس کی طرح زمانوں سے آزاد ہو رہی تھی۔ یہ میری ذاتی کوشش تھی یا میرے ساتھ خود بخود ایسا ہو رہا تھا۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے آنس کے زمانوں

میں جو ترتیب بدلی ہے تو میرے زمانوں نے اُسے شاید دیکھ لیا ہو اور انہوں نے بھی آنکھ مچولی شروع کر دی ہو۔ ونود ملہوترا مجھے سارا تجربہ بتا گیا۔ جو میری یادداشت میں کہیں اِدھر اُدھر ہو گیا تھا۔ آنس کے سامنے میں جا کر بیٹھ گئی۔ میں کہاں تھی اُسے معلوم نہیں تھا۔ میں ونود ملہوترا کے ساتھ تھی وہ نہیں جانتے تھے۔ ایسے ہی اب مجھے اپنا ایک اور عاشق یاد آ گیا۔ مگر میں نے اُسے اجازت نہیں دی۔ وہ بھی آنا چاہتا تھا۔ آنس کتاب پڑھتے پڑھتے بولے۔ ''ابھی تو تم یہاں تھیں اور پھر کہاں چلی گئی تھیں؟''

''تو پھر میں ایک پل میں آ بھی تو گئی ہوں ـــــ ہاں میں گئی ہی نہیں۔ جو ہوا یہیں بیٹھے بیٹھے ہوا۔''

''کیا ہوا؟ یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں'' ـــــ

''ایک پل کی بات کیا ہو سکتی ہے۔ کیا وہ بتائی جا سکتی ہے؟''

''ہاں، یہ تو ہے۔ اب تمہیں پتہ ہے اس ایک پل میں میرے ساتھ کیا ہوا ہے؟''

''نہیں معلوم۔ کیا ہوا ہے؟''

''ہوا یہ کہ اس ایک پل میں ذوالفقار علی بھٹو آئے تھے اور کہنے لگے تم سب لوگوں نے مجھے شہید تو لکھ دیا، مگر کسی نے نہ تو جیل کے ایام میں میرے لئے کچھ کیا نہ ہی سڑکوں پر کوئی نکلا۔ میں نے بتایا کہ سندھ میں لوگوں نے بہت ماریں کھائیں۔ شاہی قلعے میں کئی نوجوان یا تو پاگل ہو گئے یا مار دیئے گئے۔ بھٹو صاحب آپ تک یہ باتیں کس نے پہنچانی تھیں۔ اچھا ہوا آپ آ گئے تو بتا رہا ہوں کہ ضیاء الحق کے مارشل لا کو امریکہ اور یورپی ممالک نے طاقت دے رکھی تھی کیونکہ اُن کے اُس سے مفادات تھے۔ آپ کہتے تھے ناں کہ میری موت پر ہمالیہ کے پہاڑ روئیں گے۔ وہ پہاڑ روئے تھے۔ مگر کب یہ آپ کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہے۔''

اس پر بھٹو صاحب چونکے۔ تو میں نے کہا۔ ''حضرت وہ روئے جب طالبان نے افغانستان اور پاکستان کی اینٹ سے اینٹ بجانے کی پوری کوشش کی۔ تب سارے پہاڑ روئے تھے۔ جب پاکستان کے گلی کوچوں میں خودکش حملہ آوروں نے کسی عمارت کو نہ چھوڑا۔ کسی علاقے کو نہ چھوڑا۔ حضور آپ کو اب بتانا ہے کہ آپ کی شہادت کے بدلے ضیاء الحق کو کیا کچھ ملا۔ پورے گیارہ سال پاکستان کو اندھیروں کے حوالے کرنے اور روشن خیالی کا راستہ روکنے کے لیے ملے۔ انہیں جو انعام چاہئے تھا وہ معمولی قسم کے ڈالر نہیں تھے۔ ایک ملک افغانستان کو ہمیشہ کے لئے دلدل میں ڈالنا تھا اور پاکستان کے مستقبل کو قابو کرنا تھا۔ تو انڈیا کو ایشین ٹائیگر بنانے کے لئے Walkover دینا تھا۔ اور ایسا سکرپٹ میں لکھا جا چکا تھا۔ جناب بھٹو صاحب جب آپ نے

راولپنڈی کے بازار میں گاڑی میں عوام کے سامنے آ کر یو۔این کی قرارداد کی کاپی پھاڑی تھی اور پاکستانی عوام نے تالیاں بجائی تھیں۔ وہ تالیاں پاکستانی عوام کو مہنگی پڑی تھیں کہ انہیں آج تک بھٹو صاحب جیسا لیڈر نصیب نہیں ہوسکا۔''

میں نے دیکھا کہ بھٹو صاحب نے پہلو بدلا، مسکرائے اور کہا ـــــ ''واقعی آپ ایک سچے تاریخ دان ہیں تو میں آپ پر یقین کراوں۔''

''ہاں کرلیں ـــــ آپ شہید ہوئے تھے اور آپ پوری دنیا کے نئے ورلڈ آرڈر میں ایک عظیم پوزیشن حاصل کر چکے ہیں۔ وہ ایسے کہ امریکہ کو اپنے لئے نائن الیون کو دعوت دینے کے لئے افغانستان میں جو کھیل کھیلنا تھا اُس کے لئے بھٹو کو شہید کرنا ضروری تھا اور ضیاء الحق کو بٹھانا ضروری تھا اور پھر کام ہونے کے بعد آموں کی پیٹیوں سمیت اور اپنے سفیر سمیت ضیاء الحق کو فضا ہی میں اڑانا بھی ضروری تھا۔ سکرپٹ کبھی کبھی لکھے جاتے ہیں کبھی کبھی دماغ میں نازل ہوتے ہیں۔ تو بھٹو صاحب پھر جو ہوا وہ تو ہونا تھا کہ اس خطے میں امریکہ کو داخل بھی ہونا تھا اور بالآخر دلدل میں بھی پھنسنا تھا۔ روس تو جانے کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔ رشید دوستم، احمد شاہ مسعود اور اُن جیسے روشن خیال نظریات کے لیڈر اپنی اپنی ریاستوں میں محصور ہو گئے اور پھر مارے گئے کیونکہ روس کے جانے کے بعد امریکہ نے یہ ٹاسک ضیاء الحق کو دے دیا جس نے پہلے پاکستان سے ترقی پسند اور روشن خیال سیاستدانوں اور دانشوروں کو اپنے طور پر بالتسلسل ملک بدر کیا اور وہ بھول گیا کہ اُسی آرمی کے پچانوے ہزار فوجیوں کو بھٹو صاحب آپ نے چھڑایا تھا۔ پھر کیا ہوا؟ پاکستان میں نیا کارپوریٹ کلچر آ گیا۔ جیسا انڈیا میں آیا تو کیا یہ دونوں ملک اس کلچر نے یرغمال کر لیے ہیں؟''

''میری شہادت کے بعد یہ سب کچھ ہوا ہے؟'' بھٹو صاحب حیران ہو کر بولے۔

''بھٹو صاحب اب آ ہی گئے ہیں تو پورا اسکرین پلے تو دیکھتے جائیں کہ فلم تو ابھی شروع ہوئی ہے۔ آپ کے جانے کے بعد ملک میں ایک مذہبی جماعت کے لے پالک دانشوروں نے تعلیم، ثقافت اور ادب و معاشرت کے اداروں پر قبضہ کیا اور ملک میں دولے شاہ کی فیکٹری لگ گئی۔ پاکستان آہستہ آہستہ ذہنی پامالی کی دلدل میں گرتا چلا گیا اور اب گر چکا ہے۔ لیکن افغانستان میں طالبان کی حکومت ضیاء الحق کی سربراہی میں ہی تو

گئی۔ مگر امریکہ روس کو نکال کر یہ سمجھ رہا تھا کہ افغانستان اب اُس کی گود میں آ گیا ہے۔ گود بدلتی رہتی ہے وہاں پر اسلامی ملکوں کا کھیل شروع ہو گیا تھا۔ اور ضیاء الحق ڈالر سمیٹ کر فضا میں پھٹ چکا تھا۔ اور پھر طالبان نے ایک نائن الیون کی تیاری شروع کر دی ـــــ پاکستانی فوج کو نہیں معلوم تھا۔ امریکہ اپنی ہی پالیسی کے جال میں پھنس جائے گا۔ طالبان مضبوط کئے گئے اور ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ وہ جدید ترین ہتھیاروں، اسلحے، آئی ٹی انجینئرنگ اور مالی وسائل میں کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔ اس میں سعودی عرب اور ایران کے آپس کے اختلافات نے خوب گُل کھلائے اور عراق بھی اپنا رول نبھا رہا تھا ـــــ اور پھر بھٹو صاحب کیا ہوا؟ میں نے مڑ کر دیکھا تو بھٹو جا چکے تھے۔ یہ صرف ایک پل کی واردات ہے۔ حالانکہ میں بتانا چاہتا تھا کہ نائن الیون کے بعد کیا ہوا؟ پاکستانی فوج لاشیں اٹھانے میں مصروف ہو گئی اور لینڈ مافیا سرگرم ہو گیا۔ پورا ملک اور اس کی زمینیں رئیل سٹیٹ میں تبدیل ہونے لگیں اور ابھی تک تبدیل ہو رہی ہیں۔"

آنس پل کے پل میں کہیں بھی چلے جاتے تھے اور اب میں بھی چلی جاتی تھی۔ لیکن میرا معاملہ عمر کی طوالت کا نہیں تھا۔ یہ میری داخلی کیفیت تھی ـــــ اور یہ بہت گہری تھی۔ اب جو میں نے آنس کو لاؤنج میں چائے دی تو کہنے لگے۔ "سنو شعیب ہاشمی ابھی آیا تھا۔ وہ تو بہت کچھ کہہ گیا ہے۔"

اب میں چونکی کہ شعیب ہاشمی کو بستر سے لگے تو دس سال ہونے کو آئے ہیں۔ اُن پر دماغی فالج اُترا تھا اور وہ بستر پہ ہیں۔ سلیمہ ہاشمی نے تین شفٹوں میں ان کی دیکھ بھال کے لئے عملہ متعین کر رکھا ہے۔ خود اُن کا بیٹا یاسر ہاشمی، بیٹی میرا ہاشمی ہر وقت والد کی تیمارداری کے لئے موجود رہتے ہیں۔ فیض کے داماد شعیب ہاشمی نے کمال کیا تھا۔ پاکستان ٹیلی وژن کو ذہانت کی معراج پر پہنچانے کے لئے ایسے طنزیہ سیریل کئے کہ پاکستان کی اونچی سوسائٹی کے تضادات کو بے نقاب کر دیا کہ وہ اندر سے لاہوری تھے۔ شعیب ہاشمی اکنامکس کا پروفیسر جو گورنمنٹ کالج لاہور میں ساری زندگی پڑھاتے رہے۔ لیکن ضیاء الحق کے زمانے میں جیل کاٹی۔ کیوں نہ کاٹتے؟ فیض احمد فیض کے داماد تھے اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور سے کسی پنڈ دادن خان کے معمولی کالج میں تبدیل کر دیئے گئے۔ خوش ہو کر گئے۔ وہاں روشنی پھیلائی۔ پھر واپس آئے اور گورنمنٹ کالج کے عظیم ٹاور کے نیچے اپنی گدڑی پہن کر طلباء کو علم دینے لگے۔ پی ٹی وی میں اُن کے خیالات پر پروگرام ہوئے۔ جن میں "اکڑ بکڑ"، "سچ گپ"، "بلیلہ" نے پاکستانی گھرانوں میں نیا احساس پیدا کر دیا۔ اور نئے دور میں بھی جب لولی لنگڑی جمہوریت کو فوج نے چلنے کی اجازت دی تو شعیب ہاشمی نے فیض فیسٹیول میں

فیض کے کلام کو آواز دی۔''

''مگر آپ شعیب ہاشمی کو ابھی ملے ہیں۔ وہ کہاں ہیں؟ وہ تو مستقل طور پر بیڈ پر ہوتے ہیں۔'' میں نے صاف بات کر دی۔

''ہاں وہ بیڈ پر ہیں اگر کوئی اُن کو دیکھنے آتا ہے تو اُسے دیکھتے ہوئے رونے لگتے ہیں۔ آنسو آنکھوں سے باہر آ جاتے ہیں جسے نرس صاف کرتی ہے۔ مگر وہ اُس بستر سے بھاگ کر میرے پاس آ جاتے ہیں۔ کسی کو پتہ نہیں چلتا۔''

''کسی کو پتہ نہیں چلتا؟''

''ہاں شعیب پہلے دن سے چالاک آدمی ہے وہ رات کو روزانہ آتا ہے اور بہت سی باتیں کر کے جاتا ہے۔ وہ آیا تو کہنے لگا۔

سب سو رہے تھے۔ میں نے دیکھا سلیمہ جاگ رہی ہے اور عبادت کر رہی ہے۔ وہ عجیب عورت ہے۔ وہ سب سے چھپ کے عبادت کرتی ہے کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔ وہ پہلے بھی کوئی نیکی کرتی تھی تو چھپ کر کرتی تھی۔ اب میں نے دیکھا وہ اللہ کو راضی کر رہی ہے۔ میں اُس کی نظر بچا کر یہاں آتا ہوں۔ مجھے لاہور گھومنے کا بہت شوق ہے۔ اگر آپ میرے ساتھ چلیں تو آج ہم ''کافی ہاؤس'' میں کافی پیتے ہیں۔''

''تو پھر آپ گئے؟''

''ہاں میں اُس کے ساتھ گیا۔ میں نے گاڑی نکالی اور مال روڈ پر شعیب ہاشمی کو لے گیا۔ ہم پاک ٹی ہاؤس کے باہر رُکے۔ دیکھا اندر کوئی نہیں تھا۔ وہاں پاک ٹی ہاؤس کا بیرا الٰہی بخش اکیلا بیٹھا تھا۔ وہ باہر آیا اور اُس نے کاغذوں کا ایک پلندہ شعیب ہاشمی کے ہاتھ میں دے دیا۔ شعیب نے کہا الٰہی بخش کیسے ہو؟ الٰہی بخش نے کہا یہ میں نے شاعری کی ہے۔ کوئی نہیں آتا اس لئے یہ شاعری اتنی زیادہ ہو گئی ہے۔ آپ اسے پڑھ لیں اور کہیں چھپوا دیں۔ پھر شعیب ہاشمی اور میں وہ شاعری لے کر کافی ہاؤس گئے۔ وہاں شاکر علی، ظہور الاخلاق اور نیر علی دادا کے ساتھ عبداللہ ملک بیٹھے تھے اور جب شعیب اور میں پہنچے تو عبداللہ ملک بولے۔ ''شعیب، فیض صاحب کا تمہیں قصہ سناتا ہوں۔''

''تو پھر شعیب ہاشمی نے کیا کہا؟''

''شعیب ہاشمی نے کہا۔ ملک صاحب قصہ مجھے معلوم ہے۔ اس پر عبداللہ ملک غصے میں آ گئے اور

کہا۔"اوئے شعیب! تم تو بچے ہو۔ تمہیں کیا معلوم میں فیض کا کون سا قصہ سنانے لگا ہوں۔ آرام سے بیٹھو۔"

شعیب ہاشمی نے کہا۔"چاچا عبداللہ! آپ بہت گپ لگاتے ہو۔ خدا کے لئے۔ میں اپنے فالج سے بھاگ کے آیا ہوں۔ یہاں بھی آپ اپنی فیض پسندی کو ترقی پسندی پر ترجیح دے رہے ہیں۔"

"اوئے شعیب تم نے میری ترقی پسندی پر شک کیا ہے؟"

"ہاں کیا ہے۔ ملک صاحب آپ نوائے وقت میں لکھتے ہیں۔"

"شعیب اچھا بیٹھ۔ میں صرف تمہیں وہ واقعہ بتاتا ہوں جو ماسکو کی ایک ٹھنڈی رات میں پیش آیا۔"

میں نے شعیب ہاشمی کو قابو کیا کہ یار سن لو۔ یہ چاچا تمہارا کیا کہتا ہے۔ اب عبداللہ ملک بولے۔

"یہ ماسکو کی یخ بستہ رات تھی۔ جب میں پاکستان سے فیض صاحب کے ساتھ نکلا تھا تو میری بیوی بیمار تھی۔ لیکن فیض صاحب کے ساتھ جانے کا ارادہ بھی کرلیا تھا اور وہاں کی کانفرنس میں شرکت کی تیاری بھی تھی۔ ایک دن بعد میری بیوی فوت ہوگئی تو فیض صاحب کو اطلاع دی گئی۔ فیض صاحب میرے کمرے میں آئے اور کہا۔"سامان باندھ لیں کہ آپ کو اگلی فلائٹ سے پاکستان جانا ہے۔"

"میں سمجھ گیا کہ کیا واقعہ ہوا ہے۔" لیکن چاچا عبداللہ ملک تو جیسے حملہ آور ہو گئے۔

"سنو تم داماد ہو فیض کے۔ میں دوست ہوں فیض کا۔ بڑا فرق ہے تیرے اور میرے میں۔ سنو—— اس رات جب مجھے پتہ چل گیا تھا کہ میری بیوی مرچکی ہے اور مجھے اُسے دفنانے کے لئے ماسکو سے لاہور جانا ہے تو فیض میرے ہوٹل کے کمرے میں آئے۔ مجھے پتہ چل گیا کہ وہ کیوں آئے ہیں۔ میں نے اپنے کپڑے سوٹ کیس میں رکھنے شروع کر دیئے اور جب میں تیار ہو گیا تو فیض صاحب مجھے لے کر ایک ایسے شراب خانے میں پہنچے جو ساری رات کھلا رہتا ہے اور وہاں بوڑھے انقلابی ساری رات پیتے ہیں اور زارِ روس کے بت گراتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ صبح سے پہلے زارِ روس پر تے کر کے چلے جاتے ہیں۔

جہاز میں ابھی چھ گھنٹے باقی تھے۔ فیض صاحب مجھے شراب پلاتے رہے تاکہ میرا غم بھی غلط ہو جائے اور وقت بھی کٹ جائے تاکہ میں جہاز میں جا کر گہری نیند سو جاؤں——"

شعیب ہاشمی نے پہلو بدلا اور ملک صاحب سے کہا۔"بس ملک صاحب آپ کا واقعہ ہم پہلے بھی سن چکے ہیں۔ ہم شاکر علی سے ملنے آئے ہیں۔" ہم نے دیکھا وہاں عبداللہ ملک نہیں تھا۔ پتہ نہیں یہ باتیں کون کر

رہا تھا۔ ہم نے شاکر علی سے پوچھا۔ ''آپ فرانس سے کب آئے؟''

''میں تو فرانس ہی میں ہوں۔ یہ تو میری پرچھائیں ہے جس سے نیر علی دادا یہاں آ کر ملتا ہے۔ دیکھو کافی ہاؤس میں کوئی نہیں۔ ہم سب کے سائے ہیں۔''

''تو فرانس میں آپ کہاں بیٹھتے ہیں؟''

''پیرس میں گھومتا ہوں بھائی۔ کبھی بارہویں صدی میں اُن کی عبادت گاہوں میں جا کے بیٹھ جاتا ہوں۔ تو اس زمانے کے مصور آ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ کام کرتے ہیں میں انہیں دیکھتا رہتا ہوں۔ رات کے آخری پہر وہاں کچھ روحیں آتی ہیں۔ وہ مصور اُن کے ساتھ مل کر شراب پیتے ہیں اور کورس گاتے ہیں۔ لگتا ہے بارہویں صدی کا تھیٹر ایسا ہی ہوگا۔

پھر میں تیرہویں صدی کی پتھریلی گلیوں میں چلا جاتا ہوں جہاں بوڑھی طوائفیں مجھے گھیر لیتی ہیں اور کہتی ہیں۔ ہمارے جسم تمہارے لئے ننگے ہیں انہیں کینوس پر اتارو۔ اس کے عوض ایک ڈبل روٹی اور شراب لا دو۔

پھر میں پندرہویں اور سولہویں صدی کے قحبہ خانوں میں چلا جاتا ہوں جہاں نوجوان طوائفوں کے عریاں جسموں کو بہت سے مصور پینٹ کر رہے ہوتے ہیں اور وہاں کسی نہ کسی فٹ پاتھ پر کہانیاں لکھنے والے بھی موجود ہوتے ہیں۔ کہیں شاعر ان طوائفوں پر نظمیں لکھ رہے ہوتے ہیں۔ مجھے ان طوائفوں کے جسموں کے اعضاء جسم سے جدا ہو کر ناچتے ہوئے ایک نئی شناخت میں وجود پاتے محسوس ہوتے ہیں۔

ایک رات جب میں بیسویں صدی کے درمیانی سالوں میں نیشنل آرٹ گیلری کے مرکزی ہال میں داخل ہوا تو ان تصویروں نے اچانک مجھے دیکھ کر بولنا شروع کر دیا۔ ان میں سے سارے کردار باہر آ گئے۔ سارے موسم جو منجمد تھے وہ سب کینوس سے باہر آ گئے۔ مجھے لگا بے شمار پھول درخت ہوا میں جھولتے ہوئے باہر آ گئے ہیں۔ ہر طرف برف گرنے لگی ہے۔ دھند چھا گئی ہے اور اس میں سے ایک شہزادی باہر آ رہی ہے۔ پھر بہت سے سپاہی تلواریں لے کر بارہویں صدی کی وردیاں پہنے اس کو لینے آ گئے ہیں۔ شہزادہ اپنے کٹے سر کے ساتھ آ کر گر جاتا ہے۔ پورے فرانس کی تاریخ ان تصویروں کے کینوس سے باہر آ کر آپس میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ کہیں سے گھوڑے آ رہے ہیں کہیں قلعے کے اندر بغاوت ہوگئی ہے۔ کہیں شہزادی کو سپہ سالار نے گود میں اٹھا رکھا ہے اور اسے چوم رہا ہے۔ ایک گرجا گھر کا پادری ایک چرواہن کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ ایک بادشاہ

کنیز کو گود میں لئے مسکراتا ہے۔ گھوڑے، بھینسے، کتے، بلیاں، ہرن گلہریاں اِدھراُدھر بھاگ رہے ہیں۔ میں سہم جاتا ہوں اور سارے موسم یکدم واپس کینوس میں چلے جاتے ہیں اور جو ہنگامہ ہوتا ہے وہ سب واپس کینوس میں چلا جاتا ہے۔ اب وہاں کوئی نہیں ہوتا۔ سب اپنی اپنی تصویروں میں واپس چلے جاتے ہیں اب میں اکیلا آرٹ گیلری کے مرکزی ہال میں کھڑا ہوں۔ اچانک دونوں اطراف سے بوڑھی طوائفوں کا جلوس داخل ہوتا ہے۔ وہ سب آ کر میرے گرد بیٹھ جاتی ہیں۔ وہ کئی صدیوں سے میرا انتظار کر رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے ڈھلکے جسموں کے ساتھ میرے گرد گھیرا کر لیا۔ اور میں سوچنے لگا یہ کس بات کا ذمہ دار ٹھہراتی ہیں۔ میں نے کیا جرم کیا ہے۔ جلد ہی مجھے اپنا جرم معلوم ہو گیا۔ ان میں سے ایک بوڑھی طوائف بولی۔ ''یہ تمہارا سارتر کون ہے؟ جس نے 1930ء میں یہ کہا کہ اب فلموں میں سرریلسٹک، ایبرڈ اور سمبالک اظہار کے لئے فلاسفی اور نفسیات کو بھی استعمال کرنا چاہئے؟''

''ہاں تو سارتر تو ہمارا وجودیت پسند امام ہے۔ اُس نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ اس کے ذریعے سے کامیو، کافکا، آندرے ژید اور سیموئل بیکٹ کے ساتھ بریخت کی تحریروں کو بھی فلم میں پیش کرنا چاہئے اور اُن کے آرٹ کو فلموں میں لایا گیا۔''

ایک بوڑھی طوائف بولی۔ ''ہمارا جسم گاڈ نے بنایا ہے۔ دیکھو مجھے یہ میرا بوڑھا جسم ہے۔'' وہ بوڑھی طوائف ایک لمحے میں عریاں ہو جاتی ہے۔ میں اُسے کہتا ہوں۔ ''میں جانتا ہوں تم کیا کہہ رہی ہو۔''

''تو پھر اس خوبصورت جسم کو تمہارے مصوروں نے کیوں ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ جب میں جوان تھی تو میرے بدن کو گاہک گلاب کے پھول کی طرح سونگھتے تھے۔ اور پورے پیرس میں میری خوشبو پھیل جاتی تھی۔ گلاب کی پتی نے میرے جسم سے رنگت لی تھی۔ یہ میرے گاہک کہتے تھے۔ پھر کیا ہوا؟''

ایک اور بوڑھی طوائف بولی۔

''پھر یہ ہوا کہ تمہارے مصور آئے۔ اور انہوں نے ہمارے جسموں کے ٹکڑے کر دیئے۔ میری ایک چھاتی میری ناف پر لگا دی۔ دوسری چھاتی کو اکیلا چھوڑ دیا۔ ایک آنکھ بڑی کر دی اور دوسری آنکھ ماتھے پر چپکا دی۔ میری ایک ٹانگ کو کولہے پہ لگا دیا اور میرے دونوں ہاتھ کاٹ کر پھینک دیئے۔ اب بتاؤ ایسا تو ہمارے کسی گاہک نے نہ کیا۔ نہ ہمیں کچلا، نہ مسلا، نہ روندا، نہ ہمارے ٹکڑے ٹکڑے کیے۔ وہ تو آتے تھے۔ بے چارے یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ عورت سے ہم بستری کیسے کرتے ہیں۔ ہم تو آج تک جان نہیں سکیں کہ بھڑوے عورت

سے زیادتی کیسے کر لیتے ہیں۔ جن کے دماغ اور سر پر جنسی ملاپ سوار ہو وہ تو رانوں کے بیچ ڈھیر ہو جاتا ہے۔''

ایک اور بوڑھی طوائف بولی۔ ''یہ جو تمہارے مصوروں نے کوئی نئی راہ نکالی ہے۔ سنا ہے اُسے سارتر نے تشکیل دیا ہے اور اُسے سرریلسٹک، ایبرڈ، سمبالک، ایبسٹریکٹ اور وجودیت پسندی قسم کی چیز کہتے ہیں۔ جن نے ہمارے جسموں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔''

میں اُن کی بات سمجھ چکا تھا مگر انہیں سمجھا نہیں سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ ''تم سب بوڑھی طوائفیں مل کر میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔ اس کے بعد میں نے دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا۔''

اب کافی ہاؤس میں دیکھا تو کوئی بھی نہیں تھا ——— سب جا چکے تھے۔ میں نے شعیب ہاشمی سے کہا۔ ''کہاں جانا ہے؟''

''تو پھر شعیب ہاشمی نے کیا کہا؟''

''اُس نے کہا رات کے پچھلے پہر فیض احمد فیض میرے پاس آتا ہے اور میرے بستر کے پاس بیٹھ جاتا ہے۔ میں تو بول نہیں سکتا وہ میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھتا ہے۔ میں رونے لگتا ہوں۔ تو وہ میرے آنسو اپنے ہاتھ میں جذب کرتا ہے اور کہتا ہے۔ ''شعیب تم تو میرے دوست تھے۔ داماد بعد میں تھے۔ میں تو پوری دنیا کے غریب لوگوں کے لئے تھا۔ اگر چہ سوٹ پہنتا تھا مگر میرے سینے میں دل تو عام آدمی کا دھڑکتا تھا۔ یہ سب کیا ہو گیا کہ تم بستر سے لگ گئے اور فیض کی مارکیٹنگ ہو رہی ہے۔'' اب میں تو بستر پر لیٹا تھا۔ بڑی مشکل سے سب کی نگاہ بچا کر آیا ہوں۔''

''تو پھر میرے لئے کیا حکم ہے؟''

فیض صاحب نے کہا۔ ''یار تم تو میرے دوست ہو۔ یہ جو میرے نام پر دو دو اور پانچ پانچ ہزار کے ٹکٹ بکتے ہیں۔ اور انڈیا سے پاکستان سے بڑے بڑے فنکار آتے ہیں تو اُن سے کہو کہ میرے نام پر ٹکٹ نہ لگائیں۔ سب کو اجازت ہو کہ میرے نام کا کوئی بھی شو دیکھ سکیں۔ میں تو بغیر معاوضے طے کئے مشاعروں میں چلا جاتا تھا۔''

''پھر شعیب ہاشمی نے کیا کہا؟''

''شعیب میرے سامنے بیٹھا تھا اور کہنے لگا۔'' مجھے اپنے بستر سے لگتا ہے۔ یہ میرے اندر کا شعیب ہاشمی ہے جو مجھ سے بھی بغاوت کر کے رات کے پچھلے پہر باہر آ جاتا ہے اور پھر کہیں نکل جاتا ہے۔ کبھی آپ کے

پاس آجاتا ہے۔ کبھی گورنمنٹ کالج لاہور کے اوول گراؤنڈ میں اکیلا بیٹھا رہتا ہے۔ کبھی بخاری آڈیٹوریم کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتا ہے۔"

"شعیب واقعی کبھی کبھی آتا ہے یا؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

انس نے کہا۔ "معلوم نہیں۔ وہ وقت کے تو نہیں آتا۔ لیکن وہ آتا ضرور ہے۔"

اب ایسا کبھی کبھی ہوتا تھا کہ انس یا تو خود کہیں چلے جاتے تھے اور وہاں کسی کرسی پر بیٹھے ملتے تھے یا کوئی ان کے پاس آجاتا تھا اور کچھ بتاتا جاتا تھا۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہونے لگا۔ میں آنکھیں بند کرکے کہیں بھی جاتی تھی۔ اور لگتا تھا وہ سب ابھی ابھی میرے پر بیتا ہے۔ انس کی بات ذرا مختلف تھی۔ وہ تو جب چاہتے تھے کسی بھی دوست کو بلا بھی لیتے تھے اور کسی بھی زمانے میں چلے جاتے تھے۔ کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ میں اپنی پسند سے اپنے وقت سے نکل سکتی تھی۔ میں اب اپنے مطالعے کے چھوٹے سے کمرے میں آگئی۔ میری لائبریری انس کی لائبریری سے الگ تھی۔ وہ ٹھہرے تاریخ کے آدمی اور میں ادب اور فنونِ لطیفہ کی ماری ہوئی —— اپنی جھولنے والی کرسی پر بیٹھی۔ آنکھیں بند کیں اور میری ٹرین ایڈنبرا سے گزر رہی تھی اور میں دیکھ رہی تھی کہ کیسا سجا ہوا شہر ہے۔ کیا رونق کیا زندگی، کیا رنگ و روشنی کا امتزاج۔ ٹرین شام سے پہلے آگے بڑھ رہی تھی اور ایڈنبرا کا شہر میرے بائیں جانب ضرورت سے زیادہ نکھرا ہوا زندگی سے باہر آرہا تھا۔ ٹرین گزر گئی اور پھر گلاسگو کے اسٹیشن پر رکی۔ میں باہر آئی تو سیاہ چادروں میں دس بارہ خواتین میرے استقبال کے لیے موجود تھیں۔ میں شاید تہران میں پہنچ گئی تھی۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ اب میں سمجھی کہ ایسا کیوں ہے؟ میں سکاٹ لینڈ کے شہر میں آئی تھی اور میں نے اپنی دوست شائستہ زیدی کو آنے کی اطلاع دی تھی کہ وہاں مجھے ایک ادبی تنظیم نے کہانی پڑھنے کے لیے دعوت دی۔ شائستہ زیدی مجھے لینے آئی تھی اور مجھے معلوم ہوا کہ اُن کے ساتھ گلاسگو کی وہ خواتین آئی تھیں جو اپنے مسلک کے مطابق مجالس میں شریک ہونے کے لیے تیار ہوئی تھیں۔ اب مجھے وہ سب سیدھا اسی مجلس میں لے کر آگئیں۔ میں نے وہاں دیکھا ایک ہال کمرہ، سیاہ چادروں سے بھرا ہوا ہے۔ سب قالین پر بیٹھی تھیں۔ مجھے لگا میں ایران میں آگئی ہوں۔ جب میں نے سب کو توجہ سے دیکھا تو مختلف عمروں کی خواتین تھیں۔ برابر کی تعداد میں نوجوان لڑکیاں تھیں —— جنہوں نے جینز، پاجامہ پہن رکھا تھا۔ اوپر سیاہ چادریں لی ہوئی تھیں۔ یہ نوجوان لڑکیاں اور خواتین پاکستانی خاندانوں کی تھیں جن کے آباؤاجداد یا والدین بھی کوئی پچاس سال پہلے یا کوئی تیس بیس سال پہلے یہاں روزگار کے لیے آباد ہوئے تھے۔ اب یہ اُن کی شاید دوسری نسل تیار ہے۔

مطلب دادا آیا تھا تو پوتے پوتیاں میرے سامنے تھیں ——— مجلس کے لئے پاکستان سے اور لکھنؤ سے دو خواتین منگوائی گئی تھیں۔ یہ زنانہ مجلس تھی۔ اس وقت پاکستان کی ذاکرہ سٹیج پر موجود تھی۔ لکھنؤ والی کی کل باری تھی۔ لکھنؤ محرم کے لئے مستند علماء کا مرکز ہے۔ نواب واجد علی شاہ ہر طرح کے بین کرنے والے اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ گریہ کی روایت بہت پرانی ہے اور لکھنؤ سے ہمارے انتظار حسین تک تو آتے ہم نے دیکھی ہے۔ اب میں دیکھ رہی تھی کہ پہلے تو سب نے مڑ کے دیکھا کہ کون آئی ہے۔ سر پہ سیاہ چادر نہیں۔ یہ تو پاکستانی مگر تیز ذرا نہیں ——— اب جو میں نے ذرا ہوش سنبھالا تو ذاکرہ یا عالمہ جو بیان کر رہی تھیں اُس پہ کسی کی توجہ نہیں تھی۔ مگر یوں لگتا تھا کہ انہوں نے یہ وقت یہاں ایک قاعدے قانون میں گذارنا ہے۔ کہ یہ روایت ہے جسے جاری رہنا ہے۔

اب جو میں نے سنا تو وہ ذاکرہ یا عالمہ فصاحت و بلاغت سے معمولی واقفیت رکھتی تھی اور اصل میں تو وہ تربیت یافتہ تھی اور اُس نے اپنی مارکیٹنگ بہت اچھے طریقے سے کی تھی۔

اب جو میں نے دیکھا وہ عالمہ پوری طاقت سے رُلانے کے لئے مرثیے میں مصائب کے حصے پہ آ چکی تھیں۔ مصائب مرثیے کا اصل جزو ہوتا ہے۔ جس کے بعد سننے والوں کو باجماعت رونا ہوتا ہے کہ رقت طاری ہونا لازمی ہوتا ہے کہ ایسے مصائب مولا کے خاندان پر جو آئے وہ کسی ذی روح پر کم ہی آئے ہوں گے۔ میں نے دیکھا کہ جب عالمہ مصائب پر اپنی خطابت اور صوتی اُتار چڑھاؤ کا مہارت سے مظاہرہ کر رہی تھیں تو خواتین میں سے اکثریت نے سیاہ چادروں میں چہرے اس انداز سے چھپائے جیسے وہ رو رہی ہوں، اور بین کر رہی ہوں۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ نوجوان لڑکیاں جنہوں نے سیاہ چادریں اپنے والدین کے کہنے پر پہن رکھی تھیں، اندر سے بالکل مختلف احساس رکھتی تھیں اور کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔ اب یہ محفل مصائب اور بین کے بعد تمام ہوئی تو میری میزبان نے سب کو کھانے کی دعوت دی۔ اب جو میں نے دیکھا وہ میرے لئے تجربہ تھا ———

اس ہال کمرے کے بعد بے حد وسیع لان تھا۔ گلاسگو میں زمینوں کی کمی نہیں تھی کہ سکاٹ لینڈ پر برطانیہ کا قبضہ ضرور تھا۔ مگر برطانوی یہاں آباد ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لئے پاکستانی انڈین اور دوسرے ملکوں کے لوگ جب یہاں آئے تو یہاں کاسل، مینشن، فورٹ اور فارم ہاؤس اونے پونے بک رہے تھے۔ اور انہیں پاکستانیوں اور انڈین نے لے لیا اور اب وہ اسے استعمال کر رہے تھے۔ اب یہاں ڈنر لگا ہوا تھا۔ مجھے بھی

شریک ہونا تھا۔ اب جو میں نے نگاہ ڈالی تو حیرت ہوئی کہ پاکستانی اور انڈین کوزین کا ایک مغلیہ دربار لگا تھا۔ اس لئے کہ شکاگو میں جو پاکستانی اور انڈین آئے تھے اپنے کھانے بھی ساتھ لائے تھے اور جو کھانوں کا بازار لگا تھا، اس میں تندوری نان، روٹی تو تازہ اتر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی تندوری تکے، لیمب چاپیں، مرغ مسلم اور پھر حلیم، نہاری، پالک پنیر، بریانی، پلاؤ، قورمہ، دالوں کی کئی اقسام۔ ویجیٹیرین کے لئے کئی طرح کی سبزیاں، پکوڑے اور پھر سمندری خوراک میں مچھلیوں کی کئی اقسام اور جھینگوں کی کئی طرح کی ڈشز شامل تھیں۔ میرے لئے یہ ایک نیا تجربہ تھا کہ کھانوں کا ایسا اہتمام اور وہ بھی ایک مذہبی تقریب پر کہ یہ کسی کا ولیمہ نہیں تھا۔ بہر حال یہ میری تو پہلی شام تھی۔ اسی میں مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ پاکستانی گھرانوں کے لئے امریکہ اور یورپ میں لڑکے لڑکیوں کے آپس میں رشتے طے کرانے کے لئے اسی طرح کے مواقع پیدا کئے جاتے ہیں اور یہاں بھی اسی بات کا اہتمام تھا۔ میں نے وہاں بے شمار لڑکے مختلف لباسوں میں دیکھے مثلاً شلوار کُرتے میں ـــــ شیروانیوں میں ـــــ اور مغربی سوٹ میں ـــــ کچھ کچھ تو پشاوری لباس میں بھی تھے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کو کھانے کے دوران ملنے کے مواقع موجود تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ لڑکے لڑکیوں میں پہلے سے ملاقاتیں اور رابطے موجود تھے۔ اس لئے وہاں ایسا کوئی پردہ نہیں تھا کہ لوگ چھپ چھپا کے ملتے۔ لیکن یہ مواقع خاندان والے اس لئے ہی پیدا کرتے ہیں کہ لڑکا لڑکی فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگائیں۔ یہ آخری نسل تھی جو اس طرح سوچ رہی تھی اس کے بعد جو نسل آنے والی تھی وہ اس طرح کے اہتمام نہیں کر سکے گی۔ میں ایک بار امریکہ گئی تو ایسی ہی صورتِ حال دیکھی کہ پاکستانی ڈاکٹروں کی تنظیم ''آپنا'' نے مجھے مشاعرے اور دیگر تقریبات میں بلایا تو میں نے دیکھا کہ سات دن یہ تنظیم اپنے خاندانوں کو کسی ایک ایسی جگہ جمع کرتے ہیں ـــــ جو پکنک اور ہائی ٹیز کے لئے پورے خاندان کے لئے بے حد دلکش ہوتی ہے۔ یہاں بھی لڑکے لڑکیوں کو ملنے کے مواقع دیئے جاتے ہیں اور پھر جو شادیاں اس کے نتیجے میں ہوتی ہیں۔ اُس کی تجزیہ رپورٹ اب سامنے آگئی ہے کہ اس میں زیادہ شادیاں فلاپ ہو رہی ہیں۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ امریکہ میں پروان چڑھنے والی نسل کو والدین اپنے بنائے ہوئے سانچے میں نہیں ڈھال سکتے۔ ـــــ اور یہ پریکٹس شاید آگے آنے والے سالوں میں ان ڈاکٹروں کو مہنگی پڑیں گی۔ اس لئے شاید مشاعرے اور دیگر موسیقی کے پروگرام ختم ہو جائیں۔ ایسے میں جغادری مشاعرہ باز شاعروں کی بھی چھٹی ہو جائے گی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اگلی نسل اب بالکل مختلف ہو گی۔ جو زیادہ حقیقت پسند ہو گی جو زندگی کو اپنے حساب سے جینے کے

لئے آزاد ہوگی کہ خاندانی نظام کے آرکی ٹائپ بدل چکے ہیں۔ یہ سارا ڈرامہ میں نے دیکھا اور ایسے میں ایک خاتون جو جوان تھی مگر نوجوان نہیں تھی اپنی پلیٹ میں کھانا لے کر میرے پاس آئی اور اُس نے کہا۔ ''مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔ یہاں ہم بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں۔'' تقریباً کھانا میں کھا چکی تھی ___ تو میں اُس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اُس کی شخصیت بے حد خوبصورت تھی۔ لگتا تھا کہ کسی رائل فیملی کی اولاد ہے۔ ہر طرح سے قد میں، رنگت میں، چہرے کے نقوش میں وہ مجھے متاثر کر رہی تھی۔ اس لئے میں اُسے لان کے آخری کونے میں لے گئی اور اُسے کہا۔ ''بتاؤ کیا کہنا چاہتی ہو؟'' شام اُتر آئی تھی اور لان کی لائٹس جل رہی تھیں۔ باقی دنیا ایک ایک کر کے جا رہی تھی، جس کی مجھے پرواہ نہیں تھی۔ اب جو وہ بولی تو میں چونک گئی۔ اُس نے ایک بے حد خوبصورت اور عورتوں کے معاملے میں بے حد لالچی اور اپنے زمانے کے راسپوٹین کا تاثر دینے والے ایک شاعر کا نام لیا جسے میں پہچانتی تھی۔ اُس نے بتایا کہ وہ پاکستان ٹیلی وژن میں اچھے عہدے پر تھا۔ اُس نے اُس وقت کی بے حد خوبصورت ٹی وی آرٹسٹ کو اپنی محبت میں گرفتار کیا اور وہ اس میں آ گئی۔ دونوں ہی خوبصورت تھے کسی کو شاید اعتراض کرنے کی جرأت بھی نہ ہوئی ہوگی۔ اگرچہ وہ شادی شدہ تھا اور شادی بھی اپنی کلاس فیلو سے کی تھی۔ اس کے بچے بھی تھے۔ لیکن وہ لڑکیوں اور عورتوں کے معاملے میں بہت ندیدہ تھا۔ جہاں اکیلی لڑکی دیکھی اُس پر جلوہ ڈالا اور سیدھا عشق کی سیڑھی چڑھ گیا۔ اب وہ خوبصورت ٹی وی آرٹسٹ اپنا سب کچھ بھول کر دن رات اُس کے ساتھ دکھائی دینے لگی۔ شاید ہی کوئی ہوٹل انہوں نے چھوڑا ہو جہاں وہ راتیں نہ گذارتے ہوں۔

''تو پھر کیا ہوا؟ آپ کا اُن دونوں سے کوئی تعلق؟'' میں نے بات کا سرا پکڑنے کی کوشش کی۔

''ہاں رشتہ ہی دونوں سے میرا ہے اور آپ شاید جان چکی ہوں کہ میں اُن دونوں کی ناجائز اولاد ہوں۔''

''کوئی اولاد ناجائز نہیں ہوتی۔ اُن کا رشتہ جائز نہیں ہوتا ہمارے مذہب کی نظر میں ___ اولاد تو جائز ہوتی ہے کہ وہ ان دونوں کی باہمی رضامندی اور محبت کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔''

''ہاں مگر پھر وہ ڈر کیوں جاتے ہیں؟''

''ڈرتے وہ اللہ سے نہیں ہیں۔ ڈرتے وہ کم ظرف معاشرے سے ہیں۔ یہ بات جرمنی بلکہ پورے یورپ میں اور امریکہ میں نہ تو گناہ ہے نہ معیوب سمجھی جاتی ہے نہ کوئی سوال اٹھاتا ہے کہ کون کس کی بیٹی ہے اور کیوں ہے ___ تو پھر آگے کیا ہوا؟''

"تو پھر میری ماں جب حاملہ ہوئیں تو پھر وہ خوبصورت شاعر تو اُڑ گیا اور کسی اور پھول کا رس چوسنے لگا۔ ایسا میں نے پاکستانی فلموں کے مکالموں میں سن رکھا ہے۔"

"ہاں یہی بات ہے تو ایسا ہی ہوا ہوگا۔"

"تو میری ماں اپنے وقت کی خوبصورت آرٹسٹ تھی۔ نہیں چاہتی تھی کہ وہ کسی ہسپتال میں ناجائز بچے کو جنم دے اور معاشرہ اُس پر کوئی حدود آرڈیننس لاگو کر کے سنگسار کر دے کہ یہ ضیاء الحق کا پاکستان میں مارشل لاء کا زمانہ تھا۔"

"اُس نے ٹھیک سوچا— نہیں تو وہ تمہیں پیٹ میں رکھتے ہوئے سنگسار کر دی جاتی اور تم اندر ہی اندر سنگسار ہو جاتی— جبکہ تمہارا قصور نہیں تھا۔ نہ ہی اسلام میں ایسی کوئی حد ہے کہ پیٹ میں اولاد سنگسار کی جائے۔ بچے کو پیدا کرنے کا حق ماں کو اللہ نے دیا ہے۔ خیر یہ اور بات ہے۔"

"تو ایسا ہوا کہ میری ماں کی ایک بہن یہاں گلاسگو میں کسی پاکستانی سے بیاہی گئی تھی جو یہاں آیا تھا اور کسی "کیش اینڈ کیری" میں ورکر تھا۔ وہ بیچاری بھی دھوکے میں آئی کہ میری ماں اور اُس کی بہن ایک اچھے افسر کی اولادیں تھیں۔ میری ماں تو سرپھری تھی آرٹسٹ نکل آئی اور میری خالہ کا رشتہ جب انگلینڈ سے آیا تو کسی نے نہ پوچھا کہ لڑکا کیا بیچتا ہے۔ بس جو بتایا گیا کہ لڑکا بزنس کرتا ہے۔ فوراً ہاں کر دی گئی جبکہ وہ بھنڈی توری بیچتا تھا— اب جب وہ گلاسگو آگئیں تو حقیقت معلوم ہوگئی۔ میری خالہ کنیئرڈ کالج کی پڑھی ہوئی تھیں اور وہ مشکل سے ہائی سکول بھی نہیں گیا تھا— اب وہ کیا کرتی۔ یہاں گلاسگو میں اُس وقت زندگی کسی ترقی یافتہ شہر جیسی نہیں تھی اور گلاسگو لندن کا گاؤں سمجھا جاتا تھا۔ آج بھی سمجھا جاتا ہے۔ اسی لئے تو پورے آزاد کشمیر اور پنجاب کے دیہاتوں سے یہاں آکر لوگ آباد ہوئے ہیں۔"

"ہاں تو پھر تمہاری خالہ کے ساتھ کیا ہوا؟"

"پہلے میری بات تو سن لیں کہ میری ماں نے پاکستان سے یہاں آکر مجھے جنم دیا۔ تاکہ پاکستان میں وہ سنگسار ہونے سے بچ جائے۔ اور وہ مجھے اپنی بہن کے پاس چھوڑ کے چلی گئیں۔ مجھے میری خالہ ماں نے بتایا کہ اُس نے تمہاری شکل نہیں دیکھی تھی۔ جب نرس اُس کے پاس مجھے لائی تو اس نے روتے ہوئے کہا۔ اگر میں نے اسے دیکھ لیا تو پھر میں اسے چھوڑ نہیں سکوں گی اور پھر مجھے یہیں رہنا ہوگا۔ اور وہ یہاں کس کے سہارے رہتی؟"

''تو تمہاری ماں نے تمہیں نہیں دیکھا اب تک؟''

''نہیں بعد میں میری خالہ ماں نے اُسے میری تصویریں بھیجیں اور وہ اُن تصویروں کو گلے سے لگا کر روتی تھیں۔''

''تو پھر یہاں تم نے کیسے اپنی خالہ کے ہاں پرورش پائی؟''

''وہ ایسے ہوا کہ میری خالہ نے مجھے گود لے لیا۔ اور وہ مجھے ایسے پالنے لگیں جیسے وہ میری ماں ہوں۔ لیکن اس کی اپنی زندگی ابھی میں اُن کی گود ہی میں تھی کہ ایسی جگہ آ پہنچی کہ اُس نے اُس آدمی سے طلاق لینے کا فیصلہ کرلیا۔ اب اس کی اپنی گود میں اپنا بچہ بھی آ چکا تھا۔ جس کا مکمل خرچہ اُسی بندے نے ہمیشہ کے لئے ادا کرنا تھا۔ چونکہ میری خالہ ماں نے عدالت سے طلاق حاصل کی تھی اسی لئے اُس آدمی نے اُس خرچ سے جان چھڑالی۔ اب میری خالہ کی کوئی منزل نہیں تھی۔ نہ وہ واپس پاکستان جا سکتی تھی نہ اُس کے پاس یہاں کوئی ٹھکانہ تھا۔ اُس نے یہاں کچھ دنوں کے لئے ایک یتیم خانے میں کام کیا۔ جب اُس نے دیکھا کہ یہاں کے یتیم خانے اچھے اچھے گھروں سے بہتر دیکھ بھال اور تربیت کرتے ہیں تو ایک دن اُس نے مجھے یہاں داخل کرایا اور اپنا بچہ لے کر چلی گئیں۔ میں وہاں پلی بڑھی اور جب میں سکول کی عمر میں آئی تو یہاں قانون ہے کوئی بھی خاندان کسی بچے کی ذمہ داری لے سکتا ہے۔ تو گلاسگو کے ایک فیملی کی اولاد نہیں تھی۔ میاں پاکستانی تھا اور بیوی سکاٹ تھی۔ دونوں ایک شدید سردی کے برفباری کے موسم میں سیاہ لانگ کوٹ پہنے سر پر گرم ہیٹ رکھے آئے اور مجھے گود لے کر چلے گئے۔ میرے لئے بہت سے کھلونے اور گرم کپڑے وہ ساتھ لائے تھے۔ قانون کے مطابق یتیم خانے کو یہ حق حاصل تھا کہ ہر ہفتے وہ آ کر دیکھ سکتے تھے کہ میں کس حال میں ہوں ــــ پاکستان میں نہ تو میری ماں کو معلوم تھا کہ میں کہاں ہوں۔ نہ میری خالہ کو معلوم تھا کہ میں یتیم خانے سے کہاں گئی ہوں ــــ بعد میں مجھے ساری باتیں معلوم ہوئیں ــــ کہ میری ماں پر کیا گذری اور میری خالہ ماں کے ساتھ کیا ہوا؟''

''تمہاری کہانی تو پھیلتی جا رہی ہے۔ ناول لکھوں گی اس پر۔ مگر میں کیوں تمہارا تجربہ چراؤں گی۔ تم خود لکھو اپنی کہانی ــــ''

''ہاں شاید میں نہ لکھ سکوں۔''

''بہر حال آج کی شام تم نے مجھے کئی کہانیاں دے دیں۔ اب تم بتاؤ کہ آگے کیا ہوا۔ تمہاری ماں

اور خالہ ماں کے ساتھ؟''

''پہلے میری ماں جو پی ٹی وی کی آرٹسٹ تھی اُسے ایک جاگیردار جو کہ حکومت کا وزیر تھا، شادی کر کے لے گیا۔ ایک گھر میں بٹھایا اور تین بچے پیدا کر کے اُسے کچھ پیسے دے کر چھوڑ دیا۔ اس لئے کہ اُسے کینسر ہو چکا تھا۔ وہ اپنے بچے چھوڑ کے چلی گئی مگر اُسے میرا پتہ چل چکا تھا کہ میں کہاں ہوں۔''

''تمہاری خالہ ماں کی کہانی کیا ہوئی؟''

''وہ یہ تھی کہ میری خالہ نے اِدھر اُدھر چھوٹے چھوٹے کام کیے۔ کیش اینڈ کیری سے لے کر شراب کی پب میں نوکری کی۔ تعلیم اُس کے پاس تھی۔ وہ آسانی سے کام ڈھونڈ لیتی تھی۔ اپنی بیٹی کو وہ پڑھاتی رہی اور ایک دن کیا ہوا؟''

''اس کا مطلب ہے میرے مطلب کی کہانی شروع ہو رہی ہے۔''

''کہانی تو جاری ہے۔ بس زمانے کا سلسلہ رکتا بڑھتا رہتا ہے۔ تو ایسا ہوا کہ میری خالہ اماں کو ایک دن ایک چہرے مہرے سے دیکھا ہوا آدمی ملا۔ اچھی شخصیت، پاکستان کے چینلز پر وہ آتا رہتا تھا۔ معلوم ہوا وہ سیاسی پناہ لئے ہوئے ہے اور اُس پر مقدمات ہیں۔ اُس کے پاس لندن میں خوبصورت اپارٹمنٹ اور پورا پروٹوکول تھا۔ اُسے میری خالہ ماں پسند آ گئیں، اس لئے کہ اچھے خاندان کی پڑھی لکھی تھیں۔ میری خالہ نے شادی کر لی۔ کر لینی چاہئے تھی اور پھر اُس نے اچھا وقت گذارا۔ اس دوران اُس کی بیٹی نے آکسفورڈ سے تعلیم پائی اور ایک دن وہ مجھ سے ملنے آئیں۔''

''ایک اور سرپرائز۔''

''ہاں وہ یہ ہے کہ میری خالہ مجھ سے جب ملنے آئیں تو میں لنکنز اِن لندن میں پڑھ رہی تھی اور اُنہیں معلوم تھا۔ میں قانون کی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ ایسے میں ایک دن میں کالج کی کینٹین میں بیٹھی تھی کہ خالہ اماں آ گئیں۔ مجھے پہچاننے میں مشکل ہوئی اگرچہ وہ اچھے لباس اور اچھے ماحول میں یہاں مجھ سے ملنے آئی تھیں۔ وہ سامنے آ کر بیٹھ گئیں اور مجھے دیکھتی رہیں اور پھر بس اتنا کہا۔ ''مجھے معاف کر دینا۔ میں شرمندگی کی وجہ سے تمہارا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔ تمہیں یتیم خانے میں چھوڑ گئی۔ مگر آج تمہیں ''لنکنز اِن'' میں دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ میں نے ٹھیک فیصلہ کیا تھا۔ میں تمہیں ''لنکنز اِن'' تک نہیں لا سکتی تھی۔ مجھے معلوم تھا تم خوبصورت ہو۔ کوئی بھی ضرورت مند پاکستانی یا سکاٹ گھرانہ تمہیں اپنا لے گا۔''

میں خاموش انہیں دیکھتی رہی۔ میرے اُن کے ساتھ جذبات موجود نہیں تھے۔ بس ایک حوالہ تھا۔ اور ماضی کی ایک پرچھائیں جو سامنے بیٹھی تھی۔ میں نے ان کے لئے کینٹین سے کافی اور سینڈوچ منگائے اور اُن سے جب رہا نہ گیا تو مجھے گلے لگا کر رونے لگیں۔ معلوم نہیں کن زمانوں کا غبار تھا جو ڈھل رہا تھا۔ کئی کہانیوں کی آمیزش سے جو اُن کے اندر ملال جمع ہوا تھا وہ اب آنسوؤں میں پھیل چکا تھا۔ اُن کے دل سے کئی ساون گذر رہے تھے۔ میں تو محض ایک بہانہ تھی۔ پھر انہوں نے جانے سے پہلے ایک لفافہ دیا کہ یہ رکھ لو۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ تو انہوں نے بتایا۔ ''یہ ایک امانت ہے جو میں تمہیں اب پہنچا رہی ہوں۔ تمہاری ماں نے مرتے وقت مجھ سے فون پر بات کی تھی کہ وہ کینسر کی آخری سٹیج پر تھی۔ اُس نے بتایا کہ یہ میں نے اُس جاگیردار شوہر سے جو جائیداد لی تھی۔ اُس کو اپنی اولاد میں تقسیم کیا تو یہ تمہارا حصہ ہے۔ اُس نے بھجوایا تھا۔ میں وہ تمہارے حوالے کر رہی ہوں۔''

''مگر میں تو اُس جاگیردار کی اولاد نہیں ہوں۔ جس نے میری ماں سے شادی کر کے اُن کا ٹی وی کا فنی سفر ختم کرایا اور پھر جب وہ بیمار ہوئیں تو انہیں چھوڑ دیا۔''

''ہاں مگر یہ پوری کہانی نہیں ہے۔''

''تو کیا ہے پوری کہانی؟''

''وہ یہ کہ وہ جاگیردار نہ صرف سیاست دان تھا بلکہ سجادہ نشین بھی تھا۔ لاکھوں مرید تھے اُس کے اور اُس نے تمہاری ماں سے جو اولاد تھی اُس کی ذمہ داری لی۔ ان کے نام اُن کا حصہ کیا۔ اُن کی تعلیم و تربیت کی اور تمہاری ماں کو چھوڑنے کے بعد تمہاری ماں کے نام اُس کا حصہ کیا۔ جو تمہاری ماں نے مرتے وقت تمہارے لئے مجھے بھیج دیا۔ یہ بہت بھاری رقم ہے اور تمہارا حق ہے اس پر۔''

اب میں اس سارے منظر کا حصہ تو تھی۔ پس منظر کا حصہ نہیں تھی۔ میں نے تو اپنی ماں کو دیکھا بھی نہیں تھا اور ماں نے بھی مجھے نہیں دیکھا تھا۔ میں تو ناجائز اولاد تھی۔ میرا باپ کہاں ہے، کہاں تھا، کیا کر رہا ہے، کتنوں کو حاملہ کر رہا ہے، میں نہیں جانتی تھی۔ لیکن جیسے میری ماں کے ساتھ ہوا اور وہ میرے لئے یہ چھوڑ گئی، تو مجھے نہیں معلوم کہ کیا رشتہ اناٹومی کا ہوتا ہے۔ روح کا ہوتا ہے۔ زمین کا ہوتا ہے۔ تعلق کا ہوتا ہے یا جنم کنڈلی کا ہوتا ہے۔ میں قانون کی طالب علم تھی اور مجھے جائیداد کے قانون اور دیگر قوانین کا علم تھا۔ تو میں سوچ میں پڑ گئی کہ اس بھاری رقم پر میرا کیا حق ہے۔ کیا اناٹومی کا حق ہے کہ میں اُن کے پیٹ سے برآمد ہوئی تھی اور جب

میری ماں اُس ہرجائی شاعر کے ساتھ جنسی اختلاط میں مگن تھی تو کیا میں اُس لمحے کے سرور کی پیداوار ہوں یا میں کسی ناجائز ذریعے سے زمین پر اُتری ہوں۔ یہ سب سوال اب مجھے دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن میری خالہ ماں میرے اندر کے جوار بھاٹا سے واقف نہیں تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔ انہوں نے مجھے جاتے ہوئے اپنے بارے میں بتایا کہ میں نے جس پاکستانی سیاست دان سے شادی کی تھی، اُسی نے مجھے اور میری بیٹی کو بچا لیا تھا۔ میری بیٹی اب اچھی میڈیا پرسن ہے۔ بڑے دورے کرتی ہے۔ اور لوگ اُسے جانتے ہیں۔ لیکن اب وہ سیاست دان پاکستان واپس چلا گیا ہے۔ اپنی بیوی اور بچوں کے پاس کہ اس پر مقدمات ختم ہو گئے ہیں اور پاکستان میں اُس کی حکومت آ چکی ہے۔ وہ مجھے اپنا ایک اپارٹمنٹ دے گیا ہے اور ایک طرح سے مجھے بتا گیا ہے کہ تم آزاد ہو۔ چاہو تو مجھ سے طلاق لے لینا کہ اب میں سیاسی پناہ سے نکل چکا ہوں۔ تم نے اس عرصے میں مجھے سہارا دیا۔ اُس کا شکریہ۔ لیکن میں نے اُس سے کہا۔ میں اپنی زندگی گذار لوں گی۔ میری فکر نہ کرنا۔ میری بیٹی میرے پاس ہے۔ اگرچہ وہ پاس نہیں ہوتی تھی۔ وہ تو پوری دنیا میں بھاگتی پھرتی تھی۔ بس یہ ہے میری کہانی۔ اور وہ اٹھیں اور میرے گلے لگیں اور وہ لفافہ میز پر چھوڑ کر چلی گئیں۔ میں انہیں دیکھتی رہی۔ وہ چلی گئیں اور جانے سے پہلے مجھے اپنا کارڈ دے گئیں کہ اگر تم لندن آؤ تو میں تمہیں اپنے گھر میں ملوں گی۔ تم میرے پاس رہ سکتی ہو۔ وہ چلی گئیں اور میں اُس لفافے کو دیکھتی رہی۔"

"وہ لفافہ آپ نے کھولا؟"

"ہاں کھولا تھا۔ بڑی رقم تھی۔ میں نے گھر جا کر دراز میں رکھ دی تھی کہ مجھے اُس وقت اُس کی ضرورت نہیں تھی۔"

"تو اب کہانی ختم۔ اب میں جا سکتی ہوں کہ میری میزبان شائستہ زیدی کئی بار مجھے اپنی شکل دکھا چکی ہیں۔ اب میں چلتی ہوں۔"

"تو پھر میں آپ کو ایک اور کہانی کے لئے دعوت دیتی ہوں کہ گلاسگو میں بے شمار پاکستانی ایک کمرے میں قید ہیں جو غیر قانونی طریقے سے یہاں پہنچے ہیں۔"

اب میں سمجھ چکی تھی کہ ایک اور کہانی سامنے ہے۔ اور پھر میں نے اُس سے پوچھا کہ تم یہ سب مجھے کیوں دکھاؤ گی؟ تو اس نے بتایا کہ آپ کہانیاں لکھتی ہیں۔ اس لئے میں گلاسگو میں آپ کو ایک ایسی جگہ لے جاؤں گی جہاں آپ کی آنکھیں کھل جائیں گی۔

میں اپنے ہوٹل چلی گئی اور پھر اگلے دن میں جب ہوٹل کی لابی میں آئی تو وہ موجود تھی۔ وہ مجھے گاڑی میں لے کر نکلی۔ ساتھ ساتھ بتانے لگی کہ پندرہ پاکستانی نوجوان ایک کمرے میں زمین پر باری باری سوتے ہیں۔ اُن سب کو ایک ریسٹورنٹ کے مالک نے پناہ دی ہوئی ہے جو اپنے ریسٹورنٹ میں ان کو مختلف کاموں پر بغیر تنخواہ کے صرف تین وقت کے کھانے پر رکھے ہوئے ہے۔ کیونکہ یہاں ان کے حقوق نہیں ہیں کہ یہ سب غیر قانونی یہاں رہ رہے ہیں۔ ریسٹورنٹ کا مالک آزاد کشمیر کا میرپوریا ہے۔

''اب وہ کشمیر کا بدلہ اس طرح پاکستانیوں سے لے رہا ہے؟'' میں نے بے ساختہ کہہ دیا ——

وہ مسکرائی اور بتانے لگی کہ یہ پندرہ لوگ نہیں پندرہ کہانیاں ہیں کیونکہ میں ان کا کیس عدالت میں لڑ رہی ہوں۔ ظاہر ہے مجھے ان سے فیس نہیں لینی۔ میں انسانی حقوق کی وکیل ہوں۔ اور میں عاصمہ جہانگیر سے بھی مل چکی ہوں۔ جب وہ یہاں آئی تھیں، میں اُن سے متاثر ہو کر اس طرف آئی ہوں۔ اب میں اور زیادہ اُس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگی۔

''تو ان کو یہاں قانونی حیثیت دلانے کے کتنے چانس ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہر کیس کی الگ نوعیت ہے۔ میں شاید کامیاب ہو جاؤں۔ میں تو ان کو انصاف دلا دوں گی کہ ''لنکنز اِن'' سے عدالتیں بہت مرعوب رہتی ہیں۔ میں اُس کا فائدہ اٹھاؤں گی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مجھے کون انصاف دلائے گا۔ میرا باپ جو پاکستان کا مشہور شاعر اور رائٹر ہے۔ میری ماں کو حاملہ کر کے پتلی گلی سے نکل گیا۔ کب میرے کٹہرے میں آئے گا؟ میں اسی انتقام میں رہتی ہوں۔''

''کیا تم نے کبھی اُسے دیکھا۔ سنا ہے اس نے تو ایک برٹش لڑکی سے آخری عمر میں شادی کی ہے۔ وہ لڑکی برٹش ہے، گوری ہے اور وہ کسی یونیورسٹی کی طرف سے پی ایچ ڈی کے لئے پاکستان گئی تھی۔ وہاں اُس کی ملاقات تمہارے باپ سے ہوئی جس نے تمہیں اپنا نام نہیں دیا۔ اور پھر اُس نے اسے بھی دبوچ لیا اور اب وہ امریکہ کی کسی یونیورسٹی میں پڑھا رہی ہے کہ اُس کا پی ایچ ڈی مکمل ہو گیا تھا۔ اُس میں سے ایک بیٹا ہے جو برطانوی شہری ہے۔''

''ہاں، میں نے اس کی تصویریں دیکھی ہیں اور یہ سب بھی مجھے معلوم ہے۔ میں انتظار کر رہی ہوں کہ اُس کا بیٹا یہاں بڑا ہو کر کبھی کسی کیس میں ملوث ہو اور میں اُس کے مخالف وکیل بنوں یا کبھی میرا باپ اولڈ ہوم میں جائے اور میں انسانی حقوق کے وکیل کے طور پر اس اولڈ ہوم کا دورہ کروں اور اُسے بے بس دیکھوں

اور پھر اُس سے پوچھوں اب بتاؤ تم نے میری ماں کے ساتھ ایسا کیوں کیا تھا؟ مجھے بے نام کے باپ کی بیٹی بنا کر یتیم خانے میں کیوں ڈالا گیا تھا۔ اور شاید وہ کہے گا کہ مجھے ''مرسی کلنگ'' کے لئے عدالت سے فیصلہ لے کر دو اور پھر میں اُس کے لئے کیس لڑوں اور میں کیس جیت کر اُسے ''مرسی کلنگ'' کا حق لے کر دوں۔ یا پھر اُس کا جو بیٹا برطانوی گوری سے ہے وہ کبھی کسی جرم میں پھنسے اور میں اُس کی مخالف وکیل بن کر اُسے سزا کرا دوں''۔۔۔

میں سمجھ رہی تھی کہ وہ اپنا بدلہ لینے کے لئے مستقبل میں اپنی خوش فہمی کی ایک کہانی بنا چکی ہے اور وہ اس کہانی کو دن رات دیکھتی ہوگی۔ اس کہانی میں ردو بدل بھی کرتی ہوگی جیسے میں اپنی کہانیوں کو کئی کئی طرح سے لکھتی ہوں۔ مگر کیا جو وہ خیالوں میں بدلہ لے رہی ہے۔ یہ اُس کا کیتھارسس ہے یا اُس کے غصے کا ابارشن ہے۔ کاش اُس کی ماں کا ابارشن ہو جاتا اور یہ پیدا ہی نہ ہوتی تو کہانی کچھ کی کچھ ہوتی۔

لیکن اب ہم اُس جگہ پہنچ رہے تھے جہاں پندرہ پاکستانی ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ یہ اپنی غلطیوں کے قیدی تھے۔ میرے لئے کہانیوں کے کئی کردار سامنے تھے مگر میں اُن میں بالکل دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ میرے لئے تو یہ لڑکی ایک بہت پھیلی ہوئی کہانی تھی۔ بہر حال ہم وہاں پہنچے اور ایک کمرے میں گئے۔ زمین پر پندرہ لڑکے ایک دوسرے کے ساتھ لگے ہوئے بیٹھے تھے۔ دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں جن پر اُن کی یہ وکیل اور میں بیٹھ گئے۔ ان کے چہروں پر اُمید بھی آئی اور نا امیدی کا بادل بھی چھا گیا کہ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ میں پاکستانی ایمبسی کی کوئی افسر ہوں جو اُن کو یہاں سے نکالنے آئی ہوں۔ اب جو کہانیاں سامنے آئیں وہ تو بتائی نہیں جا سکتیں۔ البتہ جو میں نے سنا وہ خوفناک باتیں تھیں۔ مثلاً ایک لڑکا راولپنڈی کے گورڈن کالج کا گریجویٹ تھا اور اُس کا باپ بھی عام آدمی نہیں تھا، سرکاری ملازم تھا اور اُس نے بیٹے کو برطانیہ میں کسی ایجنٹ کے ہاتھوں دھکا دے دیا۔ اب وہ کہہ رہا تھا کہ میں ترکی سے یونان اور پھر سمندر میں لانچ کے ذریعے آیا۔ ہم کئی کئی دن بھوکے رہتے تھے۔ موت ہر وقت سامنے تھی۔ کئی بار میں کھلے سمندر میں بیمار ہوا۔ بچنا نا ممکن تھا کہ کسی نے لانچ کو ریسکیو کیا اور ہم سات لڑکے تھے۔ جنہیں اُس جگہ پھینکا گیا جو فرانس اور انگلینڈ کی سرحد تک چھوٹا سا شہر کیلے آتا ہے۔ جو انگلش چینل پر بنی ہوئی ٹنل کے آخر میں دائیں جانب کو پڑتا ہے۔ یہاں ایک کچی آبادی میں ہم تین لڑکوں کو پھینک دیا گیا۔ جن میں سے ایک میں ہوں یہاں تک پہنچا۔ باقی دو کا علم نہیں اور چار لڑکے جن میں سے ایک منڈی بہاؤ الدین کا تھا، ایک لالہ موسیٰ کا اور دو گجرات سے تھے۔ لانچ میں خوراک اور پانی کی کمی

سے مر گئے اور ان کی لاشوں کو لانچ سے سمندر میں گرا دیا گیا۔ ان کے خاندانوں کو شاید پتہ ہی نہیں کہ وہ کہاں ہوں گے۔

میں یہ سب دیکھ رہی تھی، سن رہی تھی۔ میرے سامنے پندرہ نوجوان نہیں مستقبل کی پندرہ لاشیں بیٹھی تھیں۔ اُن کی وکیل خود زندگی میں اپنے بدلے کے لئے تڑپ رہی تھی تو میں کیا توقع رکھتی کہ یہ پندرہ لوگ جو ایک چھوٹے سے کمرے میں قید ہیں کبھی رہا ہو سکیں گے کہ نہیں ـــــ ایسے میں مجھے "کیلے" کی کچی آبادی کا علم نہیں تھا تو میں نے فرانس کے پہلے شہر "کیلے" کا پوچھا جو لندن اور فرانس کی سرحد پر ہے۔

"تو وہاں کچی آبادی سے کیا مطلب تھا؟" اس پر وہ نوجوان بولا۔

"یہ کچی آبادی یورپی ملکوں نے خود قائم کی ہے کہ جن غریب ملکوں سے غیر قانونی طور پر ان ملکوں کے لوگ یورپ میں کہیں بھی پکڑے جائیں گے اُن کو یہاں اس آبادی میں ڈالا جائے گا کیونکہ وہ دنیا کا کوڑا کرکٹ ہیں اور دنیا نے کوڑا کرکٹ کو ایک جگہ ٹھکانے لگانے کے لئے کوئی نہ کوئی جگہ مخصوص کر رکھی ہوتی ہے تو یہ وہی جگہ تھی۔ اور وہاں کچی آبادی کی طرح کے رہنے کے لئے پلاسٹک کے شیلٹر تھے۔ پانی کے لئے فرانس نے ایک لائن دے دی تھی کہ گندگی بہہ جائے۔ گویا یورپی ملکوں نے دنیا کے کوڑے کو ٹھکانے لگانے کے لئے یہ جگہ مخصوص کر دی تھی۔ اب وہاں کئی ملکوں کے لوگ تھے۔ جن میں انڈیا، پاکستان، بنگلہ دیش، نائجیریا، الجیریا، یمن، روسی ریاستوں کے لوگ اور البانیا، مصر، مالٹا، سلوواکیا، اور اس طرح کے ملکوں کے لوگ تھے۔ ان ملکوں کے لوگوں نے وہاں اپنی ایک بستی آباد کی ہوئی تھی اور فرانس نے اپنی حدود سے باہر اُن کو جگہ دے دی تھی۔ دنیا کی انسانی حقوق کی تنظیموں نے وہاں پر اپنا کاروبار چمکا رکھا تھا۔ مثلاً یہ کہ ہفتے دس دن بعد آ کر راشن دے جاتے تھے اور اُن کے لئے تقریر کر جاتے تھے۔ جس سے وہاں رہنے والے ہزاروں لوگ جن کے ساتھ بچے اور بیویاں بھی تھیں، کچھ دیر کے لئے اس امید پر رہنے لگتے تھے کہ شاید اُن کو یہاں رہنے کے حقوق مل جائیں ـــــ"

اب میں اور اُن کی وکیل ایک دوسرے کو دیکھنے لگی تھیں کہ یہ پندرہ لوگ یہاں تک تو پہنچ گئے۔ اب ان کا کیا ہوگا؟

وہ نوجوان بولا کہ اس آبادی نے اب مستقل حیثیت اختیار کر لی ہے۔ جیسے پاکستان کی کچی آبادیاں شہروں سے ہٹ کر آباد ہوتی ہیں پھر ان کچی آبادیوں کو اس جگہ کے حقوق مل جاتے ہیں۔ سرکار انہیں جہاں ہیں

جیسے ہیں کی بنیاد پر اپنے گلے سے اُتار پھینکتی ہے۔ ایسے ہی یہ بستی بھی اب پرانی ہو چلی ہے۔ اب یہ بستی ایک خاندان ہے سب کا جینا مرنا ساتھ ہے۔ نہ کوئی پاکستانی ہے، نہ بنگلہ دیشی، نہ انڈین نہ افریقی۔ وہ سب مہاجر ہیں اور بس۔ اب تو ان کے آپس میں رشتے بھی ہونے لگے ہیں جو بچے تھے اب بڑے ہو رہے ہیں۔

''تو گذر اوقات کیسے ہو رہی ہے؟''

''میں نے بتایا ناں کہ انسانی حقوق اور اقوامِ متحدہ کی کچھ تنظیمیں جو بھاری فنڈ لیتی ہیں وہ آ کر یہاں راشن دے جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ میرے جیسے لڑکے اور جوان لوگ اِدھر اُدھر مارا ماری کر کے پولیس سے بچ کر یا پولیس سے دوستی لگا کر نکل جاتے ہیں اور کچھ جگاڑ کر کے واپس آ جاتے ہیں کہ پیرس میں اُن کے لئے فٹ پاتھ کے علاوہ کوئی جگہ نہیں۔ اکثر نوجوان جن کی فیملی نہیں ہے وہ انگلش ٹنل کے ذریعے جانے والے ٹرکوں اور ریل گاڑیوں میں گھسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اکثر اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر وہ جان کو داؤ پر لگا کر لٹکنے اور چمٹنے کے لئے اکثر اپنی جان کھو بیٹھتے ہیں۔ ایک نے تو ریل گاڑی کے پہیے کے ساتھ جو لوہے کا راڈ ہوتا ہے، خود کو اس سے چمٹا لیا اور جب ریل گاڑی ٹنل میں داخل ہوئی تو اندھیرے میں اُسے کچھ پتہ نہ چلا۔ جب سانس گھٹنے لگا تو ہاتھ پاؤں مارے ہوں گے۔ ظاہر ہے میں تو وہاں نہیں تھا اور پھر اُس کے جسم کے لوتھڑے بھی کسی نے نہیں دیکھے۔''

اب اُن کی وکیل نے بتایا کہ ان نوجوانوں میں سب سے سینئر پچاس سال کا اکرم ہے جو ایک عجیب وغریب کردار ہے۔ وہ موجود تھا اور اُسے پاکستان چھوڑے پچیس سال ہو چکے تھے۔ یعنی جب وہ کڑیل جوان تھا تو روزگار نے اُسے بھگایا اور وہ اب تک بھاگ رہا تھا۔ وہ پنجاب کے چھوٹے سے قصبے بوریوالہ سے نکلا تھا۔ یونان میں پھنسا کچھ سال وہاں کسی مافیا کے لئے مشقت کی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مارا گیا ہوتا۔ چالاکی سے بچتا رہا اور پھر وہی سفر کہ یونان سے یورپ میں داخل ہوا۔ اکیلا کسی نہ کسی کے سہارے انگلینڈ ایک ٹرالر میں دم گھٹنے کے قریب تھا کہ راستے میں کسی وجہ سے ایک ملک کی سرحد پر ٹرالر کو روکا گیا اور کھولا گیا تو نیم جان اکرم لیٹا تھا۔ اس طرح اُس کی جان بچی مگر ایک کہانی یورپ پولیس کے ہاتھ لگ گئی۔ خیر تو اکرم وہاں کی جیل میں رہا اور پھر نکلا اور کسی طرح وہ انگلینڈ پہنچا۔ لندن میں کئی جگہوں پر چھوٹے چھوٹے کام کئے۔ چھاپہ پڑا تو وہاں سے بھاگ کر دوسری جگہ پہنچا اور آخر میں یہاں گلاسگو میں آ گیا۔

میرے لئے یہ سب ایک تجربہ تھا۔ بہر حال میں نے اُن سے پوچھا۔ ''اب آپ یہاں ایک کمرے

میں کیوں ہیں اور آپ کے اپنے گھر والوں سے کوئی رابطہ یا اُن کے لئے مالی مدد بھیجنے کا بندوبست ہے یا نہیں؟''

یہ بات اُن کے وکیل نے کی اور بتایا کہ اس طرح کے جو غیر قانونی طور پر بے شمار ایشین آ چکے ہیں، انہیں اُن ہی کے ملکوں کے بزنس کرنے والوں نے یرغمال بنالیا ہے اور سستی لیبر انہیں مل گئی ہے۔ پورے انگلینڈ میں جہاں جہاں پاکستانیوں اور انڈین کے ریسٹورنٹس یا گراسری شاپس ہیں، وہاں سب لیبر غیر قانونی تارکینِ وطن کی ہے۔ اس لئے کہ جو بھی انگلینڈ میں داخل ہوتا ہے، انہی کے پاس پناہ کے لئے آتا ہے۔ اور پھر وہ ان کو ایک کمرے میں اکٹھا رکھتے ہیں اور دن بھر مشقت لیتے ہیں اور صرف کھانا دیتے ہیں یا اپنے گھر پاکستان میں فون کرنے کی سہولت دیتے ہیں۔ اکثر چھاپہ پڑ جائے تو خفیہ تہہ خانے رکھے ہیں اُن میں چھپا لیتے ہیں۔ یہ لوگ ڈر کی وجہ سے کہیں جا نہیں سکتے نہ بھاگ سکتے ہیں۔ اچھے دنوں کی آس میں اس ایک کمرے میں بند ہیں۔ کب ان کی بند مٹھی سے قسمت باہر آئے گی کسی کو معلوم نہیں۔

''ان کی کسی قسم کی تفریح کا کوئی انتظام نہیں ہے؟'' میں نے بیچ میں پوچھ لیا۔

''یہ جو ٹیلی وژن ہے اس پر انڈین فلمیں اور پاکستان کے سٹیج ڈراموں کی وڈیوز یہ دیکھتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ اور اس میر پورئیے کے ریسٹورنٹ میں بار بھی ہے۔ بڑا کچن ہے۔ کئی طرح کی کوزین تیار ہوتی ہے کیونکہ یہ ریسٹورنٹ ایک وقت میں سو سے زیادہ لوگوں کو بیک وقت کیٹر کر سکتا ہے اور یہ پندرہ لوگ یہ سب سنبھالتے ہیں۔ اس کے علاوہ شادیوں اور تقریبات کی کیٹرنگ الگ ہے۔ کل جو زنانہ مجلس میں آپ نے کھانے دیکھے تھے اِسی ریسٹورنٹ نے ان کی کیٹرنگ کی تھی۔ ان میں کچھ لوگ بارٹینڈر ہیں۔ زیادہ تعداد میں سکاٹش یہاں آتے ہیں یہ ان کو شراب بنا کے دیتے ہیں۔ کچھ تندور پہ کام کرتے ہیں۔ کچھ سبزیاں کاٹنے کے ماہر ہیں۔ کچھ بہت اچھے شیف ہیں۔ کچھ ویٹرز ہیں۔ یہ سب اپنے کام کے ماہر ہیں اور انہوں نے یہ کام یہاں سیکھا ہے۔''

''اب ان کا مستقبل کیا ہے؟''

''میں ان کا کیس لڑ رہی ہوں اور کورٹ سے کچھ عرصے کے لئے ان کے رہنے کی مہلت مل گئی ہے۔ امید ہے میں یہ مہلت بڑھواتی رہوں گی۔ اگر یہ کیس ہار گئے تو انہیں وہ کسی جہاز میں بٹھا کے پاکستان بھیج دیں گے۔ اس مقصد کے لئے ایک جیل موجود ہے جہاں ان کو پہلے رکھا جاتا ہے پھر جہاز چارٹر کر کے ان کو بھیج

دیا جاتا ہے۔''

رات کا کوئی حصہ تھا۔ میں نے انہیں نہیں دیکھا۔ آنکھیں جھکائے ہم باہر آ گئے اور اگلی صبح میں واپس آ گئی۔ مجھے یوں لگا ہے کہ وہیں سے آ رہی ہوں۔ مجھے نہیں پتہ کہ میں کب گلاسگو گئی تھی اور کب واپس آئی۔ میرے ساتھ بھی یہ زمانوں کی آنکھ مچولی شروع ہو چکی تھی اور شاید میں اس کا لطف لینے لگی تھی۔ اور اب میں آنس سے مقابلہ کرنے لگی تھی کہ وہ کہیں بھی جا سکتے ہیں اور واپس آ سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں زمانوں کے گرداب میں آ جا سکتی؟

ایک دن عجیب تجربہ ہوا کہ آنس نے کہا کہ ناشتے کے بعد انہیں ڈرائینگ روم میں کسی نے ملنے آنا ہے تو مجھے وہاں بٹھا دیں اور گرمی تھی اس لئے اے سی چلا دیں۔۔۔۔۔ ملازموں کو بھی اس کی اطلاع تھی کہ کسی نے آنا ہے۔ ایسا ہی ہوا اور آنس کو مقررہ وقت پر ڈرائینگ روم کا اے سی چلا کر بٹھا دیا گیا۔ اور ملازم چلے گئے۔ میں اپنے کاموں میں الجھ گئی۔ ملازم نے وقت پر چائے بھی پہنچا دی۔ ایسے میں کچھ دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ میں دیکھوں آنس کا کون سا مہمان آیا ہے اور انہیں اُس سے کیا باتیں کرنی ہیں۔ اب جو میں نے دروازے کی اوٹ سے دیکھا تو ایک کرسی کی طرف چہرہ کئے ہوئے باتیں کر رہے تھے جیسے وہاں کوئی بیٹھا ہو۔ مگر وہاں تو کوئی نہیں تھا۔۔۔۔۔ وہ اس طرح باتوں میں مگن تھے کہ جیسے سامنے بیٹھی شخصیت اُن سے بات کر رہی ہے اور اُس سے مکالمہ کر رہے ہیں۔ مجھے ڈرامہ نگار آئینیسکو کا مشہور ڈرامہ ''The Chairs'' یاد آ گیا۔ جس میں ایک ریٹائرڈ بیوروکریٹ ملک کی تمام بڑی ہستیوں کو اور عہدیداروں کو ایک شام ڈنر پر دعوت دیتا ہے تا کہ اپنی زندگی اور اپنے کیریئر کا سچ اُن کو بتا سکے۔ اُس کی بیوی اور وہ ڈنر سوٹ میں تیار ہو کر شام ہوتے ہی استقبال کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پہلی گھنٹی بجتی ہے۔ وہ خود دروازہ کھولتا ہے اور کہتا ہے۔'' آیئے آیئے تشریف لائیں۔ اوہ مسٹر پریذیڈنٹ سب سے پہلے آپ آئے۔ خوش آمدید آیئے۔'' اور اُسے لے کر وہ مرکزی کرسی کی طرف آتے ہیں مگر وہاں تو کوئی نہیں تھا۔ مگر وہ ایسا ظاہر کرتا ہے کہ پریذیڈنٹ ساتھ چل کے آ رہا ہے۔ پھر وہ ظاہر کرتا ہے کہ پریذیڈنٹ کرسی پر بیٹھ چکا ہے اور پھر وہ اُس سے باتیں کرتا ہے۔ اور جیسے پریذیڈنٹ نے کوئی بات کی ہو تو وہ اُس کا جواب اس طرح دیتا ہے جیسے پریذیڈنٹ کی بات بھی اس مکالمے میں سننے والوں کو سمجھ آ جائے۔ پھر گھنٹی بجتی ہے تو پھر وہ جاتا ہے جیسے کسی بھی سوشل ڈنر میں میزبان کا یہ فرض ہوتا ہے اور وہ پھر دروازے پر آتا ہے اور ایک غائب شخص کا استقبال کرتا ہے۔ اوہ آیئے وزیر اعظم صاحب۔ شکریہ آپ نے عزت بخشی اور اُسے

لے کر دوسری کرسی تک آتا ہے اور بٹھاتا ہے۔ لیکن وہاں کوئی نہیں ہے۔ پھر اُس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ کر مکالمہ کرتا ہے جیسے وہاں واقعی وزیراعظم موجود ہے۔ اس طرح ایک ایک کر کے ساری کرسیاں بھر جاتی ہیں گویا سب نمایاں شخصیات آ چکی ہوں۔ لیکن یہ سب میزبان کی خود فریبی ہے۔ وہ ان سے باری باری کرسیوں پہ جا کر مکالمے کا ڈھونگ رچاتا ہے۔ دیکھنے والوں کو محسوس ہوجاتا ہے جیسے ان کرسیوں میں سب عہدیدار اور بڑی شخصیات واقعتاً بیٹھی ہوئی ہیں۔ یہ اُس کے مکالمے کا کمال ہے کہ وہ اُن مہمانوں کی باتوں کو بھی اپنی بات کے اندر سمو کر پیش کرتا ہے کہ معلوم ہوجاتا ہے جیسے خالی کرسی بول رہی ہو۔ آخر میں وہ میزبان ڈنر سے پہلے کہتا ہے کہ جناب میں نے آپ کو زحمت اس لئے دی ہے کہ میں اپنا زندگی کا تجربہ جو میں نے اپنی ملازمت کے دوران حاصل کیا ہے آپ تک پہنچا سکوں۔ لیکن میری مشکل یہ ہے کہ اس ملازمت نے میری آواز چھین لی ہے۔ اس لئے میں اپنے ایک ملازم کو بلاتا ہوں جو میری جگہ میری نمائندگی کرے گا۔ پھر وہ ملازم خالی مگر بھری ہوئی کرسیوں کے سامنے آتا ہے اور آ کر گونگے پن میں کچھ کہنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے گھگھیا کر رہ جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ میزبان کہتا ہے۔ حضرات اس کی آواز گم ہو چکی ہے۔ جیسے میری آواز گم ہو چکی ہے کہ میں نے سرکاری ملازمت میں بہت کچھ حکومت کے لئے کیا اور میں آہستہ آہستہ اپنی آواز سے محروم ہوتا گیا۔ اور پھر وہ انہیں ڈنر کے لئے ڈائننگ کی طرف لے جاتا ہے۔ خالی کرسیاں سٹیج پر پڑی ہیں اور اس پر حاضرین کی تالیاں گونجتی ہیں کہ میزبان نے اپنے ملک کی بڑی شخصیات اور سرکاری عہدیداروں کو آئینہ دکھا دیا ہے کہ تم سب صرف کرسیاں ہو۔ تمہارا وجود تمہاری شخصیت تمہارا چہرہ نہیں ہے۔ تم زندگی بھر ایک کرسی بن کر رہتے ہو۔ مجھے یہ ڈرامہ یاد آ گیا تو خیال آیا کہ شاید آنس بھی کسی ایسی شخصیت سے باتیں کر رہے ہوں گے جس کی اپنی کوئی شکل اور شخصیت نہیں ہوگی۔ جو محض ایک کرسی کی حیثیت میں جی رہا ہو۔ میں اُن کی باتیں سننے لگی۔ تو مجھے پتہ چلا یہ کوئی سرکاری عہدیدار نہیں ہے۔ یہ تو پوری شخصیت والا کردار پنڈت جواہر لال نہرو ہے۔ جو آنس سے ملنے آیا ہے۔ اب وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہے تھے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ محض ایک کرسی تھے۔ آنس ایک مؤرخ ہیں تو اُن کے پاس تو کوئی بھی تاریخی شخصیت آ سکتی تھی۔

''پنڈت صاحب! میں آپ کا مداح ہوں اور میں دیکھ رہا ہوں —— آپ میرے سامنے بیٹھے ہیں۔ سچ سچ بتائیں آپ جب لندن کے دورے پر تھے تو لیڈی ماؤنٹ بیٹن اور آپ چند گھنٹوں کے لئے کسی ریڈار پر نہیں تھے۔ آپ کہاں تھے؟ ۔۔۔۔۔ نہیں پنڈت صاحب آپ کو سب پتہ ہے اور مجھے بھی پتہ ہے۔

میں مؤرخ ہوں کوئی ادیب نہیں ہوں کہ خواب دیکھ کر بات کروں تو مجھ سے چھپنے کی کوشش نہ کریں۔آپ جس ہوٹل میں تھے اُس کے مالک نے مجھے ساری تفصیل بتادی ہے۔اور آپ کے ادنیٰ سے افسر نے اپنی بائیوگرافی میں یہ لکھا ہے کہ پنڈت صاحب کچھ گھنٹوں کے لئے انڈین ریڈار سے غائب تھے۔۔۔۔۔۔جانے دیں پنڈت صاحب۔مان لینے میں کیا ہرج ہے۔آپ بنیادی طور پر رومانٹک آدمی ہیں۔مان لیں نا۔۔۔۔۔ہاں یہ ٹھیک ہے اگر آپ رومانٹک نہ ہوتے تو انڈیا آج جس جگہ ہے اس جگہ نہ ہوتا۔انڈیا کو آزادی کے بعد ایک عاشق مل گیا اور ہمیں ایک کامیاب وکیل——اب یہ فرق تو پنڈت جی آپ بھی جانتے ہوں گے۔ہاں تو آپ نہ بتائیں میں بتادوں کہ مجھے ہوٹل کے مالک نے یہ بتایا تھا کہ آخر میں بھی تاریخ دان ہوں کوئی اردو ادب کا نقاد نہیں ہوں۔۔۔۔۔پنڈت جی ہوٹل کے مالک نے مجھے بتایا کہ آپ ایک عام آدمی کی حیثیت سے آئے اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن بھی اپنی ذاتی گاڑی میں آئیں اور پھر آپ نے وہاں چائے پی اور پھر آپ دونوں اُس ہوٹل میں گئے جہاں آپ ٹھہرے ہوئے تھے یا کسی دوست کے اپارٹمنٹ میں گئے۔یہاں مؤرخ خاموش ہے۔مگر میں کیسے خاموش رہ سکتا ہوں۔۔۔۔۔پنڈت صاحب ایک بات تو آج بتادیں۔آپ اور ماؤنٹ بیٹن دونوں پاکستان بنانے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے تھے؟ جبکہ خان غفار خان، ابوالکلام آزاد، گاندھی اور دوسرے مسلمان علماء ہندوستان کی تقسیم نہیں چاہتے تھے کہ یہ صرف ہندوستان کی تقسیم نہیں تھی، مسلمانوں کی تقسیم بھی تھی اور وہ بھی تین حصوں میں۔میں دیکھ رہا ہوں آپ زیرِ لب مسکرا رہے ہیں۔پنڈت صاحب آپ مسلمانوں سے خوفزدہ تھے کہ اُن کا ایک جگہ ہونا آپ کے مستقبل کے لئے مسئلہ بن سکتا تھا۔“

مجھے ایسے لگا جیسے واقعی پنڈت نہرو وہاں بیٹھے ہیں اب وہ مجھے بھی دکھائی دے رہے تھے۔

”پنڈت جی پاکستان کے مطالبے پر تو آپ کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے کہ مسلمانوں کی ساری وراثت آپ کے پاس رہ جائے گی اور مسلمان کئی حصوں میں تقسیم ہوکر کسی قابل نہیں رہیں گے۔۔۔۔۔نہیں نہیں پنڈت شرماؤ نہیں۔بات یہی تھی اچھا——تو۔۔۔۔۔جب ریڈکلف مشن ہندوستان کے نقشے پر سرخ لائن سے تقسیم کی لکیر کھینچ رہا تھا اور ٹیڑھی میڑھی لکیر بنائی گئی اور صرف پانچ ہفتوں میں یہ سب کام مکمل کرنا تو تھا اور جب اس پر کام ہو رہا تھا تو وہاں بھی آپ ہی کے لوگ ماؤنٹ بیٹن نے مقرر کئے تھے۔کیا یہ سچ نہیں ہے؟۔۔۔۔۔بس بس پنڈت اب میں آپ کی کیا سنوں۔اب آپ کو میری سننی پڑے گی۔ہندوستان کے اگر تین ٹکڑے کرنے تھے تو جناب کسی تیز چھری سے تو کرتے کند چھری سے کیوں کئے۔یہ میں نہیں کہہ رہا یہ

آپ کا اور ہمارا سعادت حسن منٹو لکھ رہا ہے کہ میرے ہندوستان کے کند چھری سے ایسے بے دردی سے ٹکڑے کیے کہ آدھا گاؤں اِدھر تو اُدھا گاؤں اُدھر۔ آدھا گھر اِدھر تو آدھا گھر اُدھر۔ ارے پنڈت جی تمہارے ہی لوگوں نے اس تقسیم کی لائن پر فلم بنائی ہے "بیگم جان"۔ ذرا دیکھ لو کیسے آدھا گھر اِدھر آدھا اُدھر رہ جاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔کیا کہا—— ایسا کس فارمولے کے تحت ہوا؟ نہیں پنڈت گورداسپور کو پاکستان میں آنا تھا اور کشمیر کے ٹکڑے کرنے کی کیا حکمت تھی۔ بتائیں ناں۔ کشمیر تو مسلمانوں کی اکثریت کا علاقہ تھا۔ چلو میں مان لیتا ہوں حیدرآباد دکن پاکستان سے دور تھا۔ لیکن جونا گڑھ کے ساتھ کیا ہوا—— پنڈت جی مکمل مسلمانوں کا علاقہ تھا۔ اور کیا یادگاریں وہاں مسلمانوں کی تھیں۔ مساجد کس کس مسلمان حکمران نے بنائی تھیں—— اب جانے دو پنڈت۔ اس تقسیم کی لائن کو آپ آج دیکھنا چاہیں تو پاکستان بلکہ گذشتہ مغربی پاکستان کے نقشے کو دیکھیں کس باریکی سے اس کی آؤٹ لائن منحنی خط میں چلتی ہے۔ اور پنڈت تمہیں پتا تھا کہ مشرقی پاکستان زیادہ دیر تک مغربی پاکستان کے ساتھ نہیں چل سکے گا کیونکہ تم جانتے تھے ثقافت اور زبان کی اپنی مطلق العنانیت ہوتی ہے جو خود کو منوا لیتی ہے۔ اور پنڈت یہ بھی تمہیں پتہ تھا کہ جس دن مشرقی پاکستان تاریخ کے نقشے میں دفن ہوگا اُسی دن مغربی پاکستان بھی دفن ہو جائے گا اور بیچ میں سے صرف پاکستان کا جنم ہوگا۔ موجودہ پاکستان کا جنم 1947ء میں نہیں ہوا 1971ء میں ہوا ہے۔ موجودہ پاکستان کی تاریخ (73) تہتر سال کی نہیں ہے۔ پنڈت جی پاکستان کی تاریخ (49) اُنچاس سال کی ہے۔ میں تو پاکستان کو اُنچاس سال کا سمجھتا ہوں۔ کہ اس سے پہلے کی تاریخ اور تھی۔"

اب میں یہ سب سن رہی تھی اور مجھے پنڈت نہرو مضطرب دکھائی دے رہے تھے جیسے پہلی بار کسی نے انہیں کٹہرے میں کھڑا کر دیا ہو۔ لیکن آنس کا مجھے پتہ تھا وہ اپنے مہمان کے ساتھ اتنے سنگدل نہیں ہوتے تھے۔

"پنڈت جی آپ بنگالیوں کو جانتے تھے جناح صاحب نہیں جانتے تھے۔ جناح صاحب بمبئی کے اور دلّی کے کامیاب وکیل تھے اور بہت شاندار انگریزی بولتے تھے اور بہت قانون کی زبان کے ماہر تھے۔ مگر آپ تو سیاست دان تھے جناب۔ اس لئے آپ کو پتہ تھا کہ مشرقی پاکستان میں بنگال اور بہار کے مسلمانوں کو ایک جگہ جمع کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ایک آگ ایک پانی—— اور پھر آگ پانی کا کھیل ہوا۔ ایک طرف مکتی باہنی تو دوسری طرف الشمس البدر اور تیسری طرف پاکستان آرمی۔ اور پھر اردو بولنے والوں کی میڈیا اور سیاست

میں برتری ——— پنڈت جی یہ سب آپ جانتے تھے۔ بولیں جانتے تھے کہ نہیں۔۔۔۔۔۔''

اب میں نے دیکھا پنڈت نہرو مسکرائے۔ مجھے ایسے لگا کہ واقعی وہ کرسی پر بیٹھے ہیں اور آنس کی ہر بات کو سمجھ رہے ہیں اور پھر وہ بولے کہ ہاں جناح صاحب اور گاندھی صاحب یہ سب نہیں جانتے تھے۔

''تو پھر پنڈت جی آپ کی سیاست تو اپنے فائدے میں چل رہی تھی۔ اور اب میں آپ کے ایک مداح کی حیثیت میں بولوں گا۔ آپ نے کمال کیا کہ اپنے ہندوستان میں جاگیرداری نظام کو منسوخ کر دیا۔ آپ یہ کر سکتے تھے ہم نہیں کر سکتے تھے کہ ہماری سیاسی اسمبلی میں اکثریت ہی اُن جاگیرداروں کی تھی اور پھر آپ نے جو پڑھے لکھے مسلمان پاکستان میں دھکیل دیئے تھے وہ بیوروکریٹ بن گئے اور ان دونوں کی ملی بھگت سے پاکستان غریب ہوتا چلا گیا۔۔۔۔۔۔ پنڈت جی جانے دیں مسلمان ہندوستان میں ہندوؤں کی غلامی میں چلے گئے۔ کشمیری مسلمان دونوں طرف کے دربدر ہو گئے، محصور ہو گئے، رائیگاں ہو گئے۔ اور پھر پنڈت جی خدا لگتی کہیں کیا آپ نے ہندوستان کے مختلف شعبوں کے اعلیٰ دماغ اور نامی گرامی تخلیقی شخصیات کو پاکستان جانے سے نہیں روکا تھا۔ آپ چاہتے تھے مسلمانوں نے جن شعبوں میں ہندوستان کی تہذیب وثقافت کو دنیا میں چار چاند لگائے ہیں وہ پاکستان نہ جائیں۔ مسلمان تقسیم ضرور ہوں مگر مسلمانوں کی تلچھٹ پاکستان چلی جائے اور کریم آپ کے پاس رہے۔ اب مسکرائیں نہیں میں مؤرخ ہوں۔ آپ سب جانتے ہیں کہ قرۃ العین حیدر، بڑے غلام علی خان، ساحر لدھیانوی اور پھر سجاد ظہیر کو مچھ جیل بلوچستان سے رہا کرا کے، واہگہ بارڈر پر انڈین پاسپورٹ اُن کے حوالے کر کے اُنہیں آپ نے دلّی بلا لیا اور ترقی پسند تحریک کو پاکستان سے اغوا کر کے اپنے ملک میں لے گئے۔ پنڈت جی، سجاد ظہیر کا دلّی میں کسی اور ترقی پسند نے سلیقے کا استقبال نہیں کیا تھا۔ یہ اور بات ہے مگر پنڈت جی ایک اچھا کام ہوا کہ سجاد ظہیر کی ایک بیٹی نے انڈیا کے بڑے سٹار راج ببر سے شادی کی اور پھر اُن کی ایک بیٹی نے ایک اور ایکٹر پنکج کپور سے شادی کی جو انڈین انڈسٹری کا بہت بڑا ایکٹر ہے۔ اُن دونوں سے ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام شاہد کپور رکھا گیا۔ ماں بھی راضی، باپ بھی راضی اور پھر شاہد کپور نے جو فلمیں دی ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اُس میں کس کس کی Legacy شامل ہے اور ہاں پنڈت جی سجاد ظہیر کی تیسری بیٹی نور ظہیر نے شادی کی ایک بیٹی ہوئی پھر وہ شادی نہ چلی۔ نور ظہیر نے سجاد ظہیر کا پرچم اٹھائے رکھا۔ اور پھر ابھی دو دن پہلے خبر آئی ہے کہ بی بی سی اردو سروس کے بابا آدم یاور عباس جو لکھنؤ ہی کی مٹی سے جنم لے کر پہلے کراچی اور پھر لندن سدھارے تھے۔

اس وقت ایک سو ایک سال کی عمر میں انہوں نے گلاسگو میں نور ظہیر سے شادی کی ہے اور یاور عباس نے سرخ واسکٹ پہن کر یہ شادی منائی ہے۔ پنڈت جی اب آپ کیا کہیں گے کہ آپ نے مسلمان تخلیق کاروں کو روکنے کی کیوں کوشش کی کہ آپ کا ہندوستان کو ذہانت کے میدان میں آگے لے جانے کا وژن تھا۔ اس لئے آپ نے ایک ملیح آباد کے شوخ شنگ برائے نام ترقی پسند شاعر کو جس کے اندر کئی نواب دم توڑ چکے تھے، کئی حسرتوں کے مارے عاشقوں کی قبریں اُن کی شاعری میں بن چکی تھیں۔ انہیں آپ نے ہندوستان میں آباد ہونے کی پوری کوشش کی۔ کاش آپ اس کوشش میں کامیاب ہو جاتے تو وہ بے چارے اسلام آباد میں اس طرح آخری وقت نہ گذارتے کہ ان کا پیشاب رفع ہو جاتا تھا اور پھر ــــــ خیر چھوڑیں مشاعروں میں اکثر اُن کا پیشاب بہہ جاتا تھا۔ سٹیج سے نیچے ایک لکیر آتی تھی۔ اب نام نہ لینا۔ اللہ بخشے اُن کو آپ نے ہندوستان لانے کی پوری کوشش کی۔ پنڈت جی میں جانتا ہوں آپ نہ کہیں کہ آپ کو اردو زبان سے عشق تھا۔ جس کی وجہ سے یہ آپ سب کر رہے تھے ــــــ

پنڈت جی آپ کیوں مجھے ملنے آئے ہیں میں جانتا ہوں۔ مگر ایک بات کا اعتراف مجھے کرنا ہے۔ آپ نے ہندوستان کو آزادی ملتے ہی ادب اور فنونِ لطیفہ میں خود مختار کرنے کا جو کام کیا وہ دنیا دیکھ رہی ہے۔ آپ نہ بولیں میں بتاتا ہوں۔ آپ نے فلم کے میڈیم کو بچانے کے لئے کئی ادارے بنائے۔ جو بیوروکریسی سے آزاد تھے۔ ایسے ہی ادب رقص موسیقی اور تھیٹر کے ساتھ مختلف زبانوں کی ترقی کے ادارے بھی خود مختار اور مالی طور پر آزاد بنا دیئے تاکہ سرکار کا عمل دخل نہ ہو اور آپ کے وہ سب ادارے پھل پھول گئے۔ ہم نے بھی ادارے بنائے اور انہیں تیسرے درجے کی بیوروکریسی کی گود میں بٹھا دیا۔ وہ ڈائن اپنے ہی بچے کھا گئی۔

پنڈت جی آپ کو کیا ہوا ہے؟ آپ خوش نہیں ہیں ــــ اچھا تو آپ اِس لئے میرے پاس آئے ہیں کہ میں ایک دیانت دار تاریخ دان ہوں۔ وہ تو آپ کے ہاں بھی بہت ہیں کس کس کا نام لوں ــــ ہاں سمجھ گیا وہ سب گونگے ہو گئے ہیں نریندر مودی کے سامنے۔ ہاں اب سمجھا آپ میرے پاس کیوں آئے ہیں۔ پنڈت جی تاریخ دان نہیں بولتا ـــ تاریخ خود بولتی ہے۔ آپ بے فکر ہو جائیں ـــ آپ کے سیکولر انڈیا کو جو نقصان مودی پہنچا رہا ہے۔ اُس سے مسلمانوں کو برما کے مسلمانوں، روہنگیا کی طرح سرحد سے باہر پاکستان میں نقل مکانی پر مجبور کرنے کا سکرپٹ وہ بنا چکا ہے۔ لیکن اس سکرپٹ پر عمل سے پہلے ہی آپ کے انڈیا میں جو کچھ ہوگا۔ اُس کا کارپوریٹ سیکٹر کو علم ہی نہیں ہے۔ پوری دنیا سے کارپوریٹ سیکٹر جھاگ

کی طرح بیٹھ جائے گا۔ گلوبلائیزیشن کا عفریت ایک جرثومے سے خوفزدہ ہو کر پوری دنیا کی مارکیٹوں کو ایک سال سے زیادہ عرصے کے لئے بند کر دے گا۔ نہ کوئی برانڈ باقی بچے گا نہ کوئی مارکیٹ۔ ایک نیا ورلڈ آرڈر بنے گا۔ جس میں مودی اور ٹرمپ کی گنجائش نہیں ہوگی۔"

میں دروازے کے ساتھ لگی سن رہی تھی۔ اور دیکھ بھی رہی تھی کہ خالی کرسی پر پنڈت نہرو بیٹھے ہیں اور پھر وہ آہستہ سے اُٹھے۔ میں نے انہیں جاتے دیکھا پھر وہ دکھائی نہیں دیئے۔ آنس خاموشی سے اٹھ کر آ گئے۔ اب مجھے بھی وقت اور مقام سے نکلنے میں وقت نہیں لگتا تھا۔ جب چاہتی کسی زمانے میں چلی جاتی تھی۔ مگر یہ بہت بڑا عذاب تھا۔ کبھی کبھی تو میں اپنے لڑکپن میں پہنچ جاتی تھی جب مجھے میرا ڈرائیور سکول لے جاتے ہوئے مجھے گود میں بٹھا لیتا تھا —— میں پھر واپس اپنے حال میں آ جاتی تھی۔ میرے لئے ہر زمانہ خوفناک تھا اور ہے تو پھر میں نے سوچا کہ میں آنس کو دیکھوں۔ جب میں اُن کی سٹڈی میں گئی تو وہ خود سے باتیں کر رہے تھے۔ میں سننے کے لئے رُک گئی۔

"کیتھرین تمہاری بیٹی یا بیٹا آیا نہیں۔ تم نے کہا تھا ایک دن وہ میری تلاش میں آئے گی اور سوزین تمہاری بیٹی بھی نہیں آئی۔ میں انتظار میں ہوں۔ اس سے پہلے کہ میں نہ رہوں۔ پتہ ہے میں اس وقت پچاسی سال سے آگے نکل آیا ہوں —— ان کے انتظار میں زندہ ہوں۔ مگر زندگی میرے اختیار میں نہیں ہے۔ کیتھرین اور سوزین تم دونوں میرے ساتھ رہ رہی ہو —— کبھی الگ نہیں ہوئی ——"

میں یہ سن رہی تھی اور مجھے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ کیتھرین اور سوزین آنس کی زندگی میں کہیں آئی ہیں۔ جس کا مجھے علم نہیں ہے۔ وہ پہلے بھی اچانک سوزین اور کیتھرین کا نام لے کر وقت اور مقام سے پھسل جاتے تھے۔ جب سے انہیں یہ عارضہ لگا تھا —— اور اب دو لڑکیاں بھی اس کہانی میں آ گئیں۔ میں تو خود وقت کے دھارے میں آگے پیچھے ہو رہی تھی تو میرے لئے تو ہر بات حقیقت بھی تھی اور خواب بھی۔ اب یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ خواب کہاں ختم ہوا اور حقیقت کہاں سے شروع ہوئی۔ میرے خیال میں انسان کے خواب بھی اس کی دوسری زندگی ہے۔ ایک زندگی وہ دن میں گذارتا ہے اور ایک اور زندگی وہ خوابوں میں گذارتا ہے۔ کون کہتا ہے انسان آدھی زندگی سو کے گذارتا ہے۔ نہیں انسان بالکل نہیں سوتا۔ وہ دوسری زندگی میں جنم لے لیتا ہے۔ ایسے تو وہ قصہ داستان گو نے نہیں لکھا تھا "قصہ سوتے جاگتے کا"

اب میں آنس کے قریب گئی اور اب وہ خود سے بات نہیں کر رہے تھے۔ میں نے کہا۔ "پنڈت نہرو

چلے گئے؟"

"کب آئے تھے پنڈت نہرو؟"

"وہ کچھ دیر پہلے تو آئے تھے آپ سے ان کا مکالمہ ہوا تھا۔"

"نہیں، وہ تو نہیں آئے تھے۔ وہ تو شاید میرے خواب میں آئے تھے۔ یاد آرہا ہے کہ وہ آئے تھے۔ لیکن ایک گڑ بڑ ہوگئی۔ خواب میں مجھے پنڈت نہرو سے ایک گلہ کرنا تھا۔"

"کیسا گلہ؟ آپ نے تو پنڈت جی کی بہت کلاس لی۔"

"نہیں، پنڈت نہرو میرا مجرم ہے کہ میرا دوست۔ آرکیالوجسٹ معصوم صدیقی بھارت کی جیلوں میں اپنا ذہنی توازن کھونے کے بعد پاکستان پہنچا۔"

آنس سے میں نے پوچھا۔"یہ معصوم صدیقی کون تھا؟ آپ نے تو بتایا نہیں۔"

"تمہیں نہیں معلوم میرے ضمیر پر بوجھ ہے کہ میں پاکستان کے سب سے بڑے آرکیالوجسٹ کو بچا نہ سکا۔"

"مگر آپ نے یہ بات تو اب تک مجھے بتائی ہی نہیں ـــــ"

"میں نے اپنی زندگی کی ہر بات تمہیں کب بتائی؟"

"ہاں میں نے کبھی پوچھا بھی نہیں۔"

"تو پھر سن لو معصوم صدیقی پاکستان کا بہت ذہین آرکیالوجسٹ تھا یا شاید ابھی زندہ ہو۔ جو اپنی پی ایچ ڈی کے لئے انڈیا کے تاریخی علاقوں اور عمارتوں پر کام کر رہا تھا۔ باقاعدہ اُس نے تعلیمی کیٹیگری کا ویزا لگوایا تھا۔ وہ پشاور یونیورسٹی سے آرکیالوجی میں ماسٹرز کر چکا تھا۔ گندھارا پر اُس نے بہت اچھی ریسرچ کی ہوئی تھی اور اس حوالے سے جاپان والوں نے اُسے پی ایچ ڈی کے لئے سکالرشپ دیا جو اُس نے میرٹ پر حاصل کر لیا۔ اُس کے تین ریسرچ پیپرز جاپانی میں ترجمہ ہو کر ٹوکیو یونیورسٹی کے ریسرچ جرنل میں چھپ چکے تھے۔ معصوم صدیقی کے دادا نامی گرامی حکیم تھے اور اس حوالے سے برما، نیپال اور چین کے جنگلوں کی خاک چھان چکے تھے۔ وہ معصوم صدیقی کو بچپن میں کہانیاں سناتے تھے۔ جن میں ان جنگلوں، مندروں، مجسموں اور عبادت گاہوں کا کثرت سے ذکر ہوتا تھا۔ بس یہ بیج ایسا بویا گیا کہ معصوم صدیقی نے اپنا مسکن انڈس دریا کے راستوں کو بنا لیا اور پھر گندھارا تہذیب کے دھاروں میں بہہ نکلا۔ اُس کی یونیورسٹی کے پروفیسر نے مجھے بتایا کہ

پاکستان میں اس شعبے میں یہ پروفیسر دانی کا بھی باپ ہے۔''

''پروفیسر دانی کو آپ کس جگہ درجے پر رکھتے ہیں؟'' میں نے جان کے پوچھا۔

''پروفیسر دانی۔۔۔۔۔ہاں میں کئی بار مل چکا ہوں''۔۔۔۔

''بات یہ نہیں۔اس شعبے میں وہ کس مقام پر ہیں۔جاپانی تو ان کا ذکر۔۔۔۔''

''اُن کا ذکر جاپانی اس لئے کرتے ہیں کہ وہ کسی اور کو جانتے نہیں۔اور پھر شروع میں کچھ جاپانیوں کو انہوں نے پڑھا دیا۔جنہوں نے سر جھکا کے اُن کا جھنڈا اٹھالیا۔میں تو مؤرخ ہوں ناں تو اب میرے سامنے تو صرف تاریخ ہی نہیں ننگی ہوئی تاریخ کے نام پر پلنے والے بھی ننگے ہو چکے ہیں۔''

''میں سمجھی نہیں۔پروفیسر دانی اکیلے راج کرتے رہے اس سنگھاسن پر۔آخر کوئی تو وجہ ہو گی۔''

''وجہ اسلام آباد ہے۔جو ایک جزیرہ ہے۔جہاں سے آپ پوری دنیا کے اداروں سے جڑے ہوتے ہیں اور پھر آپ خود کو بہت اچھی طرح مارکیٹ کر لیتے ہیں۔باقی ملک کے جتنے بھی دماغ ہیں وہ سوچتے رہ جاتے ہیں کہ وہ کیوں پیدا ہوئے۔میں جانتا ہوں۔کتنے بیوروکریٹ ادیب بن کر دنیا کے ملکوں کی کانفرنسوں میں گئے۔کتنے ایسے سیکرٹری تھے جو سائنس دان بن کر گئے۔کتنے ایسے افسر تھے جو فلسفی بن کر گئے۔کتنے افسروں کی بیویاں تھیں جو عورتوں کے حقوق کی کانفرنسوں میں گئیں اور وہاں یہ ظاہر کیا کہ انہوں نے عیسائی خاندانوں کو مولویوں کے غیض وغضب سے بچایا اور انہوں نے تیزاب گردی میں کئی عورتوں کو انصاف دلایا جبکہ افسروں کی وہ بیویاں بیوٹی پارلر سے کٹی پارٹی تک اسلام آباد کلب میں روز محفل سجاتی تھیں۔

اور پھر ایسے بیوروکریٹ بھی تھے جنہوں نے کئی قسم کے سکالرشپ صرف اس لئے ضائع کئے کہ اُن کا کوئی بیٹا یا بیٹی اُس پر پورا نہیں اُترتا تھا۔اور پھر ایسے سیاست دان بھی تھے جو ذرا سی ضد پر پروفیشنل اور ٹیکنو کریٹ کو کسی بھی ایسی کانفرنس یا میٹنگ میں جانے کا این او سی نہیں دیتے تھے، جو اُن کی پارٹی کے خلاف ذرا سی بھی رائے رکھتا تھا۔''

''میں تو بات پروفیسر دانی کی کر رہی تھی۔اُس کے حوالے سے آپ کی رائے کیا ہے؟''

''ابھی مجھے کہنا ہے کہ یہ دنیا کا واحد ملک ہے جسے فوج اور نالائق بیوروکریسی چلا رہی ہے۔جسے اسٹیبلشمنٹ کہتے ہیں۔پوری دنیا کے علمی، ادبی، تہذیبی اور فنونِ لطیفہ کے ادارے آزاد، خودمختار اور اُن شعبوں کے ماہرین کے پاس ہوتے ہیں۔یہ واحد ملک ہے جہاں یہ ادارے رٹے باز بیوروکریٹس کے ہاتھ میں

ہوتے ہیں۔ جو اپنی حسرتوں کا پورا حساب لے لیتے ہیں۔ اُن میں سے اکثر معمولی طاقتوں سے ہوتے ہیں مگر کسی وجہ سے دُم چھلا، گورنمنٹ کالج لاہور، ایف سی کالج یا ہو اور بی زیڈ یو وغیرہ کا لگ جاتا ہے۔"

"مگر مجھے تو پروفیسر دانی کا پوچھنا ہے"۔

"تو اب سن لو۔ پروفیسر دانی جہاں بیٹھ گئے تو بیٹھ گئے۔ اپنے بعد آنے والوں کا راستہ روکے رہے۔ ہر کانفرنس ہر پروجیکٹ ان کے گرد گھومتا تھا۔ لیکن وہ سب کے لئے باپ کا رتبہ بنانے میں کامیاب رہے۔ لیکن خوشونت سنگھ کی بات مجھے یاد آتی ہے کہ ہر کامیاب ادیب اور مؤرخ کے پیچھے تھوڑی سی کمینگی اور تھوڑی سی چالاکی ضرور شامل ہوتی ہے۔"

"اب میں جان گئی ہوں۔ اب معصوم صدیقی کی کہانی سنائیں۔ کیا ہوا اُن کے ساتھ؟"

"ہاں معصوم صدیقی اچانک اِدھر اُدھر ہو گیا تھا۔ ہاں اب یاد آیا۔ وہ میرے پاس آیا تھا اور اُس نے مجھ سے مدد مانگی کہ آپ کا انڈیا کے تاریخ دانوں اور آرکیالوجسٹس میں بڑا نام ہے تو مجھے کوئی خط دے دیں جو میں وہاں اپنی پی ایچ ڈی کی ریسرچ کے لئے استعمال کر سکوں۔ مجھے سہولت مل جائے گی۔ میں نے اس کی ساری بات سنی۔ اُس کے تھیسس کی پوری تفصیل پڑھی۔ مجھے اس کا موضوع اتنا علمی اور تحقیقی محسوس ہوا کہ میں نے اُس کے لئے انڈیا کے اداروں کے دروازے کھول دیئے۔ وہ ایسے کہ انڈیا اور پاکستان مشترک تہذیب، مشترک ماضی اور مشترک تاریخ رکھتے ہیں۔ اس لئے کسی بھی آرکیالوجی کے طالب علم کو انڈیا تو جانا ہی پڑے گا۔ اس لئے معصوم صدیقی نے باقاعدہ میری ہدایت پر ویزہ لگوایا جس میں تعلیمی ریسرچ کا حوالہ موجود تھا۔"

"اُس کا موضوع کیا تھا اور اُسے کہاں جانا تھا؟"

"اُس کا موضوع راجستھان کے راجواڑوں سے ہو کر دہلی کی تعمیرات اور پھر پنجاب کے مہاراجوں کے آثارِ قدیمہ تک آتا تھا۔"

"تو پھر وہ وہاں ریسرچ کے لئے گیا تو ہوا کیا؟"

"وہ ایک اچھا ریسرچر تھا۔ اُس نے انڈیا جانے سے پہلے پورا اپنا پروگرام مجھے دکھایا تھا کہ وہ کہاں کہاں جائے گا اور اُسے وہاں سے کیا کیا معلوم کرنا ہے اور ایک ریسرچر اپنی سہولت کے لئے نقشے بھی بناتا ہے۔ تا کہ لکھتے وقت وہ اس کا ثبوت پیش کر سکے۔"

"اب میں سمجھ گئی ہوں۔ معصوم صدیقی، بہت معصوم تھا۔"

''ہاں مگر ابھی کہانی باقی ہے۔ وہ انڈیا پہنچا اور اتفاق کی بات تھی کہ انہی دنوں میں کئی طرح کی تقریبات میں مجھے بھی دہلی جانا تھا اور پھر اِدھر اُدھر کے پروگرام تھے۔ میری فلائٹ میں معصوم صدیقی بھی تھا۔ وہ میرے پاس آیا اور اُس نے پھر اپنا پروگرام مجھے بتایا اور پھر اُس نے مجھ سے مختلف لوگوں سے ملاقات کے لئے بھی اجازت لی۔ میں نے اُسے اپنا نام استعمال کرنے کی اجازت دی''۔۔۔۔۔

''تو پھر کیا ہوا کہ آپ کے ضمیر پر بوجھ ہے؟''

''پھر جو ہوا وہ پاکستانی حکومت کی نااہلی اور بے بسی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔''

''میں سمجھی نہیں۔''

''پھر یہ ہوا کہ معصوم صدیقی بھی دہلی اترا اور میں بھی۔ اُس نے میرے ہوٹل کا پتہ پوچھ لیا۔ میں تو ہوٹل میں نہیں ٹھہرا تھا۔ میری پسندیدہ جگہ تو ''انڈیا انٹرنیشنل سینٹر'' ہوتا ہے۔ جو انڈیا بھر کے رائٹرز، پینٹرز اور فن کاروں کے لئے نہرو نے بنایا تھا۔ اور آج بھی دہلی میں سب سے خوبصورت وہی جگہ ہے ٹھہرنے کے لئے۔''

''ہاں ایک بار سارک رائٹرز کانفرنس میں دہلی گئی تھی تو وہیں ٹھہری تھی۔ اگلے دن مجھے گلزار اور نصیرالدین شاہ اُن کے ریسٹورنٹ میں ملے۔ جہاں کا کھانا بہت اچھا ہوتا ہے۔ دہلی جائیں تو بس وہی ایک جگہ ہے جہاں ہم Credible India سے مل سکتے ہیں۔''

''گلزار۔۔۔۔ کہاں ہے وہ۔۔۔۔ ایک دن میں بمبئی اُس کے گھر پر تھا۔ مجھے یاد ہے وہ نرگس دت روڈ پر سڑک کے کنارے ایک کوٹھی میں رہتا ہے۔ پہاڑی پر چڑھ کے جانا ہوتا ہے۔ اچھی بارونق جگہ ہے۔ اُس کے گھر کے برابر مارکیٹ میں برانڈڈ کپڑے کا شوروم بھی تھا۔''

''آپ معصوم صدیقی سے دہلی میں ملے تھے تو معصوم صدیقی کے ساتھ کیا ہوا؟''

''ہاں میں انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں تھا۔ وہ آیا، میں اُسے بار میں لے گیا۔ وہ صرف بیئر پیتا تھا۔ میں نے اپنا آرڈر دیا۔۔۔۔ اور پھر اُس نے بتایا وہ آج متھرا گیا تھا اور برندابن سے ہو کر آیا ہے۔ اُس نے وہاں کے مندروں اور بندروں کی عجیب عجیب باتیں سنائیں اور پھر اُن بیوہ عورتوں کا آشرم دیکھنے کے بعد وہ مجھے لگا کوئی ناول نگار بن چکا ہے۔ وہ کہنے لگا میں وہ سب لکھوں یا پینٹ کروں تو میں بڑا رائٹر یا پینٹر بن سکتا ہوں۔''

''تو معصوم صدیقی آپ سے ملنے آتا رہا۔ اس دوران جب آپ ہسٹری کی کانفرنس کے لئے انڈیا انٹرنیشنل میں ٹھہرے تھے؟''۔۔۔۔

''ہاں مگر بس دو مرتبہ وہ آیا۔ ایک اُس شام جس کا میں نے ذکر کیا ہے اور ایک اگلی شام جب وہ تاج محل دیکھ کر آیا ___ اور وہ تاج محل کو آرکیالوجی کے نقطۂ نظر سے دیکھ کر آیا تھا اور اُس نے کچھ نقشے اور ڈرائنگز بھی وہاں بیٹھ کر بنائی تھیں۔''

''تاج محل پر اُس کا کیا تاثر تھا؟'' ___

''وہ اُس شام انڈیا انٹرنیشنل کی بار میں بہت Excited تھا۔ اُس نے بیئر کے ساتھ وہسکی بھی لے لی تھی اور سامنے پڑے ٹرے میں سے کاجو، مونگ پھلی اور بادام کئی بار خالی کر دیئے تھے۔''

''وہ کیا کہنا چاہتا تھا؟''

''اُس نے بتایا کہ تاج محل دنیا کا بہت بڑا تخلیقی اور جمالیاتی تجربہ ہے جو دوبارہ دوہرایا نہیں جا سکتا۔''

''یہ تو اُس نے صحیح کہا۔ آپ کو اُس کی ہر بات یاد ہے۔''

''یاد نہیں ہے، موجود ہے۔ کچھ ماضی ایسے ہوتے ہیں جو موجود رہتے ہیں۔''

اب میں سمجھ گئی کہ آنس نے اُس تجربے کو اپنا حصہ بنا رکھا ہے۔

''تو پھر وہ کیا کہہ رہے تھے؟''

''اُس نے بتایا کہ تاج محل کے حسن کے پیچھے صرف اُس کے آرکیٹیکٹ کا کمال نہیں اللہ کی مرضی بھی ہے۔''

''ظاہر ہے ہر بڑے معجزے کے پیچھے اللہ کی مرضی تو ہوتی ہے۔''

''لیکن یہ اللہ کی مرضی کمال کی ہے کہ اگر اللہ چاہے تو تاج محل کے پیچھے سے نیلے آسمان کی چادر سمیٹ لے تو کیا تاج محل ایسا ہی معجزہ دکھائی دے گا۔ ظاہر ہے نہیں ___ کہ آدھا حسن تاج محل کا ہے آدھا حسن اُس آسمان کا ہے جسے Skyline کہتے ہیں۔''

''تو پھر معصوم صدیقی نے تاج محل کے جمالیاتی پہلو کو اُس کے بیک گراؤنڈ کے حوالے سے دیکھا؟''

''ہاں وہ کہنے لگا کہ یہ ممکن ہے مسلمانوں کے اس معجزے کو تباہ کرنے کے لئے مودی حکومت یا انتہا پسند ہندو جس طرح بابری مسجد پر چڑھ دوڑے تھے اس پر بھی چڑھ دوڑیں۔ لیکن یہ ممکن نہیں کیوں کہ اُن کی

ٹورازم انڈسٹری تاج محل سے ہی چل رہی ہے۔لیکن یہ ممکن ہے کہ انتہا پسند ہندو تاج محل کو مسلمانوں کی یادگار کے طور پر تباہ کرنے کے لئے تاج محل کے پیچھے سو منزلہ ایسی عمارت بنا دیں جو نچلے طبقے کے فلیٹس پر مشتمل ہو تو پھر تاج محل دنیا کے نقشے پر کیا ہوگا'' ——

''اس کا مطلب ہے معصوم صدیقی نے تاج محل کے مستقبل پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔''

''یہ معصوم صدیقی نے مودی حکومت کو سامنے رکھتے ہوئے بات کی تھی۔شاید ایسا نہ ہو کہ دنیا اس پر اپنا ردعمل دے گی —— لیکن تاج محل ہندوؤں کے سینے پر مسلسل مونگ دَل رہا ہے۔بیچ بیچ میں اس پر حملوں کی خبریں بھی آتی رہی ہیں۔لیکن ایک بات شاید تم نہیں جانتی؟''

''کیسی بات؟''

''وہ یہ ہے کہ ہر سال تاج محل کو پبلک کے لئے بند کیا جاتا ہے اور ملتان کی چکنی مٹی منگوائی جاتی ہے جو دریائے چناب کے پانی اُترنے کے زمانے میں جمع کی جاتی ہے۔جس سے ملتانی مٹی کے برتن بنائے جاتے ہیں۔اور پھر ان پر چینی کا لیپ کر کے نقش ونگار بنائے جاتے ہیں۔اُس مٹی سے تاج محل کو لیپ کر کے ڈھانپ دیا جاتا ہے۔ایک خاص عرصے بعد وہ لیپ اتارا جاتا ہے تو تاج محل چاندنی میں نہایا ہوا ابھرآتا ہے۔ملتانی مٹی اس پر جمے گرد وغبار اور فیکٹریوں کے دھوئیں کی پیلاہٹ کو چوس لیتی ہے۔''

''تو گویا ہمارا ملتان ہندوستان کے اس عجوبے کو معجزہ بنانے میں شریک ہے۔''

''اب اگر اسی طرح کے مٹی کے Pride لینے ہیں تو لے لیں۔''

''ہاں تو معصوم صدیقی کا کیا بنا؟''

''بننا کیا تھا۔میری اُس کی آخری شام تھی جب وہ تاج محل دیکھ کر آیا تھا۔پھر اُس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ راجستھان جا رہا ہے جہاں جے پور، جیسلمیر، بیکانیر اور جودھ پور کے قلعے اور کچھ محل اُس نے دیکھنے ہیں اور خاص طور پر وہ محل جنہیں اب ہوٹل بنا دیا گیا ہے۔ساتھ ہی اُس نے بتایا کہ وہ وہاں سے واپس آ کر سکھوں کے تعمیراتی ورثے کو دیکھے گا اور برصغیر کے آرکیٹیکچر اور آرکیالوجیکل یونٹ پر کچھ نقشے حاصل کرے گا اور کچھ نقشوں پر کام کرے گا تاکہ واپس جا کر وہ اپنا تھیسس مکمل کر سکے۔''

''تو پھر —— یہ تو بہت بڑا کام تھا۔اس میں تو کئی مہینے لگ سکتے تھے۔''

''ہاں یہی تو ہوا کہ میں اپنی کانفرنس کر کے واپس آ گیا اور بھول گیا۔اب بھی بھول گیا ہوں کہ میں

کیا کہہ رہا تھا'' ——

''آپ معصوم صدیقی کی بات کر رہے تھے۔''

''ہاں یاد آ گیا تو میں تو واپس آ گیا۔ اب میں بھول گیا کہ کون تھا معصوم صدیقی اور کہاں گیا تھا۔ لیکن اچانک ایک بہت بڑی خبر ہمارے اور باہر کے نیوز چینلز پر ایک ساتھ بریک ہوئی کہ انڈیا نے دہلی کے ایک ہوٹل سے پاکستانی جاسوس معصوم صدیقی کو گرفتار کیا ہے۔ جس سے حساس علاقوں کے نقشے ملے ہیں جو کئی دنوں سے انڈیا کے اُن علاقوں میں کام کر رہا تھا جو انتہائی حساس علاقے سمجھے جاتے ہیں۔ یہ جاسوس پاکستانی خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی کے لئے یہاں تعلیمی ویزے پر آیا تھا۔ اس کا مقصد اہم تاریخی عمارات کے نقشے بنانا اور اُن کو پاکستانی فضائیہ کے نشانے پر رکھنا ظاہر کیا گیا ہے —— میں نے یہ خبر سنی اور پھر میڈیا نے واویلا مچا دیا کہ یہ نقشے بے حد سٹریٹیجک نوعیت کے ہیں خاص طور پر بیکانیر کے آس پاس کا علاقہ کہ یہ بہاولپور کے پاس سرحد کے پار واقع ہے۔ اور ظاہر یہ کیا گیا کہ پاکستان سرحد توڑ کر بیکانیر کو اپنے ساتھ شامل کرنا چاہتا ہے۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے بھی شک گذرا کہ اُن کا میڈیا ٹھیک بات کر رہا ہے۔ ہوسکتا ہے معصوم صدیقی آئی ایس آئی کے لئے کام کر رہا ہو —— لیکن جب میں نے کچھ غور کیا تو مجھے بات سمجھ میں آ گئی کہ آخر میں ایک مؤرخ ہوں۔ بات یہ سمجھ میں آئی کہ چند مہینے پہلے پاکستان نے بلوچستان سے ان کا جاسوس پکڑا تھا۔ جس سے جعلی پاسپورٹ، کئی ناموں کی دستاویزات ملی تھیں۔ اب اُس کا جواب اس طرح دینا انڈیا کے لئے ضروری تھا۔''

''تو آپ سمجھتے ہیں معصوم صدیقی واقعی معصوم ہے؟''

''ظاہر ہے۔ میری نظر میں وہ صرف نقشوں کی وجہ سے پکڑا گیا ہے۔ اس کے بعد اُسے اتنا مارا گیا ہوگا کہ وہ نہ سچ بولنے کی حیثیت میں رہے گا نہ جھوٹ بول سکے گا۔''

''تو پھر میڈیا نے کیا ظاہر کیا؟'' ——

''یہ کہ انڈین حکومت نے پاکستان کا جاسوس بے نقاب کر کے عالمی سطح پر بڑی کامیابی حاصل کر لی ہے۔ جبکہ یہ محض ایک معصوم ریسرچ سکالر کی غلطی تھی کہ انڈیا میں ریسرچ اُسے مہنگی پڑ سکتی ہے جس میں نقشے بھی بنائے گئے ہوں —— ''

''تو معصوم صدیقی کی مدد کسی نے نہ کی؟''

''پہلے یہ تو سن لو کہ دونوں طرف کی حکومتوں نے ایک ایک جاسوس گرفتار کر رکھا ہے۔ پاکستان نے

اصلی جاسوس۔ انڈیا نے نقلی جاسوس ــــ تو اب یہ فرق کون سا میڈیا کرے گا۔ پاکستانی حکومت نے معصوم صدیقی کا کیس ٹھیک طرح سے لڑا ہی نہیں۔ جبکہ انہوں نے اپنے جاسوس کا کیس عالمی عدالت میں لڑا ــــ جو عدالت سوئٹزرلینڈ میں بیٹھتی ہے۔ اس عدالت نے اُن کے جاسوس کو کچھ مراعات دے دیں۔"

"پاکستان نے اپنے آدمی کا کیس کیوں نہ اٹھایا؟" ــــ

"اس لئے کہ معصوم صدیقی عام سا آرکیالوجسٹ تھا آئی ایس آئی کا پلانٹ کیا ہوا۔ جاسوس نہیں تھا بلکہ سرے سے جاسوس ہی نہیں تھا۔ پاکستان نے تو اُسے جاسوس ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر کیس کیسے لڑا جاسکتا تھا۔ وہ تو ایک عام آدمی تھا۔ جسے انڈین حکومت نے اپنے مفاد میں جاسوس کا درجہ دے رکھا تھا۔"

"آپ کو معصوم صدیقی کا معلوم ہے اب کہاں ہے؟"

"مجھے ایک کشمیری صحافی نے بتایا تھا اُس نے اُسے تہاڑ جیل میں دیکھا تھا جو پاگل ہو چکا تھا۔ اس کشمیری صحافی کو بھی اس جیل میں بے پناہ اذیت دی گئی۔ اپنا پیشاب پینے پر مجبور کیا گیا۔ کئی کئی راتیں کھڑا رکھا گیا۔ یہ سب اُس نے اپنی کتاب میں تحریر کیا اور جب اس صحافی کی کتاب کو ایک مشہور اشاعتی ادارے نے شائع کیا تو اُس وقت میں دہلی میں تھا۔ میں نے وہ کتاب پڑھ لی تھی اور پھر میری ملاقات اس صحافی سے ہوئی۔ جو معصوم صدیقی کو بس ایک دفعہ دیکھ چکا تھا۔ پھر مجھے معلوم نہیں کیا ہوا؟"

"ہم ایک آرکیالوجسٹ سے محروم ہو گئے۔"

"ہم نے تاریخ کی عزت نہیں کی۔ جغرافیے کی عزت نہیں کی۔ تہذیبی ورثے کی عزت نہیں کی تو باقی کیا رہ جاتا ہے" ــــ

"جغرافیے کی عزت کیسے کی جاتی ہے؟"

"تم تو خود کہانی لکھتی ہو۔ تمہیں نہیں پتہ دنیا میں ہماری واحد مثال ہے کہ ہم نے اپنے جغرافیے کی عزت نہیں کی اور ہم نے اتنا قیمتی جغرافیہ اپنے ہاتھوں سے ضائع کر دیا اور مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش میں تبدیل کر دیا ــــ"

پھر دن ایسے چلتے رہے جیسے ہوا گھنے جنگل میں سے گذرتی ہے اور اُسے بہت سر ٹکرانے کے بعد راستہ ملتا ہے۔ اور ان دنوں میں مجھے انتظار تھا دو لڑکیوں کا، جن کا ذکر آنس نے کیا تھا کہ وہ آئیں گی۔ وہ کون

تھیں اور کیتھرین اور سوزین سے آنس کا کیا رشتہ تھا؟ میاں بیوی کے درمیان اتنے حجابات ہوتے ہیں کہ شاید کسی اور رشتے میں ایسا نہ ہو ـــــ معلوم نہیں کیوں یہ تاثر ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے راز دار ہوتے ہیں یا دونوں ایک دوسرے کا پردہ ہوتے ہیں۔ بالکل ایسا نہیں ہے۔ دونوں ساری زندگی اپنی گذشتہ زندگیوں کو لپیٹ کے یادوں میں رکھ لیتے ہیں اور دونوں ایک مشترک زندگی میں رہنے لگتے ہیں۔ اور اُس میں بھی کئی چور دروازوں سے آتے جاتے ہیں۔ میں اور آنس ایک دوسرے کے سچے دوست اور محبت کرنے والے میاں بیوی ہیں۔ نہ وہ مجھے پورا جانتے ہیں نہ میں انہیں مکمل جان پائی ہوں۔ یہ فریب معلوم نہیں کس نے پیدا کر رکھا ہے۔

میں آنس سے پہلے دو رومان کر چکی تھی۔ کیوں کرتی۔ ابھی کالج کی پہلی سیڑھی چڑھتے ہیں تو میری عمر کی لڑکی کے سامنے وحید مراد کا کوئی روپ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ بھلے کسی چوبارے سے جھانکے، کسی گلی میں کھمبے سے لگ کر کھڑا ہو یا رقعہ لکھ کر پھینکے یا کسی بھی ذریعے سے پہنچے اُسے تو پہنچنا ہوتا ہے۔ اور پھر میں تو ایسے کالج میں تھی جہاں مخلوط تعلیم تھی۔ فرسٹ ائیر کی لڑکی اردو کے لیکچرر کے عشق میں ایسی پھنسی کہ دو سال تو میرے اُس کی راہ دیکھتے اور کلاس میں ہوم ورک کے نام پر محبت کے اظہار کے قرینے اشعار میں تلاش کرتے گذر گئے۔ اب یہ باتیں میں آنس کو کیوں بتاؤں یہ میرا ذاتی حساب کتاب ہے۔

پھر جب میں یونیورسٹی میں آئی تو پھر میرا ایک رومانس شروع ہوا۔ اب میں پہلے تجربے سے آگے آ چکی تھی اس لئے اب میں کہانیاں لکھنے لگی تھی۔ کئی عاشق بال بڑھا کر شعری بیاض بغل میں دبا کر منڈلانے لگے تھے۔ لڑکیاں ان لڑکوں کو دیکھتی تھیں جو مقابلے کا سی ایس ایس کا امتحان دینے کی تیاریوں کے لئے لائبریریوں کے چکر لگا رہے تھے کہ ان سے بندھ جائیں اور بیگم بننے کا موقع حاصل کر لیں ـــــ ایک ذرا سینئر تھا ہم سے۔ یونیورسٹی میں اپنے زمیندارہ پس منظر کی وجہ سے طلباء میں مقبول تھا۔ ہوسٹل لائف کا گُرو تھا۔ عادات میں لبرل اور ترقی پسندی کا تڑکا لگا رکھا تھا۔ میری کہانیاں اِدھر اُدھر چھپ رہی تھیں۔ اس تک اُڑتے اُڑتے خوشبو پہنچی پھر ملاقات بھی بنی تو معلوم ہوا، ن م راشد، فیض اور مجید امجد کو پڑھ رکھا ہے۔ انگریزی فکشن میں مارکیز اور میلان کندیرا تک کافکا اور کامیو کے راستے سے پہنچ چکا ہے۔ خوب بحثا بحثی جمی جیسی قرۃ العین حیدر کے اشرافیہ کرداروں کے بیچ ہوتی ہے۔ ایک دوسرے پر ہم نے اپنے مطالعے کی خوب کیفیت پیدا کی۔ وہ بہت قریب

آنے کے چکر میں تھا اور کچھ وہ یونیورسٹی کے لڑکے لڑکیوں پر اپنے رومانوی کردار کا امیج ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپھا زمیندار تھا فیوڈل نہیں تھا۔ جب میں نے اس کے خوابوں کی ٹوکری کو دیکھا تو اُس میں پہلے نمبر پر سی ایس پی افسر بننا لکھا تھا جو اُس کی خاندانی مجبوری تھی۔ بس یہاں سے ہمارے راستے الگ ہو گئے کہ اس کی زندگی ایک پیکج تھی جس میں سی ایس پی افسر بننے کے ساتھ ایک زمیندار گھرانے کی لڑکی سے شادی بھی شامل تھی۔ اور مجھے دوسری بیوی بن کر رہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ ہماری دوستی تو چل سکتی ہے محبت نہیں۔

اب ایک اور رومانس بھی میری زندگی میں آیا۔ وہ ایک امریکہ کا پاکستانی ڈاکٹر تھا۔ کسی دوست نے اسے میرا بتایا۔ اُس نے سب کچھ دیکھا اور بات چیت شروع ہوگئی۔ بہت بڑا کارڈیک سرجن تھا۔ یہاں تک کہ سعودی حکمرانوں کے ڈاکٹرز پینل میں تھا اُس سے بھی آگے بڑے تاجروں اور دنیا کے مختلف ملکوں کے بڑے کارڈیک ہسپتالوں کے پینل پر تھا۔ اب میں نے جب اُس سے بات شروع کی تو اُس نے مجھے جہاز کی ٹکٹس بھیجنی شروع کر دیں کہ آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ یہاں آ کر مجھے ملیں ـــــ اب میں کیا کرتی؟ میں نے ٹریول شروع کر دیا اور ہر جگہ میرا کمرہ بڑے ہوٹل میں بُک ہوتا تھا ـــــ اس ٹریولنگ میں بے حد بڑے ہوٹلوں میں لنچ ڈنر اور بریک فاسٹ شامل ہوتے۔ ان ملکوں کی بڑی شخصیات بھی اس میں شامل ہوتی تھیں۔ میں اندر سے ڈر گئی تھی کہ اس زندگی کو کیسے سنبھال پاؤں گی۔ وہ ڈاکٹر بہت پروفیشنل تھا اور جہاز کے سفر میں بھی اپنے مریضوں سے رابطے میں رہتا تھا۔ وہ ہوٹل میں ہوتے ہوئے بھی فون پر میٹنگ میں ہوتا یا فون پر مصروف ہوتا۔ اتنی تیز رفتار زندگی کا میں تو تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اب مجھے وہ جو وقفوں میں وقت دے رہا تھا۔ وہ دلچسپ ضرور تھا لیکن اُس میں رومانس سے زیادہ انٹرویو یا دوسرے کے خیالات کو جاننے کی کوشش زیادہ تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے مجھے کوئی بہت بڑی پوسٹ حاصل کرنے کے لئے خود کو ثابت کرنا ہے۔ خیر میں نے اُسے بہت سلیقے اور محبت آمیز تعلق کے ساتھ بتایا کہ میں ایک رائٹر ہوں اور حساس مسائل پر سوچتی ہوں۔ خیالوں میں بھی رہتی ہوں اور حقیقت میں بھی رہتی ہوں ـــــ اور زندگی کو بے حد تیزی سے گذارنا نہیں چاہتی۔ زندگی کو تجربہ بنانا چاہتی ہوں۔ چھ سو میل کی تیز رفتار ٹرین کی طرح ہرگز نہیں گذاروں گی۔ مجھے کہیں نہیں پہنچنا ـــــ میں ایک ایک لمحہ جسم کا حصہ بنانا چاہتی ہوں ـــــ تو وہ حیران ہو گیا کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ اُس نے کہا مجھے بھی کہیں نہیں پہنچنا کیوں کہ مجھے جہاں پہنچنا تھا پہنچ چکا ہوں۔ اس لئے تو آپ

کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔

ایک شام میں اُس کی دعوت پر جب مالدیپ کے ائیر پورٹ پر اُتری تو شام اُتر رہی تھی۔ میں سری لنکا اُس کی بکنگ پر کولمبو ایک رات ٹھہر کے آرہی تھی۔ کولمبو کے ہوٹل کی کھڑکی سے دور تک لمبے لمبے ناریل کے درخت ہوا میں جھولتے ہوئے میں دیکھ رہی تھی۔ وہ شام میں اکیلی تھی، مگر تجربہ بہت بڑا تھا۔ ہوٹل کے مختلف راستوں اور راہداریوں اور ریسٹورنٹس میں اُس شام کو میں نے اچھی طرح تجربہ کیا۔ میں نے بار میں بیٹھ کر وائین بھی لی۔ پھر کھانے کے ساتھ Bloody Mary بھی لی اور کوکونٹ میں پکے ہوئے پرانز بھی لئے۔ پھر سری لنکا کی کئی طرح کی مچھلی کی ڈشز بھی تجربہ کیں۔ مجھے لگا میں کوئی شہزادی ہوں جس کا شہزادہ بن باس پہ گیا ہوا ہے اور اپنا کریڈٹ کارڈ مجھے دے گیا ہے۔ آن لائن سارے اخراجات پہلے سے ادا ہو چکے ہوتے تھے۔ اگلے دن مالدیپ کی فلائیٹ میں بیٹھی۔ زیادہ تر گورے اور غیر ملکی تھے۔ مالے ائیر پورٹ سمندر کے اندر بنایا گیا ہے۔ لگا جہاز سمندر میں اُتر رہا ہے۔ میں مالدیپ کو بس جزیروں کی حد تک جانتی تھی۔ معلوم ہوا ان کا ملک مالے محض چند کلومیٹر تک محدود ہے۔ آپ پیدل بھی ملک گھوم سکتے ہیں۔ ایک موٹر بوٹ اُس جزیرے کے ریزورٹ کی تھی جہاں میری بکنگ ہوئی تھی۔ ائیر پورٹ پر میرے نام کا پلے کارڈ لئے ان کا نمائندہ موجود تھا۔ میں اُس ریزورٹ میں پہنچی۔ اس کا تو نام ہی پیراڈائز ریزورٹ تھا۔ ایک واٹر بینگلو میں میرا قیام تھا۔ ایسے لگا سمندر میں بستر لگا ہوا ہے۔ وہاں کے پھول پودے اور درخت شاید میں نے پہلے نہیں دیکھے تھے۔ مجھے اکیلے اپنے آپ سے ملاقات اچھی لگتی ہے۔ میرا دل چاہتا تھا وہ خود نہ آئے اور مجھے بس ایسے ہی دنیا دکھاتا رہے۔ شام سے پہلے جب میں باہر آئی تو سمندر کائنات کی گود میں ہلکورے لے رہا تھا۔ تین رنگوں کے سمندر میں اُترتی چلی گئی اور میں اکیلی تھی۔ سامنے پورا سمندر اور آدھا چاند سامنے تھا۔ میرے پاؤں فیروزی رنگ کے سمندر میں تھے۔ سامنے تین رنگوں کا سمندر موجود تھا ہلکا نیلا، نیلا اور گہرا نیلا۔۔۔۔

ریستوران میں آئی تو ساری دنیا کی کوزین موجود تھی۔۔۔۔ ڈاکٹر نے اگلے دن دوپہر پہنچنا تھا اور میں چاہتی تھی کہ ہم دونوں میں جو بات ہونی ہے، وہ طے ہو جائے۔ میں اس رات کو اپنی ذات کے لئے تجربہ بنانا چاہتی تھی۔ لائیو میوزک میں پہلے تو میں نے وہسکی لی اور اُس رخ پر بیٹھی جہاں سے سمندر پر آدھے چاند کی رات جھکی ہوئی تھی اور چاندنی لہروں میں پگھلی چاندی کی طرح گھلی ہوئی تھی۔ یہاں دنیا کی سب سے اچھی وائین اور وہسکی موجود تھی۔۔۔۔ میں کہیں خیالوں میں تھی کہ فون پر ڈاکٹر صاحب نے اس شام کی نیک

خواہشات میرے نام کیں اور پھر میں اپنی پسند کی کوزین کے لئے ایسے ریستوران میں گئی جہاں ہر کانٹی نینٹ کا کُو نے تھا۔ مجھے اپنی پسند کی ہر شے یہاں مل سکتی تھی۔ میں زیادہ خوراک کی عادی نہیں ہوں مجھے اپنے ساتھ یہ شام گذارنے کا تجربہ بے حد اچھا لگ رہا تھا۔ کوئی آپ کا انتظار نہ کر رہا ہو۔ کوئی آپ کی آزادی میں مخل نہ ہو تو پھر ایک کہانی کار کے لئے تو ایسی شام کہانیوں کے بے شمار دیے جلا دیتی ہے اور ایسا ہی ہوا کہ کیرالہ انڈیا کا ایک شیف میرے سامنے آیا اور اپنی کہانی بھی مجھے دے گیا کہ کیسے کالی مرچ کے باغ میں اس کی ماں نے اُسے جنم دیا تھا۔ اور کیسے اس کی ماں نے اپنی کمر پہ اُسے چادر میں ڈال کے کالی مرچوں کے باغ میں کام کیا ـــــ اور پھر وہ جب بڑا ہوا تو ماں نے مچھیروں کے ایک گروہ کے حوالے کر دیا اور پھر اُس نے زندگی کو کیسے پایا ـــــ سمندر کے نیچے کی حیات کو اُس نے موت کے قریب سے جا کر دریافت کیا۔ اور پھر ماں سے بچھڑ کے آج تک وہ کالی مرچوں کے باغ میں نہیں پہنچ سکا اور یہاں آ گیا۔

ایک اور کہانی ایک لڑکی کی تھی جو صبح میرا بستر بنانے آتی تھی۔ وہ بنگلہ دیش کی تھی۔ مسلمان تھی اور اُس نے بتایا کہ اُس کی ماں کا جنم بنگلہ دیش کے جنم کے سال بعد ہوا۔ اُس کی نانی یونیورسٹی کی طالبہ تھی اور اُسے کسی مولوی نے ریپ کیا تھا۔ اُس کے نتیجے میں میری ماں پیدا ہوئی اور دھتکاری گئی۔ وہ بنگلہ دیش میں مجھے لے کر فٹ پاتھوں پہ سوتی رہی۔ بنگلہ دیش نے اپنے جنم دن کی رات کو ریپ ہونے والی عورتوں کا خیال نہیں رکھا تھا۔ میری ماں کی چھاتیوں میں دودھ خشک ہو گیا تھا پھر بھی وہ میرا منہ اپنی چھاتی پہ رکھتی تھی کہ شاید کوئی قطرہ نکل آئے۔ وہ بتاتی تھی کہ میں دیر تک چھاتی کو چوستی رہتی تھی اور پھر تھک کر لڑھک جاتی تھی۔ کبھی کبھی بھوک سے نڈھال انسان بھی غش کھا کر گر پڑتا ہے۔ ایسا کئی بار میرے ساتھ ہوا۔ یہ ماں نے بتایا تھا ـــــ پھر اُسی فٹ پاتھ پر کئی اور لوگ بھی رہنے لگے۔ ایک قبیلہ فٹ پاتھ پر آباد ہو چکا تھا جو پھیلتے پھیلتے ایک آبادی میں تبدیل ہو گیا۔ اب ہر کوئی ایک دوسرے کا واقف تھا۔ ایک دن وہاں بیوپاری آیا اور تیرہ سال سے اوپر کی لڑکیوں کو رات کے لئے لے جانے لگا۔ بدلے میں دو وقت کا بھات اور ٹکے دے جاتا تھا۔ بس پھر میرے جیسی میلی کچیلی سڑکوں کی دھول چاٹتی فاقوں کی ماری لڑکیاں فٹ پاتھوں سے راتوں کو جانے لگیں اور صبح سے پہلے وہاں چھوڑ دی جاتی تھیں۔ میں بھی ان میں شامل تھی۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ رات کو پیٹ بھر کے کھانا بھی نہیں دیتے تھے اور پیٹ کو کسی اور چیز سے بھر دیتے تھے۔ ایسے میں ابھی تیرہ سے چودھویں سال میں آئی تو پیٹ بوجھل ہو گیا۔ اُسی فٹ پاتھ پر میرا ابارشن خود ہی ہو گیا۔ میری جیسی کوئی کالی کلوٹی فٹ پاتھ پر نہ

آ سکی۔ آج سوچتی ہوں کتنا اچھا ہوا ـــــ اور پھر میں خود سے سوچنے لگی تھی کہ ایک دن ماں فٹ پاتھ پر دم توڑ گئی۔ سب جمع ہو گئے۔ یہ ڈرامہ ہر دوسرے چوتھے روز ہوتا تھا۔ کوئی نہ کوئی دم توڑ جاتا تھا۔ خیراتی شفاخانے والے آئے، لاش لے جاتے تھے کہ فٹ پاتھ پر بدبو نہ پھیلے اور فٹ پاتھ چلتا رہے ـــــ مجھے ایک گاہک لے گیا تو میں رو پڑی۔ اس نے مجھے استعمال کرنے کے بعد ایک ایجنٹ کے حوالے کیا جس نے مجھے ایک ایسے ادارے کے حوالے کیا جس نے مجھے ہوٹل انڈسٹری کے حوالے کیا۔ بنگلہ دیش کی آبادی کا ایک حصہ دنیا کی مختلف کا میج انڈسٹریز میں کام آ رہا ہے۔ میرے لئے یہ اچھی بات تھی۔ یہاں میں ہر شام نہیں بکتی تھی اور پھر میری ٹریننگ ہوئی اور مجھے یہاں ہاؤس کیپنگ کے شعبے میں تربیت کے بعد بھیج دیا گیا۔

اب کہانیاں تو ہر ایک کے پاس تھیں۔ ویٹر، بارٹینڈر، مالی سے لے کر ہاؤس کیپنگ تک ہر شخص کی ایک کہانی تھی۔ کہنے کو مالدیپ کے جزیرے دنیا کے مالدار لوگوں کی عیاشی کے لئے بنائے گئے لیکن وہاں پر سستی مزدوری کے لئے ہندوستان، بنگلہ دیش اور سری لنکا کے فٹ پاتھوں، کیلے کے پتوں سے بنائے گئے جھونپڑوں اور کسی تنگ و تاریک کھولی سے اپنی تقدیر بدلنے والے کالے کلوٹے لڑکوں اور لڑکیوں نے آ کر بسیرا کر لیا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں یہ ورکر ریستورانوں، شراب خانوں، ہوٹل انڈسٹری کی لانڈریوں اور دیگر صفائی کے کاموں کے لئے یہاں ملازمت حاصل کرتے رہتے تھے۔ انہیں صاف ستھری وردی کے ساتھ کھانا بھی مل جاتا تھا اور کچھ پیسے جو وہ اپنے اپنے گھروں کو بھیج دیتے تھے۔ یہاں میرے لئے ہر ورکر ایک کہانی تھا۔ ہندوستان، بنگلہ دیش اور سری لنکا کی غربت کی کہانیاں، پاکستان سے مالے میں صرف کلرک اکاؤنٹینٹ اور سکول ٹیچر بھرتی کئے جاتے تھے۔ وہ ایک ایجنٹ کے ذریعے یہاں آ کر کام کرتے تھے۔ مگر مالے کی آبادی ایک محلے سے بھی کم تھی۔ اس لئے یہ ملازمتیں بے حد کم تعداد میں تھیں۔ میں نے جب وہاں دنیا کے بے حد مہنگے پیراڈائز ریزورٹ کا جائزہ لیا تو مجھے وہاں ایک جھونپڑ پٹی، ایک فٹ پاتھ، ایک سلم، اس خوبصورتی کے نیچے دکھائی دیا۔ مجھے اس کی بدبو سے گھن آئی۔ مجھے وہ اتنا مہنگا ریزورٹ پل کی پل میں ایک گندگی سے بھرے سمندر میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا ـــــ

اگلے دن دوپہر کے لنچ سے پہلے وہ ڈاکٹر صاحب آ گئے۔ حسب معمول ان کے ہاتھ میں اُن کا سفری ساز و سامان تھا۔ اپنے واٹر بنگلو میں وہ چیک اِن ہوئے۔ نہا دھو کے لنچ پر مجھے ملے اور میں نے اپنا تجربہ بیان کیا۔ اور پھر میں نے اُس کی بے پناہ تعریف اور شکریہ ادا کیا کہ مجھے ایسے تجربات ہوئے۔ اب ہم نے

خوب سیر کی۔ مجھے ڈاکٹر کی حسِ مزاح کا اندازہ بھی ہوا۔ مجھے لگا اتنے بڑے ریزورٹ پر شاید ہم دونوں اکیلے ہیں جبکہ وہاں ہنی مون منانے والے جوڑے بھی موجود تھے۔ مجھے لگا جیسے میں اُس کے قریب آ چکی ہوں۔ وہ بہت محتاط طریقے سے میرے قریب آ رہا تھا اور میں نے اُسے بالکل ایسا اشارہ نہیں دیا کہ ہم دونوں یہاں کسی بھی قسم کی ڈیٹ پر آئے ہوئے ہیں۔ سچ بات یہ تھی کہ ہم ایک دوسرے کو ابھی جاننے کے عمل میں تھے ـــــ اب ایک شام دونوں کے پاس تھی اور سورج غروب ہونے اور آسمان پر چاند کے ہونے کی ساعتیں ہمارے سامنے تھیں۔ ڈاکٹر ہلکی پھلکی ڈرنک لیتا تھا۔ بس اس کی اپنی پسند کی ہوتی تھی۔ اور میں کبھی وہسکی کبھی وائن اور کبھی واڈ کا لے لیتی تھی۔ اور میں نے اس کا اظہار جان کے کیا کہ اُسے معلوم ہو میں ایک رائٹر ہوں اور میں عام پاکستانی عورت نہیں ہوں۔ اس شام ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بہت اچھی کمپنی دی۔ پورا سمندر، پورا ساحل، پورا ریزورٹ اور اُس کے ریستوران ہمارے لئے کھلے تھے اور ڈاکٹر جو کہ بہت مصروف زندگی گذار رہا تھا۔ یہاں آ کر سب کچھ بھول گیا۔

اگلے دن دوپہر کے بعد ہماری واپسی تھی اور ہماری فلائیٹ مالے ائیر پورٹ سے شام کے آس پاس جانی تھی۔ اس لئے ایک بریک فاسٹ اور ایک لنچ باقی تھا۔ ہم رات کو کھانے کے بعد اپنے اپنے واٹر بنگلو میں چلے گئے۔ نہ مجھے کوئی خواب دیکھنا تھا نہ اُسے کہ یہ اُس طرح کا رومانس نہیں تھا ـــــ میں اپنے خوابوں میں لپٹ کر سو گئی۔ وہ شاید اپنے جاب کے ساتھ سو گیا۔

صبح ناشتے پر فروٹ کا سیکشن بہت بڑا تھا۔ دنیا بھر کا فروٹ کئی شکلوں میں موجود تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مالدیپ میں چاروں طرف سے ہر موسم کا پھل آ سکتا تھا۔ مثلاً انناس، تربوز، خربوزہ، آم، سیب، ناشپاتی، کیلا، انگور، انار، ناریل، مالٹا، سٹرابری، چیری اور معلوم نہیں کیا کچھ تھا جو انڈیا، سری لنکا، بنگلہ دیش اور تھائی لینڈ سے اور پھر آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ سے آ رہا تھا۔ اس کے بعد انڈین، یورپین اور اٹالین کوزین کے سب ناشتے موجود تھے۔ میرا مسئلہ ڈاکٹر سے کھل کر بات کرنا تھا، جس کا موقع اُس نے خود ہی بنا لیا۔ کہ اب یہ ہماری شاید آخری اس طرح کی ملاقات ہو سکتی تھی کہ زیادہ وقت دونوں کے پاس نہیں تھا۔ اب ہم دونوں لنچ سے پہلے ایک خوبصورت بار میں بیٹھے تھے۔ وقت کی مناسبت سے بیئر لی گئی اور پھر ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ دیکھو مجھے آپ ہر طرح سے پسند آئی ہیں۔ میں نے بھی اسی انداز سے جواب دیا اور بات بھی ٹھیک تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے تو قابل قبول تھے۔ اب معاملہ تو زندگی کو اپنی اپنی مرضی سے گذارنے کا تھا۔ ڈاکٹر صاحب

نے بتایا کہ اُس کی ایک شادی اُن کی کزن سے ہوئی تھی جیسا کہ خاندان میں بزرگوں کے دباؤ سے ہوتا ہے۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا پیدا ہوا اور پھر بات طلاق تک گئی۔ میں نے ایسے ہی پوچھ لیا۔ وجہ کیا بنی؟ تو ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ میری خالہ بہت لالچی تھیں۔ بیٹی کو پٹیاں پڑھاتی رہتی تھیں۔ آج ایک مطالبہ، کل دوسرا جب دو بچے ہو گئے تو میرے لئے مشکل ہو گیا اور بس۔ بچے چھوڑ کے چلی گئی ـــــ

''اب وہ بچے کس کے پاس ہیں؟''

''میری بہن کے پاس۔ اُس کی ایک بیٹی ہے اور وہ بھی میری طرح شوہر کو طلاق دے چکی ہے۔ تینوں بچے اس کے ساتھ ہیں اور وہ بھی ڈاکٹر ہے امریکہ میں۔ اب میں چاہتا ہوں ان بچوں کو آپ چاہیں تو ہم اپنے ساتھ رکھ سکتے ہیں اور اگر آپ کو یہ بات پسند نہ ہو تو بھی ٹھیک ہے۔ میری بہن انہیں اپنا چکی ہے۔''

''اور اگر آپ کی بہن آپ کی طرح دوسری شادی کرنا چاہے تو؟''

''یہ ابھی ہم نے نہیں سوچا۔ آپ اپنا وقت لو اور جو بھی فیصلہ ہو بتا دینا۔''

ہم نے وہ شام اچھی گذاری۔ اگلے دن دوپہر کو ہماری فلائیٹ تھی۔ ہم نے اس موضوع پر اور کوئی بات نہ کی۔ اور اس سفر کی یاد میں گم رہے اور پھر میں آ گئی ـــــ اور پھر میں نے ایک خط لکھ کر ڈاکٹر صاحب سے معذرت کر لی کہ مجھے لگا شاید میں ڈاکٹر کو محبت نہ دے سکوں اور اُس کی دولت پہ اس طرح کے کتنے سفر کر لوں گی۔ میں نے اسے یہ آفر دے دی کہ جو میرے پر اس کا خرچ آیا ہے وہ میں اُسے دینے کو تیار ہوں ـــــ اُس کا کوئی جواب نہ آیا ـــــ اور یہ بات میرے اندر رہ گئی۔ آنس کو کسی بات کا پتہ نہیں ہے۔

اب آنس کا کیتھرین اور سوزین سے کیا رشتہ تھا اور اُن دو لڑکیوں نے کب آنا تھا۔ یہ سب سیموئل بیکٹ کے کھیل ''Waiting for Godot'' کی طرح سے تھا۔ میں دیکھ رہی تھی کہ آنس وقت اور جگہ کے تعین سے باہر آ چکے ہیں۔ کبھی بھی وہ کہیں پہنچ سکتے تھے۔ ایسا بہت دیر سے ہو رہا تھا۔ اب ایک دن کیا ہوا؟ تاریخ کا پہیہ گھوم گیا۔ کہنے لگے۔

''ابھی ابھی مسجد قرطبہ سے جمعہ پڑھ کے آ رہا ہوں۔ بہت بڑا اجتماع تھا۔ مجھے لگا علامہ محمد اقبال بھی اگلی صف میں کھڑے ہیں۔ کسی نے میرے کان میں کہہ دیا یہ مسجد قرطبہ میں آخری نماز ہے جو باجماعت ہو رہی ہے۔ میں نے پوچھا آخر کیوں؟ تو وہ بولا۔ اس کی خصوصی اجازت ملی ہے۔ میں نے پوچھا، کیوں؟ تو اس نے کہا۔ تم اجنبی ہو۔ نہیں جانتے آفت آ چکی ہے سپین میں۔ ایسے میں سپین والوں نے دہائی دی ہے کہ یہ آفت

کسی طرح ٹل جائے تو مسلمانوں نے رات کو اذانیں دینا شروع کر دیں۔ پورے سپین کے خالی شہروں پر اُن اذانوں نے پرواز کی اور پھر کسی نے صلاح دی کہ مسجد قرطبہ کو کھولا جائے اور ان اذانوں کی گواہی کو پورا کیا جائے اور پھر یہ نماز ہوئی۔ میں وہاں تھا۔ مجھے لگا کہ پندرہویں صدی کے آخر میں جو آخری نماز پڑھی گئی ہو گی میں اُس میں شامل ہوا۔ اور علامہ اقبال کی روح اُن گنبدوں میں بسیرا کئے تھی اس لئے وہ بھی شامل ہو گئے تھے۔ یہ وقت سپین پر ایسا پڑا کہ دوبارہ بند مسجدیں کھول دی گئیں۔"

"مگر ایسی کیا آفت آئی؟"____

"میں مسجد قرطبہ سے باہر آیا تو ایک سفید پوش سفید ریش عمامہ پوش سامنے آیا، بولا۔"کہاں سے آئے ہو؟"

"اسی زمین کا باسی ہوں۔ اللہ کی زمین سے ہوں۔ جغرافیے پر یقین نہیں رکھتا۔"

"میرے جیسے ہو۔ معلوم ہے جب مسجد قرطبہ میں پہلی بار صفیں بچھائی گئیں تو وہاں میں تھا۔ میں نے وہ بچھائی تھیں اور تب سے اب تک میں یہاں مقرر ہوں۔"

"کہاں سے ہو؟"

"یہیں سے ہوں اور جانتا ہوں کب کب، کون کون یہاں نماز کے لئے آیا تھا۔ آدھی رات کے بعد ایک بار تو ایسا اجالا ہوا____ میں سہم گیا۔ رحمتہ للعالمین ہمارے نبی آخر الزماں دنیا کے راہبر، کائنات کے نگہبان حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرشتوں، صحابیوں اور آئمہ کے جلو میں آئے۔ میں نے صفیں لگائیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے سب کے ساتھ نماز پڑھائی۔ اذان حضرت بلالؓ نے دی۔ میں موجود تھا"____

"تم اتنی صدیاں کیسے جیئے؟"

"جیسے وہ صدیاں جئیں____ صدیاں کوئی ہم سے بالاتر ہیں۔ جیسے صدیاں جیتی ہیں ویسے ہم جیتے ہیں۔ ہم ایک سے دوسرے میں جیتے ہیں۔"

"یہ آفت کیا ہے؟"

"یہ آفت ابھی آئے گی اور سنا ہے کہ پورا سپین خالی ہو جائے گا۔ نہ کوئی کلیسا نہ کوئی بازار نہ کوئی گلی نہ کوئی محلہ نہ کوئی سڑک نہ کوئی شاپنگ مال نہ کوئی ریستوران نہ کوئی بار نہ کوئی پارک آباد دکھائی دے گا۔ سب خالی ہو جائے گا۔"

''یہ کیا سپین پر آفت آئے گی؟'' میں نے اُس سفید پوش بزرگ سے پوچھا۔

''نہیں یہ پوری دنیا پر آفت آئے گی۔ یاد رکھو اللہ نے ایسے عذاب اپنی گذشتہ قوموں پر بھی نازل کئے تھے۔''

''صدیاں کروٹ لے لیتی ہیں تو معلوم نہیں ہم کہاں سے کہاں آ جاتے ہیں۔''

''ابھی میں سپین میں تھا اب میں روم میں ہوں جہاں پر کلیساؤں، معبدوں اور تمام روم کی عمارات میں لگے ہوئے مجسمے جنہیں بڑے بڑے عظیم مجسمہ سازوں نے بنایا تھا۔ وہ صدیوں بعد زندہ ہو کر روم کے بڑے چوراہے پر گول دائرے میں دوزانو ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔ شہر خالی ہے۔ معبدوں اور کلیساؤں کے کبوتر جوان مجسموں پر غٹرغوں کرتے ہوئے بسیرا کرتے تھے۔ حیران ہو کر اُسی چوراہے میں جمع ہو کر ان مجسموں کے زندہ وجود کو دیکھتے ہیں۔ اب وہ تمام مجسمے دوزانو بیٹھ کر بین کرتے ہیں۔ اجتماعی بین کی آوازیں آس پاس کی عمارتوں میں رہنے والوں تک جاتی ہیں اور وہ بالکونیوں اور ٹیرس پر آ کر ان آوازوں کو سنتے ہیں اور آہ وزاری کرتے ہیں۔ کبوتر گریہ کرتے ہیں۔ میں اُن معبدوں کے مجسموں میں جا کر بیٹھ جاتا ہوں۔ وہ سر نیہوڑائے بین کرتے ہیں۔ صدیوں سے پتھروں میں قید یہ سب اب رہا ہو چکے تھے اور آ کر بیٹھ گئے تھے۔ سارے میوزیم جہاں یہ مجسمے بند تھے اب باہر آ چکے تھے اور تو اور میں نے پورے رات کی روشنی میں دیکھا۔ حضرت یسوع مسیح اپنی اپنی صلیبوں کے ساتھ تمام کلیساؤں سے باہر دائرہ بناتے ہیں اور پھر آسمان کی طرف منہ کر کے دعا کرتے ہیں۔ اے ہمارے رب! اے جس نے یسوع مسیح کو پیدا کیا۔ اب دہائی ہے۔ اب میری قوم پہ رحم فرما ـــــ قیامت کی گھڑی سے پہلے کی قیامت سے بچالے۔۔۔۔۔

میں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھا۔ روم کی اُس شام میں صدیاں سمٹ کر ایک لمحے میں آ چکی تھیں۔ وقت نے خود کو عبور کر لیا تھا۔ ہر کلیسا سے ایک یسوع مسیح صلیب سمیت آ گیا تھا ـــــ اور میں نے روم کی گلیوں میں ہواؤں کو بین کرتے دیکھا۔ اب جو خود کو دیکھا تو پیرس کے ناترے ڈیم کے گرجا گھر کے باہر کھڑا ہوں۔ وہاں کئی طرح کے مذاہب کے خدا جمع ہیں۔ اور ان کی مجلس میں اکیلا میں اجنبی ہوں۔ قدیم خداؤں کی قدیم تعلیمات یہاں گونج رہی تھیں۔ ہر خدا کی اپنی زبان تھی۔ یہ خداؤں کی مجلس دہائی دے رہی تھی کہ کائنات ابھی نا تمام ہے۔ اس لئے قیامت سے پہلے قیامت نہیں آ سکتی۔ یہ جو عذاب ہے اسے ٹل جانا چاہئے۔

تھوڑی ہی دیر میں جرمنی کے قدیم ترین گرجا گھر جو کولون میں ہے، کے سامنے میں نے دیکھا کہ

وہاں حضرت مریم علیہا السلام اور اُن تمام تصویروں میں سے پریاں، ننھی منی پریاں جو بی بی مریم کے آس پاس تھیں، وہ تصویروں سے باہر آ چکی ہیں اور کولون کے قدیم ترین گرجا گھر کے سامنے صحن میں جمع ہیں۔ میں نے ایسی ننھی منی پریاں اُن پینٹنگز میں دیکھی تھیں جو صدیوں پہلے بنائی گئی تھیں اور گرجا گھروں کی چھتوں اور دیواروں پر انہیں مصور کیا گیا تھا۔ یہاں بی بی مریم علیہا السلام نے اپنے دائرے میں بیٹھی ان پریوں اور نیک بیبیوں سے خطاب کیا کہ تم اس آفت میں اپنے بچوں اور شوہروں کے ساتھ نیکی کا سلوک کرنا —— یہ آفت کی گھڑی سخت کڑی ہے۔ عورتوں کو اس میں ثابت قدم رہنا ہوگا کہ گھر عورت کی جنت ہے اور سب کو گھروں میں رہنا ہوگا۔ میں حیران ہو کر بی بی مریم کا خطاب سن رہا تھا۔ یہ کولون جرمنی کی ایک صبح تھی۔ میں بہت دفعہ وہاں گیا۔ کولون کی نہر کے کنارے سیر کی۔ اس گرجا گھر کی قدامت پہ رشک کیا۔ مگر آج میں معلوم نہیں کس زمانے میں آ گیا تھا۔"

"یہ کون سی آفت ہے، جس کی نشانیاں آپ دیکھ آئے ہیں؟"

"معلوم نہیں، مگر معلوم ہے کہ آفت آئے گی، آنے والی ہے۔"

"آپ نے خواب دیکھا ہے یا آپ نے تاریخ کی کروٹ میں کسی لمحے کی کوئی بازگشت سنی ہے؟"

"معلوم نہیں۔ میں اب کہیں نہیں ہوتا اور کہیں پر بھی ہوتا ہوں۔"

"آپ کے ساتھ میں بھی اب کہیں نہیں ہوتی اور کہیں بھی ہوتی ہوں۔ ابھی میں پلٹن میدان ڈھاکہ میں تھی۔ جہاں ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبا اور طالبات بڑے جلوس میں پاکستانی فوج اور حکومت کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ اور دوسری طرف پاکستانی فوج اور پولیس نے بندوقیں تان رکھی تھیں۔ جونہی ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبا ان کی طرف بڑھے انہوں نے گولیاں چلا دیں۔ میں ایک طالب علم کی لاش کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ اتنا خون بہا کہ فیض احمد فیض کو کئی سال بعد وہاں جا کر خون کے چھینٹوں کو ہر دیوار پر دیکھنے کے بعد یہ کہنا پڑا ۔

خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

میں پلٹن میدان سے نکلی تو ایک ہوٹل میں مجھے قرۃ العین حیدر ملیں۔ مجھے نہیں پتہ یہ کیا زمانہ تھا اور میں کیوں وہاں تھی۔ میں کب پلٹن میدان سے نکلی، وہ کون سا سمے تھا۔ کیا گھڑی تھی۔ جب گھڑیاں آپس میں الجھ جائیں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایک یا دوسری سے ایسے چپک جاتی ہیں جیسے صدیوں پرانے کاغذ ایک دوسرے

سے چپک جاتے ہیں۔ الگ نہیں ہوتے۔ قرۃ العین حیدر کراچی سے ڈھاکہ آئی تھیں۔ میں نے پہچان لیا۔ میں تو اُس وقت کالج کی طالبہ تھی۔ وہاں ایک کالج میں ہمارا گروپ آیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کے آٹو گراف لیا اور پوچھا۔ ''آپ یہاں کیسے؟''

''ہم حکومت پاکستان کے غلام ہیں۔ محکمہ اطلاعات کے شعبہ فلم اور پبلسٹی میں۔ تو ہم سے کہا گیا کہ پاکستان ایئر لائنز میں لڑکیوں کی ایئر ہوسٹس کے طور پر تقرری کے لئے مشرقی پاکستان کا چکر لگاؤ اور مناسب لڑکیوں کو قائل کرو کہ وہ یہ پیشہ اپنائیں۔ اور ان کی وردی کے ڈیزائن کی ذمہ داری بھی ہمیں دی گئی ہے۔ ڈھاکہ کے بعد چٹا گانگ جا رہی ہوں۔ لگتا ہے کچھ خاص کامیابی نہیں ملے گی۔ ہاں لڑکی تم بھی تو اچھی خاصی ہو۔ بولو تم ایئر ہوسٹس بنو گی؟ ہواؤں کے دوش پر اڑتی پھرو گی۔''

''مگر میں تو ابھی پڑھنا چاہتی ہوں اور میرے والد تو اور طرح کے آدمی ہیں۔''

''خیر یونہی پوچھ لیا۔ جانا تو ہے مجھے چٹا گانگ اور پھر کُھلنا بھی ___ ''

میں یہ سب خود سے باتیں کر رہی تھی۔ آنس تو کہیں اور تھے۔ ذرا سا چونکے اور کھڑے ہوئے تو کہنے لگے۔ ''میں دیکھ رہا ہوں دنیا انسانوں سے خالی ہو جائے گی۔ انسان دکھائی نہیں دیں گے۔ بڑے بڑے میوزک ہال، تھیٹر ہال، سپورٹس سٹیڈیم، سیاحتی مقام، ہوٹل، ریستوران، پارک اور چوراہے، راہداریاں، یونیورسٹیاں، تعلیمی ادارے سب خالی ہو جائیں گے اور اُن جگہوں پر پرندے، جانور، زیرِ آب حیات اور درختوں پر ہریالی آ جائے گی۔ موسم بدل جائیں گے۔ انسان پھر سے غاروں کی طرف لپکیں گے۔ پرندوں، جانوروں اور پودوں میں رُکی ہوئی زندگی بحال ہو جائے گی۔''

آنس کی بات سے مجھے لگا کہ وہ مستقبل میں بھی جانے لگے ہیں۔ ماضی اور حال کی ترتیب تو بدل گئی تھی اب وہ مستقبل تک پھیل سکتے تھے ___ اب میں ڈر گئی تھی کہ معلوم نہیں کیا کچھ آنے والا ہے۔ مجھے آنس سے اب ڈر لگنے لگا تھا۔ وہ مجھے بھی بھٹکاتے تھے اور خود بھی بھٹکتے پھرتے تھے۔ میں اُن سے کتابیں چھپاتی تھی کہ کتاب دیکھ کر کسی یاد میں چلے جاتے تھے اور پھر وہاں سے کہیں اور نکل جاتے تھے۔ تاریخ دان کا ایک زمانے سے دوسرے زمانے میں نکل جانا کیا مشکل ہوتا ہے۔ وہ تو رہتا ہی زمانوں کے گرداب میں ہے۔ آنس بھی اسی طرح گرداب میں تھے۔

صبح چائے پی رہے تھے اور میں نے لان کی طرف کی کھڑکی کھول دی تھی۔ اچانک کہنے لگے ابھی

میرا جی آیا تھا۔

''میرا جی! وہ جو شاعر تھا۔ جس کی کتاب ''مشرق و مغرب کے نغمے'' ہے اور جمیل جالبی نے جس کا کلیات پہلی بار مرتب کیا تھا۔''

''ہاں ایک ہی میرا جی ہے دنیا میں ـــــ''

''تو میرا جی کس لئے آیا تھا؟'' ـــــ

''وہ کہنے لگا سعادت حسن منٹو نے اس کا خاکہ اچھا نہیں لکھا تھا۔ میری جیب میں دو گولے نہیں ہوتے تھے۔ تین گولے ہوتے تھے۔ تیسرا گولہ فطری طور پر میرے ہاتھ میں ہوتا تھا ـــــ وہ منٹو صاحب دیکھ نہیں سکتے تھے۔ وہ اگر کہتے تو میں دکھا بھی دیتا۔ پھر میرا جی نے بتایا کہ وہ مزنگ لاہور کے گھر سے نکلا تو سیدھا دلّی پہنچا۔ وہ میرا کی تلاش میں نہیں نکلا تھا۔ وہ تو سانولی سی معمولی شکل کی لڑکی تھی۔ میرے ساتھ ایک داستان بنانے کے کام آئی۔ میری شاعری کا گاہک تو آج بھی نہیں ہے۔ مجھے ن۔ م راشد نے مارا ہے۔ کم بخت اُسے بھی اُسی وقت میں آنا تھا۔ فیض احمد فیض کا چورن تو اور چیز تھی۔ وہ چورن تو بکنا ہی تھا کہ لکھنؤ کے مجاز، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی تو پھسڈی نکلے۔ دو گام چل کر فارغ ہو گئے۔ فیض کے چورن میں روس کی واڈکا بھی شامل ہو چکی تھی۔ خوب رنگ جما اور ایسے میں ن۔ م راشد نے میرے سارے راستے بند کر دیئے اور میں صرف منٹو کے خاکے میں محبوس ہو کر رہ گیا۔ راشد کو ایران اور انگلستان نے اور انگریزی نے مجھ سے بڑا شاعر بنا دیا۔ ہاں ایک اور بات بتانے آیا تھا۔ میرا بھائی جو مزنگ والے گھر میں رہ گیا تھا، پیدائشی فنکار تھا۔ اس کی آواز میں ایسا رس گھلا ہوا تھا کہ ریڈیو پاکستان لاہور کے سٹوڈیوز میں اس کی آواز کا جادو بولتا تھا۔ پتہ ہے کیا نام تھا اُس کا ـــــ لطیفی ـــــ یہ بھی ایک لطیفہ ہوا۔ ارے ہم سب ثناء اللہ ڈار اور لطف اللہ ڈار تھے۔ تو وہ لطیفی اور میں میرا جی بن گیا۔ میرے بھائی لطیفی نے سینکڑوں کردار کئے اور پی ٹی وی پر سیریل ''دریا'' میں چولستانی بزرگ کا کردار ادا کر کے سرائیکی علاقے کے دل جیت لئے تھے۔ اور اُن کے بیٹے راشد ڈار نے پی ٹی وی کے پروڈیوسر کی حیثیت میں ایسا کام کیا کہ آج میں کہہ سکتا ہوں کہ میرا جی تو نہ چمک سکا، میرا بھتیجا میرا نام بچا گیا ـــــ''

''میں نے میرا جی کو بتایا کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ آپ پر بڑا کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔''

''بالکل جھوٹ ہے یہ۔ کچھ نقاد نام چمکانے کے لئے مجھے استعمال کر رہے ہیں۔ مجید امجد اور میرا جی

کچھ نقادوں کے لئے فیشن بن چکے ہیں۔ اس سے صرف نقاد فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ہم دونوں فیض اور راشد کے قدموں کی خاک کے برابر بھی عزت نہیں پا سکے۔ میرا جی اور مجید امجد کا کوئی مستقبل نہیں کہ ہماری اولادیں اور مارکیٹنگ منیجر ہمارے لئے موجود ہی نہیں ہیں۔ ہم بس گئے۔ میرے دو گولے تاریخ میں زندہ رہیں گے۔ میں نہیں رہوں گا۔"

''اب دیکھا تو میرا جی نہیں تھا۔ وہ تھا ہی کب میرے دھیان میں تو تاریخ کے سارے سائے ایک ایک کر کے حرکت میں رہتے تھے۔ اور میں بھی تو سایہ ہی ہوں۔ جو لوگ میرے ساتھ رہے ہیں وہ مجھے ایسے ہی دیکھ رہے ہوں گے جیسے میں اپنے ملنے والوں کو دیکھ رہا ہوں۔"

یہ کوئی آدھی رات کا وقت ہوگا کہ بیڈ روم سے نکل کر لاؤنج میں آنس کسی سے باتیں کر رہے تھے۔ میں جاگی۔ آوازیں آ رہی تھیں۔ مگر آواز صرف آنس کی تھی۔ میں نے باہر جھانکا تو مجھے محسوس ہوا آنس کے سامنے کوئی بیٹھا ہے۔ مجھے اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پھر وہی آئینیسکو کے ڈرامے ''کرسیاں'' والا معاملہ تھا۔ آنس بات کر رہے تھے اور سامنے والے کا جواب بھی دے رہے تھے۔ جب آنس نے یہ کہا کہ راشد صاحب آپ کے بیٹے شہریار راشد سے میری دوستی تھی۔ وہ جلدی چلا گیا ___ آپ نے ایک اچھا کام کیا کہ اپنے ورثے میں شاعری کے علاوہ ساقی فاروقی کو بھی ہمارے لئے چھوڑا۔

ایک زوردار قہقہہ گونجا۔ میں ڈر گئی۔ اب مجھے پتہ چل گیا کہ ن۔ م راشد بیٹھا ہے اور مجھے اب اُس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ''ہاں ساقی فاروقی ہی شاعری اور ادب کی آخری آبرو بچی تھی جو میں نے سنبھال لی تھی۔"

''اور میں نے ساقی کے گھر پر آپ کا وہ مسودہ جو آپ نے ہاتھ سے لکھا تھا، چھ آنے والی کاپی میں پڑھا تھا۔ ''لا = انسان'' کی نظمیں اس میں تھیں۔ اور اس دن مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ میری آپ سے ملاقات ضرور ہو گی۔"

''مگر میں کیوں آیا ہوں اس وقت سات سمندروں سات آسمانوں سات زمینوں کا سینہ چیر کر، معلوم ہے؟"

''نہیں معلوم۔"

''تو سنو۔ آج بھی تمہارے گھٹیا نقاد یہ الزام لگاتے ہیں کہ راشد مسلمان کی موت نہیں مرا کہ اُس

نے خود کو جلانے کی وصیت کی۔ اب میں پوچھتا ہوں ان نقادوں سے کہ ان کی موت کیا مسلمانوں کی موت ہوگی۔ کیا وہ جانتے ہیں، وہ کس حالت میں مریں گے۔ اگر چہ اس پر بہت سی وضاحتیں اور بیانات آ چکے ہیں۔ پھر بھی مجھے آنا تھا، کسی نہ کسی کے پاس۔"

"ہاں راشد صاحب میں ہوں۔ میرے دروازے کھلے ہیں۔ تاریخ کا سچ صرف میرے پاس ہی داخل دفتر ہوتا ہے۔"

"تو پھر سنو۔ میں ایک کمزور انسان ہوں۔ میں قبر کے عذاب سے شدید خوفزدہ ہوں۔ مولانا حضرات نے قبر کے عذاب پر اتنے خطبے دیئے کہ میں نے قبر میں داخل ہونے سے ہی انکار کر دیا اور مجھے اپنے جسم کے اندر سانپ، بچھو اور کن سلائیاں رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں تو میں نے وہاں اپنی سانس کو Cremation کے Process سے گذرتے دیکھا تو یونہی کہہ دیا کہ یہ صاف عمل ہے۔"

"ہاں ایسی بات ساقی فاروقی نے لکھ دی تھی۔"

"اس میں یہ بات شامل نہیں تھی کہ مجھے قبر کے عذاب سے ڈر لگتا ہے۔"

"اور دنیا کی قبر کے سانپوں اور کن سلائیوں سے ڈر نہیں لگتا تھا؟"____

"دنیا کا خوف مٹانے کے لئے تو میں نے نظم لکھی تھی "زندگی سے ڈرتے ہو"۔

"بس آپ یہ بتانے آئے ہیں۔"

"نہیں یہ تو اضافی بات تھی۔ اصل بات یہ بتانی ہے کہ میرے ساتھ زمانے نے بھی زیادتی کی اور ادب کی دنیا اور نقادوں نے بھی____"

"وہ کیسے؟"

"پہلے تو میرے کندھوں پر دو بے یار و مددگار مسکین شاعروں کا بوجھ لاد دیا گیا۔ ایک مجید امجد اور دوسرے میرا جی۔ جہاں میرا نام اکیلے آنا چاہئے تھا وہاں یہ دو میرے دُم چھلے بن کر لٹکتے رہے۔ بھئی فیض کو الگ کر کے دیکھتے ہو پوری ترقی پسند تحریک سے تو جدیدیت کی تحریک میں مجھے سب سے الگ کر کے کیوں نہیں دیکھتے؟"

"اچھا تو آپ کا مسئلہ فیض احمد فیض ہیں؟"

''نہیں، میں اُن کا مسئلہ ہوں۔ وہ جتنے چاہے فیسٹیول منالیں۔ میرے وارث نہیں ہیں۔ میری اولاد میں کوئی نہیں ہے۔ لیکن یہ بتادوں کہ اکیسویں صدی کا وسط اردو شاعری میں میرا زمانہ ہوگا۔ تم مؤرخ ہو لکھ لو۔ اور بتاؤ کیا میں فیض سے کئی معنوں میں بڑا شاعر نہیں ہوں۔ موضوعات میں، لحن میں، عالمی تناظر میں، بہادری میں ــــ اور سب سے بڑھ کر جدید ڈکشن میں۔ فیض تو پرانی فرسودہ فارسی کی Romanticism میں لپٹا ہوا شاعر ہے۔ فارسی کا جلوہ دیکھنا ہے تو میری جدید فارسی سے لگاوٹ میں دیکھو۔ اے مؤرخ، اے زمانوں کے شناور، اے گذری تہذیبوں کے نوحہ خواں، اے بیتی ہوئی امتوں کی بستیوں کے رازداں ــــ سنو میں راشد بول رہا ہوں۔ فیض نے فارسی سے اکتساب کیا میں نے فارسی میں سانس لی ہے۔''

''میں ہی وہ مؤرخ ہوں۔ جس سے آپ نے خطاب کیا ہے اور آپ کی نظمیں بھی ایک خطاب ہیں لیکن آپ نے اپنا مقدمہ خوب لڑا ہے۔''

''ابھی مقدمہ لڑنا باقی ہے۔ اے مؤرخ سنو، فیض کو پوری ترقی پسند تحریک کی حمایت حاصل تھی۔ مجھے تو کسی تحریک نے آسرا نہ دیا۔''

''جدیدیت کی تحریک مسٹر راشد۔''

''مگر جدیدیت کو کسی نے مانا کب؟ ہرا ایرا غیرا جدیدیت میں آ گیا۔ حتیٰ کہ مبارک احمد بھی آ گیا۔''

''تو آپ نے فیض صاحب کو اپنا مخالف کیوں سمجھ لیا ہے؟''

''اس لئے کہ میں دیکھتا ہوں میری اولاد نہیں رہی تو اس کا مطلب ہے میرا ڈھول نہیں بج سکتا۔ ڈھول تو زمانے کو بجانا چاہئے تھا۔ یہاں اولادیں ڈھول بجا رہی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں فیض کی بیٹیاں نہ ہوتیں تو فیض کہاں ہوتا۔''

''لیکن فیض کی بیٹیاں بھی تو فیض ہی کی تربیت کی وجہ سے ہیں۔ انہوں نے اپنے خاندان کو کتنے جتن سے پالا پوسا، اور تعلیم دی۔''

''بے شک ہیں۔ مجھے کسی سے کچھ گلہ نہیں ہے۔ صرف زمانے سے ہے جو میری شاعری کو نہ سمجھ سکا نہ سمجھا سکا۔''

''تو راشد صاحب! فیض صاحب کی شاعری کو کس نے سمجھا ہے؟ بس عرس پر چادریں چڑھائی جاتی ہیں۔ جن میں فیض چھپ گیا ہے اور تو اور کاریگر نقاد انہیں انسان دوست اور مزدور دوست کے ساتھ ان

خواتین کا ٹانکا لگا دیتے ہیں جو انہیں ہاتھوں اور آنکھوں پر بٹھائے رکھتی تھیں۔ آپ بھی اپنے مستقبل کے لئے ایسی کسی ایک آدھ خاتون کا آسرا ہی لے لیتے اور پھر فیض نے تو اپنے شعری مجموعے کا دیباچہ آپ سے لکھوایا تھا۔"

"اس لئے کہ فیض عالم آدمی تھا۔ سمجھتا تھا کہ راشد کون ہے۔ ایسے دیباچہ نہیں لکھوایا۔"

"تو راشد صاحب آپ خود کو اقبال کے بعد بڑا شاعر سمجھتے ہیں؟"

"بڑا شاعر کوئی نہیں ہوا کرتا۔ مختلف اور متنوع شاعر ہوا کرتے ہیں۔ جو میں ہوں۔"

اب جو میں نے دیکھا کرسی خالی تھی۔ وہاں تو کوئی نہیں تھا۔ یہ سارے واہمے میرے خیال کی بے ترتیبی سے جنم لے رہے تھے یا آنس کے خللِ حافظہ کی وجہ سے ہو رہے تھے ـــــ اب مجھے ایک اور یاد نے گھیر لیا تھا۔ میں اور آنس تاریخ کی ایک کانفرنس میں نیپال میں تھے۔ کھٹمنڈو کے واحد فائیو سٹار ہوٹل Hyatt میں ہم تھے۔ میری عادت ہے کہ میں صبح جلدی اٹھ جاتی ہوں تو میں نے ایک دن ایک کام کیا۔ ہوٹل کے کمرے کی کھڑکی سے پردہ ہٹایا تو مجھے دور اوپر ایک راستہ جو پہاڑی پہ جا رہا تھا دکھائی دیا۔ میں اس طرح کے ملکوں میں خود ہی اجنبی راستوں پر نکل جاتی ہوں ـــــ کوئی کہانی ہاتھ نہ بھی آئے تو کوئی کردار کوئی مانوس اجنبی ضرور مل جاتا ہے اور پھر کچھ نہ بھی ملے تو وہ زمین وہ ہوا وہ صبح کا احساس تو ساتھ رہ جاتا ہے۔ میں خاموشی سے اپنے جاگرز پہن کر ہوٹل سے نکل گئی۔ مجھے معلوم تھا میں ایک ڈیڑھ گھنٹے میں واپس آ کر آنس کو ناشتے میں مل جاؤں گی۔ میں خوبصورت چوڑی سڑک جس پر لمبے لمبے خوبصورت درخت تھے، گزرنے کے بعد ایک پگڈنڈی پہ ہو لی۔ مجھے نہیں معلوم تھا وہ پگڈنڈی کھٹمنڈو کے اندر کئی دیہاتوں کو ملا دے گی۔ ایک طرف انٹرنیشنل ٹورسٹ سٹی اور بازو میں ایک دیہاتی آبادی۔ میں مکئی کے کھیت سے گزری۔ مجھے ریشمی بالوں والے مکئی کے سٹے ہوا میں جھولتے دکھائی دیئے۔ مجھے ایسے لگا سنہری بالوں والی کوئی گڑیا وہاں کھڑی ہے۔ جس کے بال ہوا میں سرسرا رہے ہیں۔ مکئی کے کھیت کے بعد وہاں ٹماٹر کا کھیت تھا سرخ اور پیلے گالوں والے ٹماٹر لگے ہوئے تھے۔ پھر شاید آلو کا کھیت ہوگا۔ میں وہاں جانا چاہتی تھی جہاں چند گھر تھے۔

ہوا ایسے تھی جیسے خوبصورت بہار میں ہوتی ہے ـــــ میں ان گھروں کے پاس پہنچی۔ عام سے گھر تھے۔ جب میں وہاں پہنچی تو ایک بچہ گھر کے باہر بیٹھا تھا۔ اس کا رنگ گورا تھا۔ میں چونکی لیکن پھر سوچا بچے تو ماں پہ بھی جا سکتے ہیں اور ہو سکتا ہے نیپال میں بچوں کے رنگ گورے ہوتے ہوں۔ میں آگے بڑھ گئی۔ آگے اور

خوبصورت منظر تھا۔ کچھ پہاڑ دکھائی دے رہے تھے۔

میں ذرا آگے بڑھی۔ خوبصورت لینڈ سکیپ جس میں ہریالی ہی ہریالی چاروں طرف سے امڈی پڑتی تھی۔ میں سوچنے لگی کہ یہاں میرا کوئی فارم ہاؤس ہوتا۔ جہاں میں کھڑکی کھول کر یہ سب دیکھتی اور کہانیاں لکھتی۔ کچھ آگے تک گئی۔ پھر سوچا آگے تو پہاڑی سلسلہ بہت دور دکھائی دے رہا ہے۔ فصلوں میں سے ہوتی ہوئی واپس آئی۔ تجسس گورے رنگ کے بچے کا تھا۔ میں صبح کی ٹھنڈی ہوا میں واپس آئی تو وہاں بچہ نہیں تھا ایک تیس بتیس سال کی گوری کھڑی تھی۔ اس کا لباس بس یہ تھا اوپر سے ایک چولی، نیچے لہنگا نما ایک زیر جامہ ـــــ گوری کی شکل وصورت ہالی وڈ کی ہیروئن جیسی نہیں تھی۔ بس یوں سمجھ لیں کہ رنگ گورا تھا۔ بال بھی سنہرے تھے۔ باقی جسم اور ناک نقشے سے معمولی قسم کی عورت تھی۔ جونہی میں سامنے آئی اس نے مجھے گڈ مارننگ کہہ دیا تو ظاہر ہے۔ مجھے بھی گڈ مارننگ کہنا پڑا ـــــ میں نے مسکرا کے دیکھا کہ یہ تو نیپالی عورت نہیں ہے۔ میں نے انگریزی میں یہی کہا۔ آپ کہاں سے ہیں؟ تو اُس نے کہا میں فرانس سے ہوں۔ اب تو میں چونکی کہ ایسی صبح میں ایک نیپالی کے گھر سے فرانسیسی عورت نکل رہی ہے۔ مسئلہ کیا ہے۔ گھر بھی معمولی ہے۔ میں نے پوچھا۔

''آپ یہاں کس لئے رہ رہی ہیں؟''

اُس نے کہا۔ ''اس بات کے لئے آپ کو بتانا ہوگا کہ آپ کون ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''میں پاکستان کی ایک کہانی لکھنے والی رائٹر ہوں۔''

اُس نے کہا۔ ''تو پھر اندر آ جائیں۔ پھر آپ کو پتہ چلے گا میں یہاں کیوں ہوں؟''

میں ایک چھوٹے سے کمرے میں جوتے اُتار کر گئی کہ وہاں یہ دستور تھا۔ پلاسٹک کی ایک شیٹ کمرے میں بچھی تھی اور چند سٹول رکھے تھے۔ ایک پر میں بیٹھ گئی۔ اندر ایک چھوٹے سے کچن سے ایک تیس سال ہی کا جوان چائے کی پیالی لے کر آیا۔ مجھے دیکھ کر حیران ہوا تو میں نے اپنا تعارف کرا دیا۔ اس فرانسیسی عورت نے کہا۔ ''ایک چائے اور لاؤ۔'' وہ نیپالی زبان جانتی تھی۔ وہ جوان جو مجھے محسوس ہوا اُس کا خاوند ہے، چلا گیا اور پھر کچھ دیر بعد میرے لئے چائے لایا اور بیٹھ گیا۔ اس دوران میں اپنی کہانی کی تلاش میں بھٹک رہی تھی۔ اب میں نے چونچ کھولی وہ بھی انگریزی میں تو اُس خاتون نے کہا۔ ''تم کیا سوچ رہی ہو کہ میں کون ہوں اور یہاں کیوں ہوں؟''

''ہاں میں تو یہی سوچ رہی ہوں۔''

تو اُس نے کہا۔ ''حیران نہ ہونا۔ میں ماؤنٹ ایورسٹ کو فتح کرنے کا خواب بچپن سے پال رہی تھی پھر میں نے فرانس اور سوئٹزرلینڈ میں ایسے کلب دیکھے جہاں یہ تربیت ہوتی تھی۔ میں شروع ہی سے ایڈونچر کیا کرتی تھی۔ فرانس اور سوئٹزرلینڈ کے پہاڑ تو جیسے میرے پاؤں کی ڈھول تھے۔ میں سکول اور کالج میں بھی ہائیکنگ کلب میں تھی تو اتنے Expiditions کیے اور کئی طرح کے انعام لیے۔ میرے گھر والوں نے مجھے اپنی طرف سے فیملی کے دھندوں سے الگ کر دیا تھا ___ ویسے بھی ایک باپ تھا اور بھائی، جو الگ رہتا تھا۔ باپ پینٹر تھا۔ اس لئے وہ مجھ سے کم ہی ملتا تھا۔ عجیب سی زندگی ہم سب کی الگ الگ تھی۔ میرا باپ آرٹسٹ تھا جسے میری ماں جلدی چھوڑ کے چلی گئی تھی اور پھر اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا اور اچھا ہی ہوا کہ مجھے اپنے پیچھے کسی کا انتظار نہیں تھا۔ باپ ہر وقت سٹوڈیو میں رہتا تھا۔ وہیں شراب پی کے سوجاتا تھا اور پھر جو کچھ کچن میں رکھا ہوتا تھا کھا لیتا تھا۔ وہ ڈبل روٹی پر کیلا یا سیب رکھ کے کھا جاتا تھا۔ اُس کے لئے دنیا بھر کی خوراک ایک جیسی تھی۔ میں جو کچھ لا کے فرج میں رکھ دیتی تھی وہ اسے استعمال کر لیتا تھا۔ پنیر، آلو، ڈبل روٹی، دودھ، سلاد ___ جو بھی ملتا وہ کھا لیتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کو دن کے دو تین وقفوں میں پیٹ کی آواز کو سننا ہے اور بس۔''

میں اُسے دیکھ رہی تھی اور حیران تھی کہ کھٹمنڈو کی پہلی صبح نے مجھے کیسا تحفہ دے دیا ہے۔ اگر میں اپنے ہوٹل سے نہ نکلی ہوتی اور صبح نہ ہوتی تو میں تو اس کہانی سے محروم رہ جاتی ___ وہ تو صبح سویرے ایسے بول رہی تھی جیسے کوئی کلاسیکل گلوکار اپنے صبح کے ریاض پر بیٹھ گیا ہو۔ اس لئے میں نے بولنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ بولتی رہی۔

''میں جب اپنے کسی Expidition سے واپس آتی تو بابا کے سٹوڈیو میں بے شمار پلیٹیں، گلاس اور کچن کا سامان اور خالی بوتلیں رکھی ہوتیں۔ جسے میں صاف کرتی اور ان سے ملاقات پھر بھی نہ ہوتی۔ بس دیکھا، مسکرائے اور اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ ہاں کبھی کبھی وہ پوچھ لیتے۔ کب ماؤنٹ ایورسٹ اور کے ٹو پر فرانس کا جھنڈا لہراؤ گی۔ میں مسکرا کر چلی جاتی۔ مجھے اپنے بھائی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ اپنی وضع کا آدمی تھا۔ معلوم نہیں اب کہاں ہوگا۔ کبھی کوئی رشتہ بن نہ سکا۔'' میں نے بیچ میں ٹوکا۔ ''اگر ابھی آپ کی ماں اور آپ کا بھائی آ جائیں تو کیا محسوس کرو گی؟''

''آپ جانتی ہی نہیں ہیں کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس لئے آپ اپنی کہانی کو جلدی ختم کرنے میں زیادہ دلچسپی لے رہی ہیں۔ اگر ابھی جلدی ہے تو کل آ کر میری کہانی سن لینا۔''

میں شرمندہ ہوئی کہ میں نے کہانی ابھی سننی تھی۔ معذرت کی تو وہ بولی ___

''میرا رشتہ بابا سے تھا کہ ایک دن میں ایک Expidition سے واپس آئی تو بابا نے بتایا کہ تمہارے نام ایک خط آیا ہے، پڑھ لو۔ میں نے خط پڑھا تو میں حیران رہ گئی کہ مجھے ماؤنٹ ایورسٹ کی Expidition کی ٹیم میں شامل کیا جا چکا تھا۔ بابا تو خط پڑھ چکے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور کہا۔ مجھے بھول جانا، تمہارا خواب تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ میں کچن سے سلاد، کیلا، سیب، ڈبل روٹی، دودھ اور پنیر لے لیا کروں گا۔ میری شراب نیچے گلی میں بکتی ہے۔ مجھے کسی اور شے کی ضرورت نہیں ہے اور میری یہ پینٹنگز جب میں مرجاؤں گا تو اسی کمرے میں ہوں گی۔ تم آ کے کسی بھی آرٹ کے نقاد کو بلا کر قیمت لگوا لینا۔ یہ تمہارے لئے میں چھوڑ جاؤں گا۔ میں نے کہا یہ آپ کیوں کہہ رہے ہیں تو بابا نے کہا۔ اس لئے کہ کوئی ماؤنٹ ایورسٹ فتح کرنے جاتا ہے تو سوچنا پڑتا ہے کہ واپس آئے گا یا نہیں۔ ہاں سن لو۔ جب بھی تم واپس آؤ اور میں نہ ملوں تو میرے اپارٹمنٹ کی چابی نیچے ریسیپشن پر تمہیں مل جائے گی۔ میں نے کہا۔ بابا، یہ سب تو مجھے معلوم ہے۔ مگر آپ کہاں جائیں گے۔ بابا نے کہا اب مجھے معلوم نہیں ہم دونوں میں سے پہلے کون دنیا سے جاتا ہے کہ اب تم ایسے سفر پر ہو جہاں کا کسی کو معلوم نہیں اور میں اپنی پینٹنگز کو مکمل ہوتے دیکھ رہا ہوں۔''

جب میں نے یہ بات سنی تو مجھے لگا ایک بڑی کہانی نے مجھے گلے لگا لیا ہے اور ہوٹل کے پاس ایک پہاڑی گلی میں ـــــ تو تجسس اور بڑھا کہ پینٹنگز کا کیا بنا ہوگا۔ اُن کو کس نے لیا ہوگا؟ اب میں پھر خاموش ہوگئی اور وہ بولنے لگی۔

''تو پھر میں اپنے خواب کے پیچھے دوڑتی نیپال آ گئی۔ ہمارا پورا ایک گروپ تھا۔ جس نے بہت جگہوں پر تربیت لے لی تھی۔ ہم یہاں آئے اور کئی دن ہم بیس کیمپ پر قیام کرنے لگے۔ یہاں میری ملاقات اِس سے ہوئی یہ جو ساتھ بیٹھا ہے۔'' اُس نے تیس سالہ نیپالی نوجوان کی طرف اشارہ کیا جو چائے لایا تھا۔ اس کا نام نیپالی تھا جو شاید اُسے بھی پوری طرح نہیں آتا تھا بس اتنا کہا۔ یہ پورنا راما ہے۔ میرے لئے بھی یہ نام بس برائے نام تھا۔ ''یہ ہماری ٹیم کے پورٹرز کی ٹیم میں تھا جو ہمارا سامان بیس کیمپ سے اوپر لے جاتے ہیں۔ ہم کئی کئی دن موسم کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں۔ یہ میرا پورٹر تھا اور ہم موسم کے حساب سے اوپر جاتے تھے اور موسم ٹھیک نہ ہو تو ہم رک کے رہتے تھے۔ یہ پورٹرز چونکہ مقامی ہوتے ہیں، اس لئے ہمیں ان پر پورا بھروسہ ہوتا ہے۔ ہم ہر طرح کے جدید ساز و سامان کے ساتھ یہ مہم شروع کر چکے تھے۔ ہمارے گروپ میں نیوزی لینڈ، جرمنی، سوئٹزر لینڈ اور سپین کے مہم جو شامل تھے۔ اور ہمارا گروپ بہت سے ایسے Expidition

کر چکا تھا اور اب یہ اُن کے لئے بہت اہم واقعہ تھا۔ ہمارے ساتھ دو انڈین میاں بیوی بھی تھے جو پہلے یہ مہم سر کر چکے تھے۔ وہ ایک خاص مقام تک جانا چاہتے تھے تا کہ اپنی یادوں کو تازہ کر سکیں۔ ہم سب ایک فیملی کی طرح بیس کیمپ میں موسم کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک صبح محسوس ہوا کہ موسم صاف ہو گیا ہے اور ایسی برف جو اوپر اوپر پڑتی ہے وہ یا تو صاف ہو چکی ہے یا اپنی جگہ بنا چکی ہے۔ مجھے بھی لگا یہ بہت آئیڈیل موسم ہے۔ ہمیں پتہ تھا آکسیجن کی کمی کا مسئلہ آ سکتا ہے، اس کے لئے ہم تیار تھے۔

اب ہمارا سفر اوپر کی طرف شروع ہوا۔ کئی مرحلوں میں ہمیں اوپر جانا ہوتا ہے میرے لئے تو یہ بے حد ضروری تھا کہ میری جیب میں فرانس کا پرچم تھا جسے میں نے وہاں لہرانا تھا ــــــ ہم ایسے موسم میں یہ مہم کر رہے تھے جسے ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے والوں کے لئے آئیڈیل موسم کہا جاتا ہے۔ ہم سب کی زبانیں مختلف تھیں۔ انگریزی سب کو معمولی آتی تھی۔ ہمارے نیپالی پورٹر بھی معمولی انگریزی سے کام چلا لیتے تھے ــــــ یہ Expidition اپنے معمول کے مطابق جاری تھی۔ یہ پورٹرز جو چند ڈالرز کے لئے اتنی مشقت کرتے تھے، معلوم نہیں کب سے اس کام پر لگے ہوئے تھے۔ تم اس چھوٹے سے پہاڑی اور دیہاتی گھر کو دیکھ رہی ہو، پورا نیپال اسی طرح رہتا ہے۔ کیا شہر کیا دیہات۔ یہ لوگ بس فطرت کی بندگی کرتے ہیں۔

میں نے زندگی میں کبھی محبت نہیں کی۔ وجہ میں خود ہوں۔ میرے ناک نقش تمہارے سامنے ہیں۔ کوئی میری طرف آیا ہی نہیں۔ اور مجھے اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ میں نے کبھی زندگی میں مرد کی کمی یا اس کی محبت کو محسوس ہی نہیں کیا۔ یہ پورٹر ہمارے ساتھ ساتھ تھا۔ یہ میرا سامان کندھے پر ڈال کے ہر مرحلے پر پہنچاتا تھا۔ ان لوگوں کو بھی آپ پورٹر نہ کہیں یہ بھی ہماری طرح ماؤنٹ ایورسٹ سر کر چکے ہیں۔ معمولی سا فرق ہے کہ یہ بچپن سے ان راستوں پر پوری مہارت سے آتے اور جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی بوجھ بھی اٹھاتے ہیں۔ یہ ہم سے زیادہ غیر معمولی لوگ ہیں۔ میں نے اس تجربے میں یہ سب دیکھا ہے۔''

اب میں نے دیکھا کہ میرے ہوٹل کا ناشتے کا وقت ساڑھے دس بجے تک کا تھا اور بس آدھ گھنٹہ باقی رہ گیا تھا۔ معاملہ ناشتہ کرنے کا نہیں تھا۔ آنس اکیلے پریشان ہوں گے کہ میں کہاں چلی گئی۔ تو میں نے کہا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

اب اس بے صبرے پن کو وہ سمجھ گئی تھی۔ اس لئے اُس نے شاید کب سے دبائی ہوئی کہانی کو میرے سامنے اُلٹ دیا ــــــ

''تو اب تم نے ہماری کہانی بنانی ہے تو میں بتا دیتی ہوں کہ ایک فرانسیسی پینٹر کی بیٹی نیپال کے ایک کسان خاندان کی کٹیا میں ایک بچے کے ساتھ کیوں رہ رہی ہے؟ پہلی دفعہ تمہیں یہ کہانی سنا رہی ہوں کہ صبح کا وقت ہے اور میرا خیال ہے میری کہانی کی بہترین محافظ صرف تم ہو سکتی ہو۔''

یہ بات سن کر تو مجھے افسوس ہوا کہ میرے پاس زیادہ وقت کیوں نہیں ہے تو میں نے اُسے کہا۔'' میں سڑک پار کے بڑے ہوٹل میں ٹھہری ہوں۔'' اس پر اُس نے کہا کہ جب ہم اس مہم پر آئے تھے تو اسی ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ اس کے بعد اُس نے بتایا کہ ہماری مہم ٹھیک چل رہی تھی جیسی کہ ہمیشہ ماؤنٹ ایورسٹ کی Expidition میں مختلف مرحلے ہوتے ہیں، وہ سب طے ہو رہے تھے کہ جب ہم ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی سے ایسے فاصلے پر تھے جو بہت ہی مشکل اور سب مہم سر کرنے والوں کا امتحان ہوتا ہے، اچانک اشارے ملے کہ موسم بدلنے لگا ہے اور یہ اچانک ہوتا تھا۔ کسی کو اس کی خبر نہیں ہوتی تھی اور ہمیں اس کی تربیت دی جاتی تھی۔ اس وقت یہ پورٹر ذرا اوپر تھا اور میں اپنے ساتھ دوسرے ٹیم کے لوگوں کے ساتھ فاصلوں پر تھی۔ موسم جب بدلتا ہے تو پھر معلوم نہیں ہوتا کہ کیا ہوگا۔ ایسا ہی ہوا ایک بہت بڑا تودہ برف کا ہم سب پر آ کے گرا۔ اتنی بڑی لینڈ سلائیڈ ہوئی کہ مجھے کچھ یاد نہیں کیا ہوا ـــــ پوری ٹیم اس کے نیچے دب گئی۔ پھر مجھے تو کچھ یاد نہیں ـــــ باقی یہ بتائے گا۔

اب میں سمجھ گئی کہانی کس رخ پر چلے گی تو اُس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بتایا کہ اُس کے پیشے کا یہ تقاضا تھا۔ وہ بتانے لگا کہ میں بھی اُس تودے کی لپیٹ میں آ چکا تھا اور یہ اس وجہ سے ہوا کہ گلوبل وارمنگ کا ہم نے سن رکھا تھا۔ اس سال زیادہ بارشیں نہیں ہوئی تھیں اور یہ الرٹ ہمیں نہیں دیا گیا تھا ـــــ اب میں تو پورٹر ہوں میرا تو بچپن اور لڑکپن انہی راستوں پر گذرا ہے۔ میرا باپ پورٹر تھا، میرا دادا پورٹر تھا، جب ایڈمنڈ ہیلری نے جو نیوزی لینڈ کا تھا، میرے دادا کے ساتھ پہلی بار ماؤنٹ ایورسٹ فتح کیا تھا، مجھے یہ ساری ٹریننگ دادا اور باپ کی طرف سے ورثے میں ملی ہے۔ لیکن مجھے ایسا لگا کہ میں برف کے نیچے بہت گہرا دب چکا ہوں۔ میں نے تھوڑی سی کوشش کی اور میرا سانس بند ہو چکا تھا لیکن میں نے برف کے تودے کے اندر سے نکلنے کی کوشش جاری رکھی اور پھر میں نکل آیا۔ اور اب میرے سامنے سفید برف پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے سانس بحال کیا اور پھر برف میں ہاتھ مارنے لگا تو مجھے لگا ایک جسم وہاں موجود ہے۔ جب میں نے اُس پر ہاتھ ڈالا تو یہ میرے ہاتھوں میں آ گئی۔ میں نے اِسے نکالا اور اس کو سانس دینے کے لئے میں نے اپنا منہ اس کے منہ پر رکھا کہ یہ

ہماری تربیت کا حصہ ہے۔ اس نے سانس لینا شروع کیا تو اس کی ناک اور منہ سے برف نکالی اور پھر یہ بے ہوش تھی۔ میں نے باقی ساتھیوں کو نکالنے کی کوشش کی مگر وہاں ہزاروں من برف پھیلی تھی۔ میں کسی کو نہ بچا سکا اور میں اسے کندھے پر ڈال کر نیچے اترا۔ نیچے بھی لینڈ سلائیڈ کی وجہ سے ہمارے راستے کے سب نشان مٹ چکے تھے۔ جب میں نے اسے اٹھایا تو اس کے جسم کی کئی ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ سانس نہیں آ رہی تھی تو جو میری تربیت ہے کہ منہ پہ منہ رکھ کے سانس کو بحال کرنے کا عمل کیا۔ پہلے تو کوئی فرق نہیں پڑا۔ ہماری تربیت ہوتی ہے کہ ایسے موقعوں پر جلدی نہیں کرنی۔ حوصلے سے کام لینا ہے۔ میں نے دوسری کوشش کی تو وہ کامیاب ہو گئی۔ کچھ دیر میں سانس آنے لگی مگر تکلیف میں تھی۔ اُدھر طوفان ابھی جاری تھا۔ کسی اور کے بچنے کی مجھے کوئی امید نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہمارے پورٹرز بھی نیچے دبے تھے۔ اب ایک اور بات ہوئی کہ اُس تودے پر ایک اور تودہ گر گیا، جس سے ان کے زندہ نکلنے کا امکان ختم ہو گیا۔ اب میں نے سوچا اسے کیسے بچانا ہے۔ اس کی تربیت بھی میرے دادا نے میرے باپ کو اور باپ نے مجھے دی تھی۔ میں نے سامان گرا دیا۔ ویسے بھی سامان تو دب دبا گیا تھا۔ میں نے اسے اپنے اوپر لادا اور میرے پاس دو طریقے تھے ایک تو مروجہ راستوں کے نشان دیکھ کر اُتروں، دوسرا میں پھسل کر نیچے جاؤں۔ دونوں کی تربیت مجھے تھی۔ مگر غلطی کا امکان تو ہر طریقے سے تھا۔ میں نے اس طوفان میں ہی نیچے کی طرف جانا شروع کر دیا۔ اس لئے کہ مجھے معلوم تھا اس طرح کے طوفان کبھی کبھی بارہ گھنٹوں تک یا اس سے بھی زیادہ جاری رہتے ہیں۔ مجھے معلوم تھا کوئی ہیلی کاپٹر اتنی جلدی نہ آ سکتا ہے نہ اُس کی امید تھی۔ اس لئے میں ہر طرح سے کوشش کر کے ایک Base camp تک آ گیا۔ مگر وہ مجھ سے پہچانا نہیں گیا کہ اس پر بھی طوفان نے حملہ کر دیا تھا۔ وہاں مجھے اندازے سے کچھ دیر رکنے کی جگہ ملی تو میں نے اندازہ لگایا کہ کب تک ہم نیچے اُتر جائیں گے اور نیچے والوں کو کچھ تو خبر ہو چکی ہوگی۔ شاید کوئی گاڑیاں یا ایمبولینس آ چکی ہو____"

"تمہاری زندگی اور پیشے کے دوران یہ کیا پہلا تجربہ تھا؟" اب میں نے پوچھ لیا۔

"نہیں، پہلے بھی ایسے واقعات ہوتے رہتے تھے لیکن یہ ذرا زیادہ شدید تھا اور پھر ہم میں سے کوئی باقی نہیں بچا تھا، سوائے ہم دونوں کے۔ تو پھر میں نے اسے دیکھا۔ اس کے پورے جسم کا جائزہ لیا۔ پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں، ہاتھ کی بازو والی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں اور ریڑھ کی ہڈی میں تکلیف تھی۔ جس کا مجھے بہت خوف تھا کہ ہمیشہ کے لئے معذوری ہوتی ہے۔ اب میں نے پھر خود کو تیار کیا اور فیصلہ کیا کہ مجھے کسی کی امداد کا انتظار نہیں

کرنا چاہئے اور کسی طرح نیچے جانا چاہئے۔ Base Camp راستے میں تھے۔ میں نے ایک اور Base Camp پر کچھ دیر قیام کیا۔ میرے پاس فرسٹ ایڈ کا سامان تو وہیں رہ گیا تھا کہ پورٹر کا تمام سامان بھی اُسی میں آ چکا تھا۔ اب میں وقفے وقفے سے اس کے منہ میں برف کے قطرے ڈالتا کہ اس کا گلا تر رہے۔ اب آخری Base Camp پر جب میں آیا تو مجھے لگا ہم شاید جلدی نیچے اُتر سکتے ہیں۔ لیکن وہاں نیچے جانے میں ابھی کئی گھنٹے لگنے تھے۔ مگر میں جان گیا تھا کہ میں اِسے بچا سکتا ہوں۔ اب میں نے ہمت کی اور نیچے موسم بہتر ہو چکا تھا۔ اس لئے میں اسے لے کر نیچے آ گیا۔ اس کو لے کر میں سیدھا اپنے ایک ہسپتال میں گیا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ اُس واقعے کا حصہ بنے۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ تھی کہ جونہی میں نے اِسے اس حادثے کا زخمی بتانا تھا تو پھر میرا رشتہ اس سے اُسی وقت ٹوٹ جائے گا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس پر نیپالی حکومت دنیا سے کئی تمغے حاصل کرے گی۔ اور تیسری وجہ یہ تھی کہ جو رشتہ میں نے اس سے بنایا ہے، اُس کا کوئی وجود نہیں رہے گا۔ اب ایسا ہوا کہ اس کا علاج ہوا اور یہ ٹھیک ہونے لگی۔ اُدھر اُس حادثے کی جو خبر نکلی وہ یہ تھی کہ جو بھی اس Expidition کا حصہ تھے سب کے سب اس طوفان میں برف کے نیچے دب کر ہلاک ہو چکے ہیں۔ اخباروں نے اور ٹیلی وژن پر سب کے نام اور تصویریں شائع ہو گئیں۔ اُن میں اس کی تصویر بھی تھی۔ جب میں نے اسے بتایا تو اس نے کہا۔ میں اب ایک اور زندگی گذارنا چاہتی ہوں۔ اگر وہ پریس میں آ کر حقیقت بتا دیتی تو اسے دنیا میں بہت شہرت مل سکتی تھی لیکن دنیا کی نظر میں پورٹر کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ کسی نے میرا نام نہیں لکھنا تھا کہ پورٹر محض ایک مزدور ہے۔ وہ ماؤنٹ ایورسٹ پر پہنچ کر بھی پورٹر ہی رہتا ہے۔ لیکن اِس نے فیصلہ کیا کہ ایک اور زندگی گذارنی چاہئے۔ اِن کی جگہ جو تودے میں دب گئی، وہ گئی اب ایک نئی عورت زندہ رہنا چاہتی تھی۔ اس دوران اسے میری خدمت کا پتہ چل گیا تھا اور نیپال میں یہ پہلے بھی آ چکی تھی۔ اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ یہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اس طرح ہم نے شادی کر لی اور یہ میرے گھر میں رہنے لگی۔ گھر تو آپ نے دیکھ ہی لیا ہے۔ یہ ہمارا بچہ ہے۔"

اب مجھے سب پتہ تو چل گیا تھا کہ کہانی مجھے ایک نیپالی پورٹر کے چھوٹے سے گھر میں مل گئی ہے۔ جس نے جان بچائی، اُس کا احسان اتنا بڑا تھا کہ فرانس کی لڑکی نے یہ زندگی پسند کر لی۔ مجھے اس کہانی میں نیپال کا کردار بہت بڑا معلوم ہوا۔ جہاں سارا سال خوبصورت موسم رہتا ہے۔ نہ شدید سردی نہ شدید گرمی اور ویسے بھی اس فرانسیسی لڑکی کا کوئی نہیں تھا جو اس کا انتظار کرتا۔ تو میں نے ایک آخری سوال کیا اور وہاں سے اُٹھ

گئی۔ وہ سوال یہ تھا۔ ''آپ کے بابا پینٹر تھے یا ہیں، انہوں نے اپنی ساری پینٹنگز ایک وصیت میں آپ کے نام کر دی تھیں تو ان کا کیا ہوگا؟''

''کچھ نہیں ہوگا۔ فرانس کے قانون کے تحت میں مر چکی ہوں۔ تو میں اگر اُن پینٹنگز کا کلیم کرتی ہوں تو بہت کچھ ثابت کرنا ہوگا۔ لیکن ایک آسان نسخہ ہے۔''

''وہ کیا ہے؟''

''بابا نے بتایا تھا کہ میں سٹوڈیو کی چابی اپارٹمنٹ میں کسے دے جاؤں گا۔ جہاں سے تم لے لینا تو میں جاؤں گی اور اسے لے کر جاؤں گی اور پھر وہاں سے چابی لوں گی اور میں اس کی مالک بن جاؤں گی۔''

اب میری کہانی مکمل ہو چکی تھی۔ میں وہاں سے اٹھی اور ہائیٹ ہوٹل آ گئی جہاں ناشتہ ہو چکا تھا۔ لوگ لابی میں کارنر میٹنگ کر رہے تھے۔ آنس ایک افریقی مؤرخ سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے جا کر بتایا کہ میں کہاں گئی تھی اور پھر میں ڈائننگ میں گئی۔ سب سامان سمیٹ رہے تھے تو ایک ویٹر نے پوچھا۔ آپ کچھ لیں گی تو میں نے مختصر سے ناشتے کا بتا دیا جو وہاں موجود تھا اور میں نے ناشتہ کر لیا ـــــ

اب باقی دن کیسے گذرے، کتنے ڈنر ہوئے، کتنی شرابیں چلیں، کتنے روزانہ کے ٹور ہوئے؟ ہم کہاں کہاں گئے یہ سب میری کہانی میں نہیں آتے۔

میں پاکستان آ گئی اور پھر چلی گئی ـــــ یہ آنکھ مچولی یادوں کی بہت دلچسپ کھیل ہے۔ میں اب کہاں گئی۔ میری یادداشت کا امتحان تھا۔ میں اب شاید فلپائن میں تھی۔ نہیں فلپائن کہیں میرے اندر سے نکل کر باہر آ گیا تھا۔ یہ کراچی کی باتیں ہیں جب میں وہاں اکثر آتی جاتی رہتی تھی۔ کچھ تو میرے بہن بھائی وہاں تھے تو کچھ میرے ادبی دوست وہاں تھے۔ سب کچھ ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کراچی میں ازبکستان، ترکمانستان اور غریب روسی ریاستوں سے عورتیں اپنے خاندانوں کے ساتھ غربت سے لتھڑی ہوئی آنے لگی تھیں۔ اُس وقت ابھی دبئی زیادہ اُبھر کر سامنے نہیں آیا تھا۔ ایسے میں کراچی بزنس کا شہر تھا اور ویسے اب بھی ہے کسی کو نہیں معلوم کہ لیاری، ملیر، ناظم آباد، کورنگی سے لے کر چاروں جانب پھیلی لاکھوں افراد پر مشتمل معمولی کالونیاں جو روزگار حاصل کرتی ہیں وہ کراچی کی اشرافیہ جو کلفٹن، ڈیفنس اور خاندانی پارسی، میمن اور پنجابی سودگران کی آباد کی ہوئی کلاسیکی آبادیوں میں رہتی ہیں، وہاں سے انہیں یہ رزق ملتا ہے۔ کراچی آج بھی اربوں کھربوں ڈالر کی معیشت کو ایک دن میں نمٹا لیتا ہے ـــــ تو ایسے میں کراچی میں روسی ریاستوں کے

ساتھ، بنگلہ دیش اور فلپائن سے عورتوں کو لایا گیا۔ ایسے میں ترکی سے بھی لڑکیاں لائی گئیں۔ میری معلومات کے مطابق پولینڈ اور بوسنیا، سیلوونیا، بنگلہ دیش اور اسی طرح کے غریب ملکوں سے لڑکیاں آسانی سے لائی جا رہی تھیں۔ یہ وہ کراچی تھا جس کی دولت کو ابھی قائدِ ایم کیوایم الطاف حسین کی نظر نہیں لگی تھی۔ یہ ایم کیوایم کے عزیز آباد کی ابتدا تھی۔ ابھی بند بوری لاشیں اور بھتہ پرچی تقسیم نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے کراچی میں تمام بڑے ہوٹلوں، کوٹھیوں، بنگلوں، قیمتی اپارٹمنٹس اور فلیٹوں کی شامیں بے دھڑک آباد تھیں۔ یہاں تک کہ مڈل کلاس، لوئر مڈل کلاس اور عام آدمی کے لئے بھی ہر طرح کی سیکس، شراب اور رات گئے طارق روڈ، برنس روڈ، بوٹ بین اور بندر روڈ کی فوڈ سٹریٹس کھلی ملتی تھیں۔ شاید یہ سب ایم کیوایم دیکھ رہی تھی اور اُسے اپنا مستقبل دکھائی دے رہا تھا۔ دبئ ابھی صرف بے حد امیر ترین طبقے کی آماج گاہ بنا تھا۔ ڈیفنس کے ساتھ گِذری، کلفٹن، سن سیٹ بولیوارڈ اور تین تلوار کے آس پاس سفارت خانوں، خاندانی رئیسوں اور بڑے بڑے بزنس ٹائیکونوں کے بنگلے تھے، جیسے کہ یونائیٹڈ بنک سے نکلے آغا حسن عابدی کے بینک نے شہرت پائی اور پھر وہ غروب ہوا تو آغا صاحب واپس تین تلوار والے اپنے بنگلے پر آ کر دم توڑتے ہیں۔ یہ وہ کراچی تھا جسے اب نظر لگنے والی تھی۔ لیکن نظر لگنے سے پہلے پنجاب، سرحد، بلوچستان اور بیرونی ممالک کے سرمایہ کار کراچی کو اپنا بزنس کا گڑھ بنا چکے تھے۔ کاش اس وقت کوئی ایم کیوایم کو سمجھ جاتا اور کراچی ماڈرن دبئ سے پہلے ہی کہیں اور پہنچ چکا ہوتا۔ لیکن ایسا ہو نہیں سکتا تھا کہ اس میں کئی طرح کے اداروں اور مافیاز کا مفاد وابستہ تھا۔

اُس وقت کے کراچی میں رئیسوں کی شادیوں میں کم سے کم تیس سے چالیس ڈشز کا ولیمہ یا شادی کا کھانا ہوتا تھا۔ بڑے بڑے ایونٹ مینیجرز اور ویڈنگ پلانرز سامنے آچکے تھے۔ سی فوڈ سے لے کر پنجابی، انڈین، اٹالین، چائنیز اور عرب فوڈ کے ماہرین اپنا اعتبار قائم کر چکے تھے۔ اس کراچی کو عروج پر بس یہاں دیکھا گیا۔ مشاہدے میں یہ بھی آیا تھا کہ پنجاب، صوبہ سرحد اور بلوچستان کے رؤسا اپنی بیٹیوں اور بیٹوں کی شادیاں تو گھر سے کرتے تھے ولیمے کے لئے کراچی کا انتخاب کرتے تھے اور کئی جہاز چارٹر کر کے اور فائیو سٹار ہوٹل بک کرا کے مہمانوں کو کراچی لے کر آتے تھے اور یہ تقریبات ہوتی تھیں۔ مگر الطاف حسین کے ساتھ اس کی پرورش کرنے والے نامعلوم ادارے دیکھ رہے تھے، انہیں اپنا حصہ چاہیے تھا۔

اس کراچی میں جب میں نے آنا جانا شروع کیا تو یہ تو ایسے لگتا تھا پاکستان کا حصہ ہی نہیں ہے۔ میرا

قیام عام طور پر فائیو سٹار ہوٹل میں ہوتا تھا۔ ہر بار میز بانوں کے ساتھ ہوٹل بھی بدل جاتا تھا لیکن ماحول ایک جیسا ہوتا تھا۔ لابی، ڈائننگ ریستوران، سوئمنگ پول کے کنارے اور ہوٹل کے کمروں میں اجنبی سفید چمڑی کی ہر سائز کی لڑکیاں ہر طرح کے لباسوں میں آتی جاتی ہوئی دیکھ رہی تھی۔ اب جو میں نے غور کیا تو معلوم ہوا ___ کراچی میں کئی طرح کے دلاّل آ چکے ہیں اور کراچی کی دولت میں سے اپنا حصہ لینا چاہتے ہیں۔ اُن کے کئی طرح کے چہرے تھے۔ اس وقت کے پلے پلائے کراچی کو لوٹنے والے، ایک خاص سیاسی پارٹی کے وڈیرے، سیاست دان، سرکاری افسران بالا، اور اگر مارشل لاء کی حکومتیں ہوں تو ریٹائرڈ فوجی افسران وغیرہ۔ سمندر کے راستے تجارت ایک سونے کا پہاڑ تھا۔ لانچوں کے ذریعے سونے سے لے کر کرنسی تک اِدھر اُدھر ہو جاتی تھی۔ بزنس میں ہر طرح کے غیر قانونی دھندوں میں ملوث، سیلز ٹیکس سے لے کر ہر طرح کے ٹیکس چرانے اور سرکاری خزانے کو ہر طرح سے اربوں کھربوں کا چونا دن دیہاڑے لگانے والے کراچی کی دولت کے انبار پر بیٹھے ہر شام مہنگی شرابیں اور غیر ملکی لڑکیوں سے محفلوں کو رنگین بنا رہے تھے اور ان شاموں کے مہمان، بڑے سرکاری افسران، سیاست دان، بزنس ٹائیکون، ریٹائرڈ آرمی افسران وغیرہ لمبی لمبی گاڑیوں میں رات گئے تک اڈے رہتے تھے۔ ایسے میں دبئی آباد ہونے لگا۔ بڑے بڑے پراپرٹی کے سودے، بڑے بڑے پروجیکٹ، اسی کراچی سے انہیں شاموں میں طے پا رہے تھے۔ قانون کے رکھوالوں اور سرکاری عہدوں پر فائز بڑے افسران کو پوری دنیا کے سفری ٹکٹ، رہائشیں اور تحائف معمولی باتیں تھیں۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ایک الطاف حسین یہ سب دیکھ رہا ہے اور پھر وہ ایسی دہشت پھیلائے گا کہ سب اس کے سائے میں آنے کے لئے مجبور ہو جائیں گے۔ اور پھر وہ اپنا حصہ ایسے لے گا کہ لندن میں وسیع و عریض اپارٹمنٹس لے کر پارٹی چندے کے نام پر اندھیر مچا دے گا۔ کراچی کے دولت کے انبار ایم کیو ایم کے آگے بچھ بچھ جائیں گے اور یہیں سے کراچی کو نظر لگی اور پھر آج تک جس جس نے اپنا حصہ مانگا اُسے اس کی توفیق کے مطابق ملنے لگا۔ ملکی خزانے کو جیسے لوٹا جا رہا تھا۔ ویسے ہی لوٹا جانا تھا ___ بس فرق یہ پڑا کہ لوٹنے والے گروہوں میں کچھ اور گروہ حصہ دار بن چکے تھے ___

ایسے ہی زمانے کی ایک شام تھی۔ کراچی کی نائٹ لائف ہر دن کی طرح انتہائی عروج پر تھی۔ شوبز ستارے، اس وقت کے نامور گلوکار ___ ایک فلائیٹ سے اترتے دوسری میں سوار ہو جاتے۔ صرف ایک شام کے لئے لاہور سے کراچی آتے اور شام گذار کر اگلی فلائیٹ سے لاہور واپس، پیسہ جیب میں ___ اُسی زمانے

میں پی آئی اے نے نائیٹ کوچ چلا دی تا کہ اس طرح کے لوگوں کو آسانی ہو جائے صرف شام بنانے کراچی آتے اور آدھی رات کے وقت فلائیٹ لے کر اگلے دن صبح اپنے آفس میں بیٹھے ہوتے۔

ایسی ہی ایک شام تھی۔ میں فائیو سٹار ہوٹل کے ایک کمرے میں تھی اور ناشتے میں دیکھ چکی تھی کہ یہاں کس قماش کی عورتیں ٹھہری ہوئی ہیں۔ میں سن بھی چکی تھی کہ جن ملکوں کا اوپر میں نے ذکر کیا ہے وہاں سے کراچی کی راتوں کو گرمانے کے لئے ان کو لایا جا چکا ہے۔ اور انہیں کمرے اسی لئے لے کر دیئے گئے ہیں کہ جو بھی گاہک اُن کو یہاں لابی یا سوئمنگ پول کے کنارے پسند کرے تو سودا طے ہونے کے بعد ان ہی کے کمروں میں جا کر اپنا کھوٹا سکہ کھرا کرے اور اپنی گاڑی میں بیٹھے اور اپنی راہ لے اور جو اسی ہوٹل میں اسی غرض سے ٹھہرتے ہیں، ان کے لئے تو اور بھی سہولت تھی کہ ایک کمرے سے نکلے دوسرے میں آئے اور جسمانی ضرورت کے بعد وہ اپنے کمرے میں آپ اپنے کمرے میں۔ ایک کہانی کار کی حیثیت سے میرے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کاش منٹو اس زمانے میں ہوتا تو نہ وہ کہانیوں کی تلاش میں مارا پھرتا نہ روزگار کی تلاش میں۔

مجھے اس ماحول کا علم تھا اس لئے میں پریشان نہیں تھی کہ مجھے تو زیادہ سے زیادہ دو تین راتوں ہی کے لئے ٹھہرنا ہوتا تھا۔ سارا دن میں باہر رہتی تھی۔ بس شام کو ہی اکثر تو رات کا کھانا کھا کے واپس آتی تھی یا پھر میں رات کا کھانا کمرے میں منگوا لیتی تھی۔ یہ میری اس ہوٹل میں دوسری رات تھی۔ اگرچہ یہ کراچی کا بہترین ہوٹل تھا اور مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ ہر شام فروٹ اور بیکری باسکٹ باقاعدگی سے رکھ جاتے تھے۔ ناشتہ بوفے ہوتا تھا اور اس میں بے شمار سٹالز ہوتے تھے۔ اور پھر میں کئی سالوں سے یہاں ٹھہر رہی تھی۔ اب جو میں اُس شام اپنے کمرے کے لئے واپس آئی تو لفٹ میں کئی طرح کے تماش بین جو پنجاب سے تھے، میں نے دیکھے۔ جب میرا فلور آیا تو میں اتر گئی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھی تو میرے آگے روم سروس کی ایک ٹرالی ویٹر لے کر جا رہا تھا۔ میں نے نظر ڈالی تو اس پر برف شیشے کے باؤلز میں رکھی تھی۔ اور کئی ڈشز ڈھکن سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ میرا تجسس بیدار ہوا کہ یہ مال کس کمرے میں جا رہا ہے۔ میں آہستہ ہو گئی۔ میرے کمرے سے ذرا پہلے وہ کمرہ تھا۔ اس نے بیل نہیں بجائی کہ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ ٹرالی لے کر اندر گیا اور میں وہاں پہنچی تو جو دیکھا وہ یہ تھا کہ اُس کمرے میں تین لڑکیاں نیم برہنہ پنجابی گیت پر بے ہودہ ڈانس کر رہی تھیں اور آس پاس کچھ لوگ شراب کے گلاس لئے بیٹھے تھے۔ میں اس جھلک کے بعد گذر گئی اور اپنے کمرے میں چلی گئی ___ اب میں سوچنے لگی کہ آئندہ یہاں نہیں ٹھہروں گی۔ لیکن پھر سوچا۔ کراچی کے تمام بڑے ہوٹل اسی کی

لپیٹ میں آ چکے ہیں تو پھر تم کیا سندھ کلب یا کراچی جمخانہ کلب میں ٹھہرو گی؟ تو کیا وہاں دودھ کے دھلے ٹھہرتے ہیں۔ وہاں تو معاملہ اور بھی خراب ہوگا۔ سو میں نے سوچا کہ جو بھی ماحول ہے میرے کمرے میں تو کوئی نہیں آئے گا۔ میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ ٹی وی لگایا اور معمول کے مطابق گھر بات کی اور چونکہ میں کھانا کھا کے آئی تھی تو میں بستر پر لیٹ کے ٹی وی دیکھ رہی تھی تو مجھے خوفناک چیخ سنائی دی، جو کسی لڑکی کی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے آس پاس کمروں میں بہت کچھ ہو رہا ہے تو میں نے اپنا دروازہ کھولا تو میں نے دیکھا۔ ایک کمرے سے ایک لڑکی بالکل برہنہ چیختی ہوئی بھاگی اور میں سامنے آئی تو میرے گلے لگ گئی۔ میں اُسے فوراً اپنے کمرے میں لے کر آئی اور دروازہ بند کر دیا۔ وہ گورے رنگ کی، چھوٹے قد کی بھرے بدن کی لڑکی تھی۔ فوراً بعد پتہ چلا کہ وہ فلپائن سے آئی تھی ـــــ

جونہی وہ کمرے میں آئی میں نے محسوس کیا وہ کانپ رہی تھی۔ میں نے اپنے بیڈ سے چادر نکالی اور اُسے لپیٹ دیا۔ مجھے لگا اُس نے ڈرگز لے رکھی ہیں۔ پل کی پل میں کراچی کا وہ سارا کردار جو میں پہلے بتا چکی ہوں، سامنے آ گیا۔ اور یہ بھی کہ کراچی کا کوئی فائیو سٹار ہوٹل اس شام ایسا نہیں ہو سکتا جہاں مختلف کمروں میں اس طرح کی محفلیں نہ ہو رہی ہوں۔ اس لئے مجھے شرمندگی نہیں تھی کہ میں اس ہوٹل کے ایک کمرے میں ہوں۔ یہ وہاں کا معمول تھا۔ اب میں نے اندر ہی سے باہر کی سرگرمی کو آوازوں سے پہچاننے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے جس کمرے میں یہ لڑکی آئی تھی وہاں سے کچھ لوگ آئے ہوں گے اور لابی میں دیکھ کے واپس کمرے میں جا چکے ہوں گے۔ بلکہ وہ یہ ظاہر کریں گے کہ اس لڑکی کا اُن کے کمرے سے کوئی تعلق نہیں۔ اب میرے لئے یہ مرحلہ تھا کہ اگر اس لڑکی کو کچھ ہو گیا تو یہ تو میری ذمہ داری بن جائے گی۔ میں نے دیکھا وہ ڈرگز کے اثر میں تھی اور ہلکی سی آواز میں ایک جملہ کہہ رہی تھی۔ ''You are not a same man''۔

میں نے دماغ لگایا تو ایسا لگا کہ وہاں یہ کسی کے ساتھ گئی اور ڈرگز لینے کے بعد اس نے اِسے استعمال کیا اور پھر اُس نے اپنے دوستوں کو بلا کر دعوتِ عام دے دی۔ مجھے یہ بات دماغ میں آئی تو میں نے فوراً ہوٹل کے منیجر کو فون کیا اور کہا فوراً میرے کمرے میں آئے۔ وہ یہ ساری باتیں سمجھتا تھا۔ اُس کی ناک کے نیچے یہ سب ہو رہا تھا۔ وہ فوراً آیا۔ میں نے اُسے وہ لڑکی جو چادر میں لپٹی بے ہوش پڑی تھی دکھائی ـــــ اور پورا واقعہ بھی بتایا اور اُس سے کہا میں پولیس اور پریس کو فون کرنا چاہتی ہوں۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو صبح تک سارے ثبوت آپ لوگ مٹا دیں گے۔ کمرہ نمبر فلاں سے یہ نکلی ہے اور وہ کمرہ کس کے نام پر بک ہے یہ ریکارڈ ہے۔

منیجر نے ہاتھ باندھ کے صرف یہ کہا کہ میں آپ کو پریذیڈنشل سُوٹ میں ابھی بھیج دیتا ہوں۔ وہاں آپ تک کوئی آواز نہیں آئے گی۔ میں آپ سے کچھ چارج نہیں کروں گا۔ ہوٹل کی عزت اور ساکھ کا سوال ہے۔ آپ ایسا نہ کریں۔ ویسے آپ ایسا کر بھی لیں گی تو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ پولیس کو سب پتہ ہے کہ اس وقت کراچی کے کس بنگلے، کس ہوٹل میں کیا ہو رہا ہے۔ بلکہ پولیس والوں کے لوگ ہم نے Accomodate کئے ہوئے ہیں۔ میں فوراً سمجھ گئی کہ میں پورے کراچی کے نائیٹ نیٹ ورک سے نہیں لڑ سکتی۔ تو میں نے کہا آپ کیا جانتے ہیں اُس کمرے میں کون کون ہیں؟۔۔۔۔۔منیجر نے کہا۔ آپ پریذیڈنشل سُوٹ میں چلی جائیں، اسے اسی کمرے میں چھوڑ دیں۔ میں سنبھال لوں گا۔ میں نے کہا۔ منیجر صاحب صبح تک تو آپ اس لڑکی پہ آدھا کراچی گذار دیں گے۔ یہ لڑکی تو میں نہیں دے سکتی۔ اس پر منیجر نے کہا آپ کیا چاہتی ہیں؟ میں نے کہا کہ پہلے تو میری Customer's Report لکھی جائے گی۔ ہم دونوں کے سائن ہوں گے۔ اُس کے بعد یہ لڑکی رات میرے ساتھ رہے گی اِسی کمرے میں اور تیسری بات یہ وہ کمرہ جہاں تماش بین جمع ہیں، اُس میں سے انہیں نکالیں اور اُس کمرے کی مجھے رپورٹ دیں۔ ورنہ میں رائٹر ہوں میں ہوٹل کے باہر اس لڑکی کے ساتھ پریس کانفرنس کروں گی۔ یہ انتہائی ملائم قسم کی وارننگ تھی۔ وہ خوش ہو کر گیا اور پندرہ منٹ بعد فون آیا کہ کمرہ ان تماش بینوں سے خالی ہو چکا ہے۔ بلکہ میرا خیال ہے وہ خود ہی بھاگ گئے ہوں گے۔

مجھے معلوم تھا وہ صبح تک اسی حالت میں سوئی رہے گی۔ میں بھی کچھ دیر بعد سو گئی۔ چونکہ وہ Customer's Report کی کاپی میرے پاس تھی، اس لئے میں سو گئی۔ صبح جب میری آنکھ کھلی تو وہ سوئی ہوئی تھی۔ میں نے چادر ہٹائی تو وہ برہنہ تھی۔ ظاہر ہے وہ برہنہ اندر آئی تھی۔ وہ بے حد معصوم لڑکی تھی۔ چہرہ پر سکون تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ وہ فلپائن سے کیسے نکلی۔ کون اُسے روزی روٹی کے لئے کراچی لایا اور کن حالات میں وہ بِک گئی؟ اب میرے اندر کا کہانی کار جاگ اُٹھا۔ میں نے چائے بنائی اور انتظار کرنے لگی کہ وہ کب جاگتی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ جیسی بھی ڈرگ ہوگی اُسے جاگنا ہوگا اور اگر نہ جاگی تو میں فون کر کے منیجر کو بلا لوں گی کہ وہ سب جانتا ہے۔

وہ صبح نو بجے کے آس پاس حرکت کرنے لگی۔ مجھے معلوم تھا کہ اب اُس ڈرگ کا نشہ ضرور ختم ہو چکا ہوگا۔ وہ اچانک اُس چادر میں سے نکل کر باہر آئی۔ بالکل برہنہ تھی۔ مشکل سے سترہ سال کی ہوگی۔ ظالموں

نے کس کس عمر کی لڑکی کو کہاں کہاں بیچا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے چیخ ماری۔ میں نے اُسے سنبھالا اور بتایا کہ رات کو کیا ہوا تھا؟

جب اُسے کچھ سمجھ آئی اور مجھے دیکھا تو مطمئن ہوئی اور کہا۔ ''میں کہاں ہوں؟'' میں نے اُسے رات والی بات بتائی۔ اُسے کچھ یاد آئی جب ڈرگز سے پہلے کی کیفیت تھی۔ میں نے اُسے بتایا کہ تم اُسی ہوٹل کے میرے کمرے میں ہو۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اُس نے کہا۔ اُسے پیاس لگی ہے۔ میں نے اُسے فریج سے جوس پانی سب نکال کے دیا۔۔۔۔ وہ بہت پیاسی تھی اُسے بھوک لگ رہی تھی۔ میز پر جو ہوٹل کی طرف سے بسکٹ اور فروٹ رکھا تھا، کھانے لگی۔ میں نے اُس سے پوچھ کے ناشتہ منگایا۔ میں نے اُسے اپنی لانگ نائٹی دی جو اُس نے پہن تو لی مگر ایسے لگتی تھی کہ کسی گڑیا کو کسی بڑی لڑکی کا فراک پہنا دیا جائے۔ میں نے منیجر سے اس کا لباس منگوالیا۔ منیجر کی ڈیوٹی آف ہو چکی تھی مگر وہ میرے رابطے میں تھا۔ ڈیوٹی منیجر سارا واقعہ جانتا تھا۔

اس نے اپنا نام بتایا۔ معلوم نہیں اصلی تھا یا فرضی۔ اس نے بتایا کہ وہ کسی ایجنٹ کے ذریعے پاکستان دس لڑکیوں کے ساتھ ریسٹورنٹ میں کام کرنے آئی تھی۔ اسے کام مل گیا تھا۔ اس دوران ایک فلپائنی لڑکی کے ذریعے وہ ڈرگز کے گروپ میں آ گئی۔ آمدنی بڑھانے کے لئے راتوں کو یہ سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ہر رات مفت کی ڈرگ میں یہ لڑکیاں بھول جاتی تھیں کہ ان کے جسم کا استعمال کراچی میں معمول کی بات ہوتی ہے۔ ناشتہ اس نے ایسے کیا جیسے کئی صدیوں کی بھوکی ہو۔ میں نے ناشتہ بوفے والوں سے منگایا تھا کہ سب کچھ لے کر آئیں۔ میں رات کے ایکشن سے ہوٹل والوں کو اپنی اہمیت بتا چکی تھی۔ ویسے بھی میں اکثر اس ہوٹل میں ٹھہرتی تھی، اس لئے وہ سب جانتے تھے۔ مجھے شام کی فلائیٹ سے واپس جانا تھا۔ اس لئے میں نے تو ابھی ٹھہرنا تھا۔ اُس نے ناشتے کے بعد جانے کا کہا۔ میں نے اُسے اپنا کارڈ دیا کہ احتیاط سے رکھ لے۔ میں نے بھی اس کا منیلا کا پتہ لیا اور یہاں وہ جس ریسٹورنٹ میں تھی، اس کا پتہ لے لیا۔ اب میں نے اُس سے پوچھا وہ کہاں جائے گی؟ اس نے بتایا کہ وہ اور کچھ لڑکیاں کلفٹن کی طرف ایک فلیٹ میں رہتی ہیں۔ وہاں جائے گی۔ میں نے سوچا، کلفٹن اور ڈی ایچ اے میں ہی اسی طرح کی جگہیں ہوتی ہیں جہاں انہیں ٹھہرایا جاتا ہے تاکہ آس پاس کے ہوٹلوں اور بنگلوں میں آمدورفت میں آسانی ہو۔۔۔۔ میں نے احتیاطاً ہوٹل کی گاڑی سے اُسے بھجوا دیا۔۔۔۔ اور بات ختم ہو گئی۔ لیکن بات ختم اتنی آسانی سے نہیں ہوا کرتی، میں بھول گئی۔ سب کچھ ذہن سے

صاف ہو گیا۔

ایک دن میرے گھر کے نمبر پر کال آئی۔ میں نے ہی اٹھائی تو دوسری طرف سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں آواز آئی۔ جس سے معلوم ہوا کہ وہ منیلا سے بول رہی ہے۔ اور اُس رات کا حوالہ تھا ـــــ مجھے جاننے میں وقت نہیں لگا۔ اُس نے اتنا بتایا کہ وہ کچھ پیسے جمع کر کے واپس آ چکی ہے اور وہ ایک کسان گھرانے سے تھی اور اب وہ ریسٹورنٹ میں کام کر رہی ہے۔ اگر کبھی میں منیلا آؤں تو اُسے ملوں ـــــ اب زمانہ بدلا موبائل فون آ گئے۔ اُس نے مسلسل مجھ سے رابطہ رکھا ـــــ لیکن میں فلپائن کہاں جا سکتی تھی۔ آخر ایک دن میری ایک دوست نے فون کیا کہ اُس کی بیٹی فارن سروس میں ہونے کی وجہ سے انڈونیشیا میں پاکستان ایمبیسی میں ہے۔ چاہو تو تم یہ سب علاقے دیکھ سکتی ہو۔ سوچا تو مجھے اُسی کا خیال آیا اور میں چل پڑی۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ سترہ سال کی گوری بھرے جسم والی فلپائنی اب کس حال میں ہو گی۔

اُس واقعے سے پندرہ سال بعد میں انڈونیشیا جا رہی تھی اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کس حال میں ہو گی۔ انڈونیشیا سے میں ایک دو دنوں کے لئے اُس سے ملنے جا سکتی تھی۔ مجھے وہاں کچھ نہیں دیکھنا تھا۔ بس معلوم کرنا تھا کہ انڈونیشیا نے اتنے کرپٹ حکمران سہارتو کے باوجود کس طرح ترقی کی۔ اور وہاں کی خواتین ناول نگاروں اور شاعروں نے کیا کچھ کہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں ایک حیرت کو دور کرنا چاہتی تھی کہ 1985ء سے 2000ء کے دوران بنگلہ دیشی اور فلپائنی لڑکیاں سعودیہ، گلف اور یو اے ای کے ساتھ کراچی میں امیر گھرانوں میں بچوں کی دیکھ ریکھ کے لئے ملازم رکھی جاتی تھیں اور امریکہ یورپ تک ساتھ سفر کیا کرتی تھیں۔ یا پھر مختلف ہوٹلوں میں لانڈری اور ہاؤس کیپنگ کے لئے ملازم رکھی جاتی تھیں۔ لیکن آج جب میں سوچ رہی تھی تو بنگلہ دیش، فلپائن اور تائیوان کے ساتھ ویت نام نے غربت کو شکست دینے کے لئے جو ترقی کی ہے۔ اُس نے دنیا کی مارکیٹوں کو پریشان کر دیا ہے ـــــ آج امریکہ یورپ میں ان ملکوں کے بنائے ہوئے گارمنٹس، جوتے، کھلونے، الیکٹرانکس اور گھریلو استعمال کی مصنوعات ڈالرز، پاؤنڈز اور یورو میں مل جاتی ہیں۔ میرے لئے ایک اور بات بھی بے حد اہم تھی کہ دنیا کی فلموں کے نقشے پر فلپائن بے حد نمایاں ہو کر آ رہا تھا۔ جبکہ فلم کے میڈیم میں تو پاکستان ناکام ہو کر گھر بیٹھ چکا تھا۔ میرے لئے یہ بات اس لئے اہم تھی کہ سمندر کے بیچ فلپائن جزیرہ ہی ہے جیسے انڈونیشیا ہے۔ جیسے مالدیپ ہے یا ہوائی ہے یا اس طرح کے اور کئی چھوٹے ملک ہیں۔ اب میری دلچسپی یہ تھی کہ میں فلپائن میں جا کر سینما دیکھوں۔ جہاں ان کی فلمیں جو کہ اب عالمی سطح پر

جاپانی اور چینی سینما کی توسیع ہو کر یہ ثابت کر رہی ہیں کہ ساؤتھ ایشین سینما ہالی وڈ سینما اور یورپی سینما کو آنکھیں دکھا سکتا ہے۔ میں نے فلپائن کی کچھ فلمیں دیکھیں۔ جن میں اُنہوں نے اپنی جدوجہد کی تاریخ کے ساتھ اپنی غربت کو ملا کر پیش کیا تھا۔ سمندری حیات کے ساتھ فلپائنی کسان عورتوں نے جس طرح چاولوں کی فصل اُگائی اور پھر کس طرح اپنے بچوں کو اپنی کمر پر لاد کر سخت موسم کا مقابلہ کر کے جھیلوں، دریاؤں، سمندروں اور پانیوں کے ذخیروں سے روزی کمائی اور پھر دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر کے ایک معمولی سی ٹورازم دریافت کی ـــــ جس میں عالمی سطح کے فوڈ چینل اور فوڈ پروگراموں کے ہوسٹ یہاں آئے اور ایک نیا فلپائن دریافت ہونے لگا۔ جب فلپائنی لڑکیاں عرب ملکوں اور پاکستان کے ساحلوں پر بکنے کے لئے آ رہی تھیں، اس وقت وہاں کی فرسٹ لیڈی امیلڈا مارکوس دنیا کی امیر ترین عورت بن چکی تھی اور جب وہاں تبدیلی آئی تو وہ سونے چاندی، ہیروں اور ڈالروں میں سر تک ڈوب چکی تھی۔ اسی طرح انڈونیشیا کے عوام بھی سوہارتو کی حکومت کے وقت غربت کی چکی میں پسنے لگے تھے۔ اور پھر حسینہ واجد کے دور میں بنگلہ دیش اُس کی کرپشن کے نتیجے میں نیچے جا چکا تھا۔

اب ہمارے ملک میں کیا ہوا؟ کن کن کی باریاں لگیں، قوم کو ابھی اس کا اندازہ لگانے میں وقت لگے گا۔

میں اس لئے بھی فلپائن جانا چاہتی تھی کہ اُس لڑکی کے ذریعے فلپائن کو پھلتے پھولتے ایک نظر دیکھ آؤں۔ جواب لڑکی سے عورت بن چکی ہوگی۔ فلپائن روانہ ہونے سے پہلے میں انڈونیشیا کی دو خاتون ناول نگاروں سے ملنا چاہتی تھی۔ ایک کا نام این ایچ دینی اور دوسری کا نام آئیو اُتامی تھا۔ دینی بڑی عمر کی تھی۔ 2018ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اُس وقت وہ صحت مند تھی۔ دونوں سے میری الگ الگ ملاقاتیں ہوئیں۔ دونوں خوبصورت علاقوں میں رہائش رکھتی تھیں۔ آئیو اُتامی تو ابھی جوان تھی اور اس نے اپنے ناولوں سے شہرت پائی تھی۔ میں ان کے ناول لے کر آئی تھی۔ بہت کم کام انگریزی میں ترجمہ ہوا تھا۔ دونوں کے موضوعات میں فرق تھا ـــــ مسلمان عورت کے کم و بیش وہی مسائل تھے جو ہمارے معاشروں میں ہوتے ہیں۔ لیکن زندگی کی گہرائی اُن کے تجربے میں ہم سے زیادہ تھی ـــــ اپنے سسٹم پر ان کے بھی وہی سوالات تھے جو کسی بھی ترقی پذیر معاشرے میں ہو سکتے ہیں۔

اب میں فلپائن کے لئے روانہ ہوئی تو اُس کو اطلاع کر دی۔ اور اُسے منع کیا کہ وہ مجھے لینے ائیرپورٹ نہ آئے۔ میں ٹیکسی لے کر ہوٹل چلی جاؤں گی بلکہ اُسے بتایا کہ ہوٹل کی گاڑی آئی ہوگی۔ اُس وقت اُس نے میری بات مان لی لیکن مجھے معلوم تھا وہ ضرور آئے گی۔ محض ایک رات کا رشتہ وہ بھی ایسا کہ جس میں

پوری رات اُس کی یادداشت خاموش رہی۔ وہ شاید نشے میں تھی۔ لیکن وہ شاید اس کی زندگی کی سب سے بڑی رات تھی، جس نے اُسے اپنی باقی زندگی کو بچانے کے لئے کوئی کردار ادا کیا۔ اب جو میں وہاں اُتری تو سہ پہر کا وقت تھا۔ میرے ساتھ کئی یورپی، امریکی ٹورسٹ بھی تھے جو مختلف ملکوں سے ہوتے ہوئے یہاں آ رہے تھے۔ میں باہر آئی تو مجھے یقین تھا وہ لڑکی جواب بھرے بھرے جسم کے ساتھ عورت بن چکی ہوگی، کھڑی ہوگی اور مجھے پہچان لے گی۔ ایسا ہی ہوا کہ میں نے فاصلے سے پہچان لیا۔ بھرے بھرے جسم والی اب ذرا اور بھر گئی تھی۔ سامنے کھڑی تھی اور اس کے ہاتھ میں فلپائن کے پانی میں کھلنے والے پھولوں کا ہار تھا۔ اُس رات کی گورے رنگ کی بھری بھری لڑکی جو میرے بازوؤں میں آ گئی تھی، میں اس کے بدن کا لمس آج بھی محسوس کر سکتی تھی۔ میں سیدھی اس کے سامنے کھڑی ہوگئی اور اس نے میرے گلے میں روایتی ہار ڈال دیا ـــــ ہوٹل کا ڈرائیور آ چکا تھا۔ جب میں نے اُسے بتایا تو اس نے کہا یہ ہوٹل تو میرے ریسٹورنٹ کے بہت قریب ہے کیونکہ میرا ریسٹورنٹ ٹورسٹ علاقے میں ہے جہاں یہ ہوٹل ہے۔ مجھے پتہ چلا وہ ایک ریسٹورنٹ کی مالک ہے۔ جہاں ہر وقت ٹورسٹ امڈے رہتے ہیں۔ بڑی ضد کر کے وہ مجھے ہوٹل چھوڑ گئی اور پھر اگلے دن میں اُس کے ریسٹورنٹ پہنچی تو مجھے اپنا آپ بہت اچھا لگا کہ اُس رات اگر میں اُس فائیو سٹار میں نہ ٹھہری ہوتی تو پتہ نہیں اس لڑکی کے ساتھ کیا ہو جاتا۔ مثلاً وہ کسی قریبی تھانے پہنچ جاتی یا پہنچا دی جاتی اور پورا تھانہ اُس کے جسم کا استعمال کرتا ـــــ یا معلوم نہیں کیا ہو جاتا ـــــ اب جب میں نے وہ ریسٹورنٹ دیکھا جو مصروف ٹورسٹ ایریا میں تھا اور آس پاس اور بھی بے شمار ریسٹورنٹ تھے۔ میں نے پوچھا۔ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟ اور یہ سب کیا ہے؟ اُس نے بتایا یہ میرا ذاتی ریسٹورنٹ ہے اور پورے منیلا میں بہت مشہور ہے۔ میری دو بیٹیاں اور شوہر بھی اس بزنس میں میرے ساتھ ہے۔ میرا شوہر ریسٹورنٹ کے لئے لاجسٹک اور سپلائیز کا ذمہ دار ہے۔ میری دو بیٹیاں کسٹمر سروس سنبھالتی ہیں۔ میں کچن سنبھالتی ہوں۔ میرے پاس تیس لڑکیاں ملازم ہیں۔ میں نے کسی لڑکے کو ملازم نہیں رکھا۔ اس لئے کہ یہاں عورتوں کی زیادہ ضرورت ہے اس طرح کے ریسٹورنٹس کے لئے۔

"یہ سب تو ٹھیک ہے۔ پاکستان سے یہاں تک کا فاصلہ کیسے طے کیا؟"

پہلے تو وہ مجھے اپنے ریسٹورنٹ کی ایک مخصوص ٹیبل پر لے آئی۔ دو تین لڑکیوں نے میرا استقبال کیا۔ پھول دیئے جیسے میں معلوم نہیں کس طرح کی مہمان ہوں۔ ویسے مجھے تو پتہ تھا میں کس طرح کی مہمان ہوں ـــــ اب اُس نے بتایا کہ پاکستان میں ڈرگز نے اُسے اُس زندگی میں ڈال دیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب

کراچی ڈرگز میں ملوث ہو چکا تھا۔ اور مختلف ملکوں سے جن کا ذکر آپ نے کیا تھا لڑکیاں ڈرگز ڈالر کے چکر میں دبئی، ابوظہبی اور کراچی میں آ رہی تھیں۔ ایسے میں فلپائن سے بھی لڑکیوں کے تاجر کراچی اُترتے تھے۔ میں نے جس ریسٹورنٹ میں ملازمت کی اس نے مجھے یہ کام سکھا دیا تھا۔ اس کے بعد نائٹ لائف نے مجھے بھی دوسری لڑکیوں کے ساتھ لیٹ نائٹ کے اس کام میں ڈال دیا ـــــ چونکہ ہمارا کراچی کا ریسٹورنٹ دن کے بارہ بجے ملازموں کو بلاتا تھا تو میرے لئے یہ اتنا مشکل کام نہیں تھا کہ رات بھی اپنی دن بھی اپنا ـــــ لیکن اُس رات یہ ہوا کہ۔۔۔۔۔

''نہیں رُک جاؤ ـــــ مجھے جو یاد ہے صاف صاف بتاؤ ـــــ''

''جس ریسٹورنٹ میں رات دس بجے تک ڈیوٹی دیتی تھی، وہ پوش علاقے کا چائنیز ریسٹورنٹ تھا۔ اس کے بعد کی زندگی ہماری ہوتی تھی۔ ایسے میں ایک لڑکی نے مجھے ڈرگز کا رستہ دکھایا اور ڈرگز کے لئے پیسے تو ہوتے نہیں تھے۔ تو امیر گھروں کے لڑکے ہمیں لے جاتے تھے۔ ڈرگز کے بعد وہ ہم سے کچھ بھی کر لیتے تھے۔ ہمیں برا نہیں لگتا تھا۔ اس لئے کہ ہمیں پتہ بھی نہیں چلتا تھا کہ جسم ہمارے ساتھ ہے یا نہیں ـــــ اور شاید اُن کو بھی پتہ نہ چلتا ہو کہ انہوں نے کیا کیا ہے۔''

میں یہ بات سمجھ رہی تھی۔ وہ پوری دیانت داری سے مجھے کراچی کا نائٹ کلچر سمجھا رہی تھی۔ اس کے بعد میں نے دیکھا اس کا ریستوران دنیا کے ٹورسٹس سے بھر گیا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا بیچتی ہو؟''

اُس نے کہا۔ ''یہاں سمندری خوراک، گوشت، سبزیاں سب بکتا ہے۔ ہاں جو تم پوچھ رہی ہو وہ یہ ہے کہ سُوٴر کا گوشت یہاں نہیں بکتا۔ نہ مینڈک، نہ سانپ، نہ کوئی اور کیڑا مکوڑا ـــــ یہاں بطخ، مرغی اور بھیڑ کا گوشت بکتا ہے۔ اگرچہ میں مسلمان نہیں ہوں مگر میری تربیت پاکستان میں ہوئی ہے۔''

میں نے اُس سے کہا کہ سُوٴر کا گوشت تو پوری دنیا میں لذیذ سمجھا جاتا ہے تو یہاں لوگ پسند نہیں کرتے؟

''وہ سامنے جو ریسٹورنٹ ہے وہ سُوٴر کے گوشت کے لئے بہت مشہور ہے۔ وہاں بڑی دنیا جاتی ہے۔ میں نے اپنی الگ پہچان رکھی ہے۔ میرے گاہک صرف میرے پاس ہی آتے ہیں۔''

اتنے میں اُس نے فلپائن کی ٹھنڈی بیئر منگا لی اور کہنے لگی۔ ''ہماری یہ بیئر دنیا میں جاتی ہے اور بہت پسند کی جاتی ہے۔'' بوتل کا سائز عام فلپائنی لڑکی جیسا تھا، یعنی درمیانہ سا ـــــ اُس وقت وہ میری میزبان تھی۔

ریسٹورنٹ کا پورا کام اس کی بیٹیاں اور سٹاف دیکھ رہا تھا۔ البتہ اُس نے کہا۔'' آپ کے لئے میں خود کھانا تیار کروں گی۔'' اُسے نہیں معلوم تھا کہ مجھے کھانے میں کیا پسند ہے۔ اس نے کہا۔'' میں آپ سے آپ کی پسند نہیں پوچھوں گی۔ مجھے اندازہ ہے آپ کیا پسند کرتی ہوں گی۔''

اُس وقت میرا مسئلہ تو کھانا تھا ہی نہیں۔ میں تو اُس لڑکی کو بڑا ہوتا ہوا دیکھ رہی تھی جو ہوٹل کے کاریڈور میں برہنہ میرے سینے سے آ لگی تھی۔ میں نے کہا جو دل چاہے کرو۔ وہ کچھ دیر اپنے بارے میں بات کرتی رہی کہ اس کے والدین معمولی کسان تھے۔ والدہ شدید گرمی میں چاولوں کی پنیری لگاتے ہوئے مجھے اپنی پیٹھ پر لادے رہتی تھیں اور اکثر میرا دم گھٹ جاتا تو وہ مجھے ہوا کے رُخ پر لاتی تھیں کہ میں سانس لے سکوں ــــــ میں بچپن میں بیمار رہتی تھی۔ کئی طرح کی بیماریاں یہاں جسمانی ہیں۔ پیٹ کی ہیں۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ جب مجھے جسم میں تبدیلی محسوس ہوئی، میری چھاتیاں اُبھرنے لگیں اور مجھے پورے جسم کے اندر کوئی شے لہریں لیتی ہوئی محسوس ہوئی تو مجھے لگا کہ مجھے کسی جسم کی گرمی چاہئے۔ اپنے جسم کی گرمی ہی بہت تھی ــــــ پھر مجھے معلوم نہیں کہ کیسے میں بڑی ہوگئی اور پھر مجھے کسی ایجنٹ کے ذریعے پاکستان بھیج دیا گیا اور پھر میری زندگی آپ نے بدل کے رکھ دی۔ اب میں ایک امیر عورت ہوں۔ اس ریسٹورنٹ کے بعد میرے تین اور ریسٹورنٹ مختلف شہروں میں ہیں۔ کبھی کبھی وہاں جاتی ہوں۔ وہاں سب انتظام میں یہاں سے دیکھتی ہوں ــــــ

پھر وہ مجھ سے اجازت لے کر گئی کہ میں آپ کے لئے کچن میں خود کھانا تیار کرتی ہوں۔ ایک بیرؔ اور آ گئی اور میں ماحول میں کھوگئی۔ باہر سڑک پر سائیکلوں پر موٹر سائیکلوں پر لڑکے لڑکیاں آ جا رہے تھے۔ ٹریفک میں سائیکل رکشہ، موٹر رکشہ، ٹیکسی اور ہر طرح کی ٹرانسپورٹ کی گہما گہمی تھی۔ ریسٹورنٹ میں شاید ہی کوئی ٹیبل خالی ہو۔ جو ٹیبل خالی ہوتی تھی فوراً وہاں فیملی آ جاتی تھی۔ لگتا تھا یہ بہت اچھی فوڈ کے لئے مشہور ہے۔ وہاں غیر ملکی بھی تھے۔ جن کا تعلق میرے حساب سے انڈیا، آسٹریلیا، چین، جاپان، ملائیشیا، ویت نام اور یورپ سے تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ کبھی کبھی ایک اتفاق کتنا اہم ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے اُس شام میرا کمرہ کسی اور فلور پر ہوتا تو اس کی زندگی کچھ اور ہوتی۔ ہوسکتا ہے میں اس رات کراچی ہی میں نہ ہوتی۔ اور پھر میں کراچی پر سوچنے لگی کہ اُس شام کا کراچی کیا تھا۔ دولت کے انبار پر پورے کراچی کی اشرافیہ، مڈل کلاس بلکہ لوئر کلاس کسی نہ کسی حیثیت میں اپنا راانحصار اضی کر رہی تھی ــــــ اور آج اُسی کراچی کو پہلے ایم کیو ایم نے ساتھ میں ایجنسیوں نے مختلف محکموں نے اور سیاسی جماعتوں نے ایسے چوسا ہے کہ دودھ کے بس کچھ ہی قطرے باقی بچے ہیں۔ شہر

کچرے کا ڈھیر بن گیا۔ پانی سے محروم ہو گیا۔ خوراک سے محروم ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اب عورت کے جسم کی وہ قیمت بھی نہیں لگتی جو پہلے لگا کرتی تھی۔ شراب جعلی سے جعلی تر ہوتی گئی اور جعلی شراب کی وجہ سے ہزاروں لوگ موت کے منہ میں روزانہ جاتے ہیں۔ جہاں راتوں کو سکاچ کا راج تھا آج ان خالی بوتلوں میں زہر بکتا ہے۔ تو پھر 1989ء سے آج تک ہم نے کراچی کو کتنا کھایا ہے اور پیا ہے کہ وہ ایک مردہ گائے بن چکی ہے اور ایک گلی میں لیٹی ہے، جس پر کسی قصاب کی نگاہ بھی نہیں پڑتی۔ نہ وہ پاکستان سٹیل رہی نہ پی آئی اے رہی۔ نہ ریلوے رہی نہ کراچی پورٹ ٹرسٹ رہا۔ نہ وہ فائیو سٹار رہے نہ اُن میں رہنے والے رہے۔ میں یہ سوچ رہی تھی کہ وہ اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ میرے لئے کھانا لے کر آ گئی۔ پہلے تو اُس نے شمعیں جلائیں۔ میرے اعزاز میں کھانے کا اعلان کیا۔ پھر کنول کے سفید پھولوں کا ایک ہار مجھے پہنایا گیا۔ پھر اس کی بیٹیوں نے وہ ڈشز میز پر رکھیں۔ مسکرا کے استقبال کیا۔ انہوں نے ریسٹورنٹ کی یونیفارم پہنی ہوئی تھی۔ اب میز بھر گئی تو میں نے پوچھا یہ کیا کیا ہے؟ اُس نے بتایا ــــــ

''یہ وہ مچھلی ہے جو گہرے پانیوں میں سفر کرتی ہے۔ آج صبح میں نے خاص آپ کے لئے منگائی تھی۔ اسے صرف بھاپ میں بنایا جاتا ہے۔ خاص طرح سے اس پر مصالحے لگائے جاتے ہیں ــــــ اس کے ساتھ ہمارے ملک کی جڑی بوٹیاں اور سبزیوں کو اُبال کر رکھا جاتا ہے۔ دوسری ڈش پرانز کی ہے۔ یہ بھی ہمارے اپنے پانیوں کی ہیں۔ ان میں سرخ تیز مرچ کو پیس کر کچھ جڑی بوٹیوں کے ساتھ ایک اپنی بنی ہوئی ساس میں ہلکی آگ میں پکایا ہے۔ آپ کو ذرا تیز مصالحہ محسوس ہوگا ــــــ اور یہ تیسری ڈش سبزیوں اور بطخ کے ان پارچوں کو باربی کیو کر کے بنایا گیا ہے جو بطخ کے سینے سے لئے گئے ہیں۔''

میرے لئے یہ شام تو جیسے ابھی بھی میرے اس کمرے میں اُتری ہوئی تھی۔ اس شام کو میں اپنے ساتھ اپنے لاؤنج میں لے کر آئی تھی۔ اپنی پسند کی شاموں کو میں سہیلی کی طرح ساتھ ساتھ لئے پھرتی ہوں۔ مجھے وہ لڑکی جو عورت بن کے ایک بزنس ویمن کے روپ میں میرے سامنے بیٹھی تھی۔ معلوم نہیں مجھے کتنی خوشی دے رہی تھی۔ خوشی کو میں نے کبھی سمجھا نہیں تھا۔ بس یہی ایک لمحہ تھا جب میں نے خوشی کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اُسے اپنی رگوں میں قطرہ قطرہ اُترتے بھی دیکھا ــــــ مجھے معلوم تھا اب ہماری کبھی ملاقات نہ ہو سکے گی۔ میں نے اُس کی دونوں بیٹیوں کی آنکھوں میں میرے لئے جو آنسو تیر رہے تھے، وہ میرا شکریہ ادا کر رہے تھے کہ آپ نے ہماری ماں کو بچا لیا۔ آنے والی ہماری نسلوں کو بچا لیا۔ میں نے پلکیں سمیٹیں اور اپنے آنسو چھپا کر گاڑی میں

کبھی اور مڑ کے نہیں دیکھا ـــــ

ابھی وہ میرے ساتھ تھی چلی گئی ہے۔ میں آنس کے پاس گئی کہ وہ کس سے باتیں کر رہے ہیں۔ جونہی میں نے بیڈروم کا دروازہ کھولا وہ باتیں کر رہے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ کس سے باتیں کر رہے تھے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ جب میں اندر جاتی وہ خاموش ہو جاتے۔ مجھے نہیں پتہ چلتا تھا کہ وہ کس سے ملاقات کر رہے ہیں۔ اب میں نے ان کی ملاقات میں مخل ہونا چھوڑ دیا ـــــ بس ہماری ملاقات ناشتے، کھانے یا رات کے کھانے پر ہوتی۔ بلکہ رات کا کھانا کیا تھا۔ میں ان کو ڈرنک بنا کر دیتی تو وہ بس اُسے ہاتھ میں تھامے گھونٹ بھر کے کسی سے باتیں شروع کر دیتے تھے۔ اس طرح ایک ڈرنک ایک گھنٹے میں ختم ہوتی تھی تو میں دوسرا ڈرنک ہاتھ میں تھما دیتی تھی۔ وہ پھر باتیں کرنے لگتے تھے۔ مجھے معلوم ہو جاتا تھا وہ کس کس سے باتیں کر رہے ہیں۔ وہ تاریخ، ادب، شاعری، معاشیات، سیاست اور فنونِ لطیفہ کے شعبوں میں پورا پورا شغف رکھتے تھے اس لئے وہ کئی طرح کی شخصیتوں کے ساتھ مکالمہ کر رہے ہوتے تھے۔ اب میں کس کس شخصیت کا مکالمہ سنتی۔ وہاں تو کارل مارکس تک بیٹھا ہوتا تھا۔ کبھی کامیو، کبھی کافکا، کبھی مارکیز، کبھی رڈیارڈ کپلنگ، کبھی ٹی ایس ایلیٹ، کبھی غالب، کبھی میر تقی میر ـــــ

ایک شام جب ایک ڈرنک ہاتھ میں تھی تو جو میں نے سنا وہ یہ تھا ـــــ

''مسٹر غالب آپ اپنے مطلب کے پکے ہیں۔ خواہ مخواہ بے چارے ابراہیم ذوق کو آپ نے ولن بنا کے رکھا۔ وہ شریف آدمی تھا۔ آپ کو جس سے کام ہوتا تھا آپ اس تک پہنچنے کی سیڑھی بناتے تھے۔ یہ آپ کے خطوط سے واضح ہوتا ہے۔ پہلے کس کو خط لکھنا ہے۔ پھر اُس نے کس کو خط لکھنا ہے۔ پھر اُس کے ذریعے سے کہاں تک بات جائے گی۔ ویسے یہ بری بات نہیں ہے؟ ـــــ کلکتے کا سفر اسی مقصد کے لئے تھا۔ البتہ اس کا آپ نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ شاید ایک دو غزلیں اس حوالے سے ہوں مگر یہ سفر تو رائیگاں تھا۔''

پھر مجھے پتہ نہیں کہ غالب نے اُن سے کیا کہا۔ میں تو صرف آنس کو سن رہی تھی۔ تو آنس نے کہا۔

''جنابِ عالی! آپ کے دیوانوں نے بہت غُل مچایا۔ عبدالرحمٰن بجنوری ہوں کہ حالی ہوں کہ گوپی چند نارنگ ہوں۔ آپ کی غزل کا حق ادا نہیں ہوا۔ آپ جیسا جینئیس اردو زبان نے پیدا نہیں کیا۔ کس ادا سے اللہ میاں سے پیچ ڈال لیتے ہیں۔ گر و یہ آپ کا ہی حصہ ہے۔ لیکن جناب آپ ہیں دنیادار، ویسے اس میں کوئی ہرج نہیں

ہے۔ آپ لاکھ فقیری دعویٰ کریں۔ آپ کو یہ دعویٰ سجتا ضرور ہے لیکن دنیاداری آپ کو نبھانی آتی تھی۔ صرف ایک بار چُوک ہوئی جب کالے خان نے آپ کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ حالانکہ ہم تو یہ کام پولیس کے تھانے میں کرتے رہے ہیں۔ میں نے کئی بار پولیس افسر کے ساتھ تھانے میں شراب پی ہے۔ جوا تو معمولی بات ہے۔ اسے ہم تین پتّی کہتے ہیں۔ حضرت آپ دھر لئے گئے۔ یہاں دنیاداری کام نہیں آئی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں یہ کالے خان کی کوئی اور پرخاش تھی۔ جس کا یہ نتیجہ تھا۔ ویسے آپ کی آن بان شان تو قائم رہی لیکن آپ خط بے مقصد نہیں لکھتے تھے۔ سوائے ان خطوط کے جو غدر کے ہنگامے کے بعد تنہائی بہلانے کے لئے لکھے۔ ایک خط میں آپ نے لکھا کہ میرے گھر میں سترہ بوتلیں شراب کی رکھی ہیں۔ روٹی میسر ہے۔ اس لئے میں دن رات فکر وستی میں رہتا ہوں۔ میں نے آپ پر رشک کیا کہ میرے گھر میں کبھی اکٹھی سترہ بوتلیں جمع نہیں ہوئیں۔

پھر ایک اور خط میں آپ نے لکھا ہے کہ پینے کو قطرہ شراب نہیں بس روٹی پر گذارا ہے ــــــ روٹی میسر ہے۔ مجھے یہ ذرا حسنِ طلب لگتا ہے۔ ضرور جس کو آپ نے لکھا ہوگا وہ آپ کے حضور کرفیو توڑ کر ضرور شراب لایا ہوگا۔ نہیں لایا ہوگا تو مردود ٹھہرا ہوگا۔"

اب میں نے یہ باتیں تو سن لیں۔ ظاہر ہے خالی کرسی تھی۔ اب آنس اس طرح کی خود کلامی میں مبتلا ہو چکے تھے۔ یہ اور بھی خطرناک بات تھی۔ اب میں کہاں تک ان کی خود کلامی کا بوجھ اٹھاتی کہ خود میں بھی اُسی رنگ میں رنگی جا رہی تھی ــــــ اب میری خود کلامی بھی جاری ہو رہی تھی۔ مجھے اچانک محسوس ہوا کہ صفیہ سامنے بیٹھی ہے۔ یہ صفیہ سعادت حسن منٹو کی بیوی تھی۔ یہ جان نثار اختر کی بیوی صفیہ نہیں تھی۔ میں نے صفیہ کو عینک لگائے دیکھا تو پہچان گئی کہ یہ منٹو صاحب کی بیگم ہیں۔ میرے اندر تو طوفان برپا تھا اس لئے میں نے پوچھا کہ منٹو صاحب کو آپ نے برداشت کیا، یہ کیسا تجربہ تھا؟ ــــــ میں نے دیکھا صفیہ کے چہرے پر غصہ نمودار ہوا۔ "آپ کون ہوتی ہیں ایسا سوال کرنے والی؟ کیا آپ نے منٹو صاحب کے ساتھ رات گذاری ہے؟ میں نے کئی راتیں گذاری ہیں ــــــ آپ کو کیا معلوم منٹو کون تھا؟ بلکہ کسی کو بھی نہیں معلوم منٹو کون تھا۔ بمبئی کے سیٹھ کو نہیں معلوم۔ دلّی کے ادیبوں اور آل انڈیا ریڈیو کے لوگوں کو نہیں معلوم منٹو کون تھا اور آپ کو بھی نہیں معلوم منٹو صاحب کون تھے۔ وہ ایک ایسے انسان تھے کہ جب اُن کی گود میں ان کا بیٹا بمبئی میں دم توڑ گیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دئے تھے۔ وہ اپنے بیٹے کو سینے سے الگ نہیں کر رہے تھے۔ میں نے اس معصوم بچے کو اُن سے الگ کیا تھا۔"

میں یہی تو چاہتی تھی۔ صفیہ منٹو اندر سے بول اٹھیں اور آج سارا حساب برابر کر دیں کہ وہ منٹو صاحب کی وفات کے بعد بولی نہیں تھیں ـــــ میں نے پوچھا۔ ''بمبئی سے آنے کے بعد منٹو صاحب خوش تھے یا نہیں؟''

''منٹو صاحب کبھی بھی کسی بھی طرح کے حالات میں خوش نہیں تھے۔ بس چند وقفے ہیں جن میں انہیں محسوس ہوا کہ معاشرے نے اُن کی توقیر میں اضافہ کیا ہے۔ یہ بات ان کے چند خطوط میں موجود ہے۔ باقی سب بنڈل تھا۔ خود اُس نے لکھا ہے۔ دونوں طرف کے ادیب منٹو سے خوفزدہ تھے کیا ترقی پسند کیا رجعت پسند ـــــ یہ جو منٹو نے خود کو فراڈ لکھا ہے۔ دراصل وہ دونوں طرف کی ادیب برادری کو فراڈ کہنا چاہتے تھے۔ غصہ اپنے پہ نکال دیا۔ جب وہ بمبئی میں تھے تو جتنے فلم کی دنیا میں لکھنے والے پہنچے سب کو منٹو سے خوف تھا کہ یہاں بھی وہ کسی کو ٹکنے نہیں دے گا۔ اس لئے پاکستان بننے پر انہوں نے بغلیں بجائیں کہ اب منٹو کو پاکستان کی سرحد سے پار دھکا دے دیں گے۔ وہ نہیں جانتے تھے منٹو کہیں بھی ہو گا وہ سب لکھنے والوں کے لئے خطرناک ہی ہو گا۔ پاکستان میں آ کر جو افسانے اس نے لکھے اس پر پورا اردو فکشن آج بھی ناز کر رہا ہے۔ بمبئی میں کتنے مسلمان لکھنے والے فلم کی دنیا سے وابستہ ہوئے۔ کسی اور کو تو بحری جہاز میں اشوک کمار اور سنجیو کمار نے بٹھا کر دھکا نہیں دیا۔ پھر منٹو کیوں؟ اختر الایمان، کیفی اعظمی، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی اور شاہد لطیف، نوشاد علی، راجہ مہدی علی خان اور بعد میں پاکستان سے شاعروں نے جس شاعر کو دھکا دیا، اُس نے بمبئی کی فلمی دنیا کو لوٹ لیا۔ نام تو یاد ہو گا عبدالحئی ساحر لدھیانوی۔ ایسے ہی منٹو کو بھی بمبئی کے رائٹرز نے دھکا دیا تھا۔ لاہور کے شاعروں کو معلوم تھا ساحر اُن کو کہیں کا نہیں چھوڑے گا۔ اس لئے اُسے کسی بھی اخبار، رسالے یا ریڈیو میں کام دلانے سے گریز کیا گیا ـــــ آخر ایک دن سگریٹ کے ٹوٹے پی کے راتوں کو جاگنے والا ساحر والٹن ایئر پورٹ سے بمبئی کے لئے روانہ ہو گیا۔ احمد راہی، اے حمید اور قتیل شفائی کی گواہی موجود ہے۔''

''وہ تو ہے۔ ہم پڑھ چکے ہیں۔ منٹو صاحب کے پاکستان آنے کے بعد آپ کیا سمجھتی ہیں کہ یہ اُن کی غلطی تھی کہ وہ آئے یا پاکستان کے ادیبوں اور اداروں کی منافقت ہے کہ وہ منٹو صاحب کو ان کے شایانِ شان ماحول نہ دے سکے۔''

''آپ کے اپنے سوال میں جواب موجود ہے اور منٹو صاحب ایک ایک لمحے کا حساب لکھ کر گئے ہیں۔ آپ نے پڑھ ہی لیا ہو گا۔ سننا ہے تو سن لیں۔ انہوں نے یہاں آ کر کیا کچھ نہیں لکھا۔ شاہکار افسانے جن

میں وہ افسانہ بھی شامل ہے جسے دنیا کے اب تک کے فکشن کے سو بہترین افسانوں میں شامل کیا گیا ہے۔ جن میں مہابھارت بھی شامل ہے۔ اور کافکا کامیو سے لے کر روسی عظیم کہانی کار بھی شامل ہیں۔ اور اس افسانے کا نام ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' ہے اور ٹوبہ ٹیک سنگھ کوئی اور نہیں تھا خود منٹو تھا۔''

''یہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔ اب یہ بتائیں پاکستان میں ان سے اس طرح کے سلوک کے ذمہ دار کون تھے؟''

''صفیہ منٹو نے جو کچھ برداشت کیا ہے، وہ میرا ہی دل جانتا ہے۔ تین بیٹیوں کو سینے سے لگائے لکشمی مینشن کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں پرورش کرنا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا منٹو صاحب کی شراب کے خرچے کو سنبھالنا اہم تھا۔ بمبئی میں تو یہ سارا بکھیڑا تھا ہی نہیں ـــــ کہ سیٹھ لوگ منٹو صاحب کے سارے ناز نخرے اٹھا رہے تھے۔ مگر وہاں کے رائٹرز کو منٹو صاحب سے خطرہ تھا اس لئے دھکا دے دیا۔ اب جو یہاں آئے تو ترقی پسندوں اور رجعت پسندوں دونوں نے گٹھ جوڑ کرلیا اور دونوں نے ہاتھ ملا لئے منٹو کے خلاف ـــــ''

''وہ کیسے؟'' میں حیرت میں آ گئی۔

''وہ ایسے کہ منٹو صاحب کے لاہور میں آتے ہی ترقی پسندوں اور رجعت پسندوں نے ان پر روزگار کے دروازے بند کر دیئے۔ ریڈیو پاکستان لاہور واحد ادارہ تھا جس نے ادیبوں شاعروں کو روزگار دینے کا فیصلہ کیا۔ اور فلم کا میڈیم تھا جہاں لکھ کر کمانے کی گنجائش تھی اور پھر تیسرا ادارہ اخبار اور ادبی رسائل تھے جہاں سے ایک کہانی کا دس روپے سے پندرہ روپے معاوضہ ملتا تھا ـــــ منٹو صاحب نے لکھا ہے ان کا یومیہ پینتیس روپے کا خرچہ تھا، جس کے لئے انہیں دو افسانے روزانہ لکھنے ہوتے تھے۔ ان افسانوں میں ٹوبہ ٹیک سنگھ، کھول دو، ٹھنڈا گوشت اور ٹیٹوال کا کتا کے علاوہ گورمکھ سنگھ کی وصیت، شہید ساز، ہتک اور معلوم نہیں کتنے افسانے شامل ہیں۔ صبح بیٹھ جاتے تھے، چائے اور سگریٹ کے ساتھ۔ میں کڑھتی رہتی تھی کہ رات کو کسی گھٹیا شراب کا ٹھرّا پی کے آئے تھے اور سو گئے۔ سر میں شدید درد ہوگا پھر بھی افسانے کی مشقت پر بیٹھ گئے ہیں۔ انصاف کروائے کہانی لکھنے والی خاتون کہ کتنا بڑا جگر تھا میرا ـــــ صفیہ منٹو کا۔''

میں صفیہ منٹو کا درد محسوس کر رہی تھی۔ میں نے انہیں بولنے دیا۔

''سنو وہ صبح کہانیاں لے کر نکلتے تھے۔ عزت دار تھے۔ سالم تانگہ لے کر جاتے تھے اور پہلے ایک اخبار، پھر دوسرا رسالے کا دفتر ـــــ ایسے وہ کہانیاں بانٹتے تھے اور پھر ہوتا کیا تھا۔ کمزور دل اخبار وہ کہانی واپس

کر دیتے تھے۔ وہ کہانی اب کسی اور جگہ لے جاتے تھے۔ منٹو صاحب ایسے افسانہ نگار تھے جو پھیری لگا کر افسانے بیچتے تھے کہ ان کے گھر کا خرچہ چل جائے۔ کیا پورے ہندوستان نے افسانوں کی پھیری لگائی ہے۔ افسانہ لے لو ــــ افسانہ لے لو ــــ ''کھول دو'' لے لو۔ ''کھول دو'' تازہ افسانہ ہے۔ بھائی جان لے لو۔ ن۔م راشد نے نظم لکھی تھی، خواب لے لو خواب۔ منٹو نے آواز لگائی۔ افسانہ لے لو، افسانہ لے لو۔ پندرہ روپے پندرہ روپے، بھاؤ تاؤ کرنا ہے کر لو۔ ''ادبِ لطیف'' والو۔ ''ادبی دنیا'' والو۔ ''نقوش'' والو۔ لے لو لٹا دیا ہے۔ صرف پندرہ روپے پندرہ روپے پندرہ روپے۔ کیا کسی ترقی پسند یا کسی رجعت پسند لاہوری ادیب کو شرم آئی کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کس نے ریڈیو پاکستان لاہور کے دروازے منٹو کے لئے کھولے جو آل انڈیا ریڈیو اور بمبئی میں سکرپٹ لکھنے کا سب سے زیادہ تجربہ رکھتے تھے۔ رہ گئی آپ کی لاہور کی فلم نگری تو ان جاہلوں کو منٹو کی میم کا پتہ نہیں تھا۔ صرف ایک دوست تھا منٹو صاحب کا لاہور میں، احمد ندیم قاسمی۔ اُسے بھی منٹو سے شراب کی بو آتی تھی، کیا نبھاتا دوستی۔ لے دے کے شادامرتسری جیسے ٹھرے باز شاعروں کے ہاتھ منٹو نے لگنا ہی تھا۔ رہی سہی کسر ان کے چھ افسانوں پر مقدموں نے پوری کر دی۔ آج آپ ایمان سے کہیں، کس میں کتنی فحاشی تھی؟ اُس کے بعد تو آپ کا معاشرہ جس اخلاقی دلدل میں پھنستا گیا، اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ مجھے بتاؤ ''کالی شلوار'' میں ہے کیا؟ مولویوں کو کالی شلوار کے نام سے کیا شہوت آتی تھی؟ بولو ناں ــــ ایک معمولی سے غریب شیعہ طوائف کو محرم پر کالی شلوار کی ضرورت ہے کیونکہ کالی قمیص اس کے پاس تھی۔ اتنی سی بات کو عدالت لے گئے۔ ''ٹھنڈا گوشت'' پڑھ کے اگر آپ کے اندر جوانی سر اٹھاتی ہے اور آپ کے اندر جنسی ہیجان پیدا ہوتا ہے تو اپنا علاج کرائیں۔ لعنت ہے مقدمے بازوں پہ ــــ اور تو اور ایک بڑے شاعر نے بھی اپنی ترقی پسندی کا بدلہ عدالت میں آ کر لینا تھا۔ فرماتے ہیں ''کھول دو'' فنی اعتبار سے کمزور افسانہ ہے۔ ویسے اس میں فحش نام کی کوئی شے نہیں ہے۔'' صفیہ منٹو دل کا غبار نکال رہی تھیں۔ میں خاموشی سے سن رہی تھی۔

''جس طرح پاکستان کے ادیبوں، شاعروں نے ساحر لدھیانوی کو بھگایا اور قرۃ العین حیدر کو ملک چھوڑنے پر مجبور کیا، ایسے ہی وہ منٹو کو بھی یہاں سے بھگانا چاہتے تھے مگر وہ بھاگ کے کہاں جاتا ــــ یہاں کے ادیب اُسے دیکھ کر پاک ٹی ہاؤس کے باتھ روم میں چھپ جاتے تھے کہ قرض نہ مانگ لے۔ وہ مال روڈ سے کچہری روڈ تک بھاگتا بھاگتا گر گیا۔ خون تھوک دیا اور سب ادیبوں کے سینے میں ٹھنڈ پڑ گئی۔ اور اچانک منٹو صاحب مہان ہو گئے، بڑے افسانہ نگار ہو گئے ــــ''

میں سوچنے لگی کہ لاہور کے ادیب چاہے ترقی پسند تھے یا رجعت پسند سب کے سب منٹو سے خوفزدہ ہو گئے تھے اور منٹو کو معاشی طور پر بچانے کے لئے کوئی بھی تیار نہ تھا۔ یہاں تک کہ ''سویرا'' کے مالک چوہدری نذیر احمد جب منٹو کے افسانے کا معاوضہ پندرہ روپے دیتے تھے تو ساتھ میں اپنے بیٹے کو بھیجتے تھے کہ جاؤ چاچا سے سموسے جلیبی لے کر آؤ ــــ میں ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ صفیہ منٹو کب کی جا چکی تھیں۔ اب میرے سامنے ایک اور صفیہ بیٹھی تھیں۔ جاں نثار اختر کی بیگم جن کے خطوط کے مجموعوں نے اردو دنیا میں بے شمار لہریں پیدا کی تھیں۔ اب ایک اور صفیہ سے بات کرنا اس لئے ضروری تھا کہ دونوں دو مختلف رویوں کی نمایندگی کر رہی تھیں۔ میرے لئے تو یہ ایک اور حقیقت کا سامنا تھا۔ جو میں کرنا چاہتی تھی۔ میں نے کہا۔ ''صفیہ مجھے تم سے تو بہت گلہ ہے۔ تم نے ''زیرِلب'' کیوں اپنی بات کی۔ آج کی عورت ''زیرِلب'' بات نہیں کر رہی ہے۔ اُسے تو زبان مل چکی ہے۔ یہ کیا زمانہ تھا جب آپ کی زبان، گروی رکھی گئی؟''

''میں اس لئے آئی ہوں کہ اپنے شوہر جاں نثار اختر اور اپنے بھائی اسرار الحق مجاز کا دفاع کر سکوں۔''

''نہیں کر سکو گی۔ دونوں شدید قسم کی مردانہ خود پرستی اور شاعرانہ جلال میں دبے ہوئے تھے۔''

''بات یہ نہیں ہے۔ تم تو آج کی لبرل عورت ہو ناں۔ تم اُس زمانے کو کیا جانو؟ ــــ''

''جانتی ہوں۔ سب مردوں کے افسانوں میں عورت کا کردار دیکھا ہے۔''

''لیکن جو میں بتاؤں گی، وہ میری واردات ہے۔ سننا ہوگا۔''

''میں سن رہی ہوں اور آپ کی طرف سے مجھے یہ بات معلوم کرنی ہے۔''

''اُس زمانے کے ترقی پسند ادیبوں کے اندر بھی ایک مردانہ شاونزم اندر خانے گوٹ گوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ اپنی محبوبہ کے لئے تو ہر طرح کی آزادی کے ترانے لکھ سکتے تھے، بیویوں کے لئے ان کے پاس ڈپٹی نذیر احمد اور راشد الخیری کے تصورات تھے، جو ''بیوہ کے آنسو'' اور ''بیوی کی بپتا'' کے گرد گھوم رہے تھے۔ اور بظاہر ترقی پسندوں نے عورت کے لئے تجویز کیا کہ وہ دوپٹے کو پرچم بنا لے۔ یہاں بھی ان کا مقصد عورت کی قربانی ہے کہ وہ آگے بڑھ کے قربانی دے۔ سب ترقی پسندوں نے عورت کو محبوبہ کے روپ میں دیکھا۔ بہت کم نے ماں بیٹی اور بیوی کے روپ میں دیکھا۔ جنہوں نے دیکھا وہ کمزور مریل شاعر تھے کسی نے ان کی بات نہیں سنی۔ فیض بھی محبوبہ کے گیسو سنوارتے رہے۔ اس زمانے کا ہر شاعر محبوبہ سے قربانی بھی مانگ رہا تھا

اور اُس کے اندر ایک پتی ورتا اور وفا کی دیوی کا امیج دیکھ رہا تھا۔ جس کی آنکھوں میں آنسو ہوں، بال بکھرے ہوں اور وہ اندر ہی اندر گھل گھل کے اپنے محبوب کے قدموں میں نچھاور ہونے کے لئے پیدا ہوئی ہو۔ اسی امیج کو اُس دور کے مصوروں نے بھی اپنایا اور ہر طرف خوبصورت عورت کے گالوں پر آنسو اور بال بکھرے ہوئے حسن کی علامت بن گئے تھے۔ اور رہی سہی کسر انڈین فلموں نے پوری کر دی تھی۔ ہر فلم کی ہیروئن پر ظلم کے پہاڑ توڑے جاتے تھے تو فلم سپر ہٹ ہو جاتی تھی۔ ایسی عورت فلموں میں اداس گیتوں کی بھرمار میں رول ماڈل بنائی گئی جو فلمیں دیکھنے والی نوجوان لڑکیوں کو آنسوؤں کے سیلاب میں ڈبو دے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب میرے جیسی لڑکیاں سکول اور کالج میں گئیں تو ہم سب نے طے کر لیا کہ ہو نہ ہو ہم نے ظلم کو خود دعوت دینی ہے اور ظلم کے بغیر ہمارے اندر کی عورت کی تسکین نہیں ہو سکتی۔ ایسا مردوں نے اور مرد رائٹرز نے اس لئے کیا کہ وہ خود کو ہیرو بنا سکیں اور ہمیں پوجا کرنے والی دیوداسیاں بنا لیں ــــــ''

''یہ میں سمجھتی ہوں اور اُس دور کا مقبول امیج عورت کے حوالے سے یہی تھا کہ عورت وہ جو مرد پہ قربان ہو جائے۔ گھر پہ قربان ہو جائے۔ ماں باپ پہ قربان ہو جائے۔''

''صرف یہی نہیں ہے۔ اُس زمانے کی عورت چاہے عصمت چغتائی کی عورت ہو، قرۃ العین حیدر کی عورت ہو یا خدیجہ مستور وغیرہ کی عورت ہو، سب کا انجام وہی تھا جو اُس زمانے کا عام پاپولر چلن تھا کہ عورت کے آنسو ہی اُس کی پہچان ہیں۔ چاہے ''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو'' میں ہوں یا ''آنگن'' میں ہوں ــــــ''

''لیکن یہ تو بتائیں صفیہ جاں نثار اختر کہ۔۔۔۔۔''

''میں صفیہ ہی ہوں۔ میں خود کو صفیہ کہلانا پسند کرتی ہوں۔''

''لیکن آپ جیسی اس وقت کی علی گڑھ کالج کی طالبات اور لکھنؤ کے کالجوں کی طالبات جو مسلمان یا ہندو تھیں، سب کی سب اُس زمانے کے شاعروں پر کیوں قربان ہو گئی تھیں۔ جبکہ شاعروں نے تو کبھی گھر نہیں بسائے۔ شاعروں کا امیج تو بس آوارگی سے آگے نہیں بڑھا تھا۔''

''مجھے پتہ تھا تم یہ سوال کرو گی۔ تو سنو۔ ایک تو میں کہہ چکی ہوں کہ ہر لڑکی کو مرنے کا شوق تھا کہ ان کی زندگی کا کوئی مقصد گھر کی چار دیواری میں نہیں تھا۔ مقصد اگر تھا تو کسی شاعر یا کسی فن کار پر قربان ہونے کا تھا۔ اور اسی کو دنیا پسند کرتی تھی۔ ہر لڑکی چاہے ہندو ہو یا مسلمان ہو دیوداسی بننے اور ستی ہونے کی خود رحمی میں مبتلا تھی اور سمجھتی تھی دنیا اُس کی اس طرح کی قربانی سے عورت کے عظیم ہونے کے تصور کو صدیوں تک سینے سے

لگائے بیٹھی رہے گی۔ میرے بھائی مجاز کے لئے لڑکیاں جو میرے ساتھ پڑھتی تھیں گھنٹوں نوٹ بکیں لے کر انتظار کرتی رہتی تھیں۔ ساحر لدھیانوی کے لئے اُس کی کتابوں میں پھول رکھ کر تصور میں اُس سے باتیں کرتی تھیں۔ اختر شیرانی کے لئے دیوانی ہوئی پھرتی تھیں۔ اب ان تینوں کی حقیقت کیا تھی، سننا ہے تو سن لو۔

مجاز میرا بھائی دن رات گھٹیا شراب پی کر راستوں میں موتتا رہتا تھا۔ کئی بار محفلوں میں پیشاب خطا ہوگیا۔ یہی حال جوش ملیح آبادی کا تھا۔ جن کا پیشاب پہ قابو نہ ہو وہ بھلا اپنی ہوس کو کیسے سنبھالتے۔ اختر شیرانی کو تو باپ نے گھر سے نکال دیا۔ شراب کی بوتل لے کر رائل پارک لاہور کے ایک کمرے میں رہنے لگے۔ احمد ندیم قاسمی کو بہت شوق تھا لڑکیوں کو بہنیں بنانے کا اور شرابیوں کو گناہ سے بچانے کا۔ سو وہ اختر شیرانی کے گلے میں لقمے ڈالتے رہے اور شراب کی بو سے ناک پر رومال رکھتے رہے۔ اب رہ گیا آپ کا ساحر لدھیانوی تو اتنی جرأت نہ ہو سکی کہ امرتا پریتم کو ہاتھ سے پکڑتا اور سیدھا لے جاتا کسی آشرم میں اور کسی بھی طرح کا نکاح پڑھا لیتا۔ اور اے حمید نے تو اس کی محبت کا ایک قصہ بھی لکھ دیا تھا جب لاہور میں وہ رہ رہا تھا اور کسی کالج کی لڑکی اس کی شاعری پر عاشق ہوگئی تھی اور پھر اس نے ساحر سے ملنے کا کہا۔ ساحر غریب کو آپ کے اداکار سلمان شاہد کے والد سلیم شاہد نے اپنے کمرے کی چابی دے دی جس میں وہ رہتا تھا کہ تم اُس لڑکی سے اس کمرے میں ڈیٹ مارلو ـــــ اب ڈیٹ کا حال ساحر کی مردانگی پر بٹا لگانے کے لئے کافی ہے۔ وہ لڑکی آئی۔ ساحر اس انتظار میں کہ وہ محبت میں دیوانہ وار اُس سے لپٹ جائے گی اور چومنا شروع کردے گی۔ ایسا نہ ہوا۔ وہ بیٹھی اور ادھر اُدھر کی تعریفی باتوں کے بعد ایک طرح مصرع نکالا اور کہا اس پر کالج میں غزل پڑھنی ہے، لکھ کر دیں۔ ساحر نے پوچھا کچھ لوگی؟ اُس نے کہا۔ ہاں کھانے کا وقت ہے کھانا کھاتے ہیں۔ ساحر نے اُسی ہوٹل سے کھانا منگایا۔ اس لڑکی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ دیکھا کھانے پر جت گئی۔ ساحر حیران کہ وہ محبت سے گوندھا بیٹھا تھا۔ اب لڑکی تو بوٹیوں سے جھوجھ رہی تھی۔ خلال بھی ساتھ ہی کر رہی تھی۔ انتہائی رومانوی شاعر کا سارا رومان فارغ ہو گیا اور وہ اس طرح مصرع پر غزل لکھنے میں مصروف ہوگیا۔ دیکھا تو وہ بستر پر لیٹ کر خراٹے لے رہی تھی۔"

"ہاں یہ واقعہ میں نے بھی پڑھا ہے۔"

"تو پھر آپ کیا مجھ سے پوچھتی ہیں کہ جاں نثار اختر کون تھا؟ ان سب سے الگ تو نہیں تھا۔ میرے خطوط اُس کے لئے نہیں تھے۔ سن لو بی بی ـــــ وہ ایک اُس زمانے کی بزعم خود خود رحمی میں مبتلا ہیروئن کی خود کلامی تھی۔ جسے ہندی فلموں نے بارہا اُجاگر کیا اور پروموٹ بھی کیا۔ میں خطوط میں صرف اپنے آپ سے یا

اپنے بیٹے جاوید سے باتیں کر رہی ہوتی تھی۔ ایک سکول ٹیچر جو گھر سے کمانے نکلی ہو وہ شوہر کی شہرت کی صرف عزت رکھ رہی تھی اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اس لئے میرے خطوط میں جاں نثار اختر وہ نہیں جو تھا۔ وہ ہے جو میرے تصور میں تھا یا جسے ایسا ہونا چاہئے تھا۔''

میں اب بات سمجھ چکی تھی۔ میں نے صرف اتنا کہا اور جاوید اختر کو ایک اداس بچپن اور اداس لڑکپن ملا۔ اسی لئے وہ باپ کی کمی ساحر لدھیانوی کی گود میں پوری کرنے لگا۔ خودکشی سے اُسے ساحر نے بچایا____

اب جو میں دیکھتی ہوں تو صفیہ وہاں نہیں تھی____ سب میرے پاس کیوں آ رہی تھیں____ یہ میرا خیال تھا یا میری خود کلامی کہ میں ان عورتوں کے ساتھ ایک زمانے سے رہ رہی تھی۔ اور لگتا تھا وہ میری دوست بن چکی ہیں۔ میں اور آنس کئی قرضوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ میرا یہ عمل خود اختیاری تھا جبکہ آنس کا یہ عمل بغیر کسی اختیار کے تھا____ اب میں نے کچھ دن خود کو لکھنے میں مصروف کیا۔ اور میں نے دیکھا کہ آنس رات کو اپنے دو تین ڈرنک لینے کے بعد کچھ کھا کر وہیں سو جاتے ہیں۔ بمشکل دو گھنٹے کی نیند لے کر جاگ جاتے ہیں اور پوری رات وہ جاگتے ہیں۔ ایسے میں مجھے اُن کے لئے کچھ تو کرنا تھا۔ مثلاً ٹیلی وژن پر بے شمار ایک ہزار سے زیادہ چینل تھے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ جب ہسٹری چینل پر آتے تو پھر تاریخ انہیں پکارتی تھی۔ جب وہ نیشنل جیوگرافک پر آتے تو کوئی اور کردار سامنے آ جاتا تھا____ میرے لئے مشکل تھی کہ آنس خود کو کس زمانے میں لے جاتے ہیں اور کیا کردار سامنے آتا ہے۔ اب جو میں نے اگلے دن صبح دیکھا کہ لائبریری میں بیٹھے ہیں۔ گھر کی لائبریری بہت بڑی تھی اور اُس میں ہمارے شغف کے بھی مضامین کی سینکڑوں کتابیں تھیں۔ میں اس لائبریری سے ڈرتی تھی کہ آنس اگر اس لائبریری میں آ گئے تو یہ کسی بھی زمانے کسی بھی کردار کسی بھی ملک کسی بھی شہر میں پہنچ جائیں گے اور معلوم نہیں وہ کس سے کیا باتیں کریں گے۔

اچانک مجھے آواز آئی۔ ''دیکھو کون آیا ہے؟ بھئی کوئی چائے پانی____ کوئی ہے۔''

اب مجھے اس طرح کی آواز پہلی بار آئی تھی۔ میں خود بھی اپنے دماغ میں نہیں ہوتی تھی تو ایسے میں اور بھی خلل ہو جاتا تھا۔ میں دوڑی بھاگی گئی تو دیکھا اکیلے کھڑے ہیں اور چلا رہے ہیں۔ ''دیکھو کون آیا ہے؟''

''مگر مجھے تو کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا۔''

''حبیب جالب ہے۔ یہ انڈر گراؤنڈ رہتا ہے۔ یہ کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔''

اب میں سمجھ گئی کہ لائبریری نے کوئی گُل کھلا دیا ہے۔ وہاں حبیب جالب کی آپ بیتی اور اُن پر کچھ کتابیں رکھی تھیں۔ میں نے کہا۔" اسے چائے کی ضرورت نہیں ہوتی ـــــ شراب کے لئے آیا ہے تو میں دیکھتی ہوں۔"

میں پلٹ گئی۔ آنس کی الماری دیکھی اس میں ہر طرح کی بوتلیں رکھی تھیں۔ کسی میں دُردِتہِ جام دکھائی دی۔ کسی میں ڈیڑھ پیگ۔ کسی میں آدھا گلاس۔ کسی میں پوّا۔ کسی میں نصف شب کا ماَل۔ کسی میں پورے سفر کا حوصلہ۔ یہ سب نام ہم نے ان ادھوری بوتلوں کو دے رکھے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ حبیب جالب بہت کائیاں آدمی ہے۔ ادھر اُترا ہے تو مہنگی اور ولایتی شراب اُس کی منزل ہے۔ وگرنہ ٹھرّا تو اُسے کسی بھی کن ٹٹے شاعر کی دہلیز پر مل سکتا تھا۔ جالب ظاہر یہ کرتا تھا کہ وہ امراء اور اشرافیہ کو جوتے کی نوک پر رکھتا ہے لیکن جب اُسے کسی انسان دوست وڈیرے سندھی کے ہاں سکاچ یا بلیک لیبل کی امید ہوتی تھی اور راتوں کا ٹھکانہ بھی دستیاب ہوتا تھا تو وہ فیض احمد فیض کو بھی کاٹ کے اپنی جگہ بنا لیتا تھا اور پھر جب فیض صاحب راہ سے ہٹ گئے تو جالب صاحب کو حسنِ طلب کے سارے سلیقے آتے تھے۔ ہاں اگر حسن طلب کا وار خالی جا رہا ہوتا تھا تو پھر وہ یکدل پوچھل پر کھڑے ہو جاتے تھے اور اپنے انقلابی فلسفے کی ایسی تے کرتے تھے کہ اُس وڈیرے کو دامن بچانا مشکل ہو جاتا تھا۔ اور پھر وہ وڈیرا نوکروں سے کہتا تھا اسے بوتل دے کر کمرے میں لاک کر دیں۔ اب فیض صاحب جیسا حوصلہ تو جالب میں کہاں تھا۔ بہر حال جالب آ چکے تھے تو میں نے ایک بوتل جو قیمتی اور ولایتی تھی نکالی اور لوازمات کے ساتھ رکھوا دی۔ میں سامنے نہیں گئی۔ اب آنس کا امتحان تھا۔ دونوں ٹیڑھے آدمی اب کیا ایک دوسرے کا حال کریں گے، خدا معلوم۔

میں چلی گئی اور جب اپنے کمرے میں آئی تو مجھے محسوس ہوا کسی نے مجھے گلے سے لگایا ہے۔ دیکھا تو اپنی فہمیدہ ریاض ہیں ـــــ اب ایک طرف ایک آگ اور دوسری طرف پانی نہیں بلکہ دوسری آگ تو میں تو میزبان ٹھہری۔ سو میری بن آئی ـــــ میں فہمیدہ ریاض کو بھگت رہی تھی۔ جو کہہ رہی تھی کہ جو دکھ میں نے اُٹھائے ہیں وہ تو کسی نے سوچا بھی نہیں ہے۔

"آپ کے دکھ میں سب سے بڑا حصہ تو آپ کے خاوند ظفر اُجن کا ہے۔ جس نے آپ سے شادی تو کر لی پھر آپ کے ٹکڑوں پر پلنے لگا۔ اس کا سیاسی کیریئر کہاں گیا؟ کوئی کھدر کا کرتا پہن کر پاجامہ پہن کر سوتی بستہ لٹکا کر آ جائے تو کیا آپ اُس کو اپنی زندگی اور اپنا جسم دے دیں گے۔"

''ہاں دینا پڑتا ہے۔تم یہ سب نہیں جان سکتی۔ جب ایک قول نبھانا ہوتو پھر زندگی تو دینی ہوتی ہے۔''

''بھاڑ میں گیا قول۔تم تو جذباتی زبان بول رہی ہو۔''

''لعنت بھیجتی ہوں جذبات پر۔''

''ہاں بی بی، لعنت تو تم بھیج دوگی مگر یار اب جو جو کیا ہے تو سننے کا حوصلہ بھی رکھو۔آدھی مار تم نے رزق کمانے میں اٹھائی اور آدھی مار تم نے خاوند کو سنبھالنے میں جھیلی۔یہ تم جیسی انقلابی لڑکیوں نے بہت سے دکھ خود ہی اپنی جھولیوں میں ڈالے ہیں۔نسرین انجم بھٹی نے بھی جو کمایا خاوند کو کھلایا۔زاہدہ حنا نے بھی جو محنت کی اپنے خاوند کو سنبھالنے میں کی۔وہ پھر بھی نہ سنبھلا___ تم سب جاں نثار اختر کی صفیائیں ہو___ اور جو گل سارا شگفتہ نے کھلائے اُس کی قیمت بھی خود ہی ادا کی___''

''جس مردانہ معاشرے کے خلاف ہم نے جدوجہد کی۔اس میں مردوں نے ہی ہمیں ڈسنا تھا۔''

''مگر میری جان آپ لوگوں کو سانپ سے ڈسوانے کا مزہ آنے لگتا ہے۔عادت پڑ جاتی ہے مردوں پہ رحم کھانے کی۔یہ نہیں سوچتیں کہ معاشرہ تم پر ترس نہیں کھائے گا۔''

فہمیدہ ریاض نے یہ سب سنا اور کہا۔''بی بی ہم لکھنے والیوں نے ایسا کیا۔یہ اثاثہ انہی مردوں کے ظلم کی دین ہے۔ورنہ ہم یہ سارا دردلکھ نہ پاتیں___ اب کچھ پلانا ہے تو پلاؤ ایسے تمہارے گھر سے جانے والی نہیں۔''

میں نے اُس کے لئے اُس کی پسند کی وہسکی لاکر رکھ دی۔جو اُس نے بغیر پانی کے لے لی۔مجھے پتہ تھا وہ اسی طرح پسند کرتی ہے۔میں نے فہمیدہ کی اپنے بیٹے کے لئے لکھی ہوئی شاعری پڑھی تھی۔اب حوصلہ نہیں تھا اُسے یاد دلاؤں کہ کن حالات میں اس کا کم سن بیٹا امریکہ میں ایک تالاب میں ڈوب کے اُسے سمندروں کا کھارا پانی آنکھوں میں دے گیا___ اب جو دیکھتی ہوں تو وہاں کوئی نہیں تھا۔خالی گلاس رکھا تھا۔ میں اُسے بتانا چاہتی تھی کہ میں اُس کے آخری دیدار کے لئے لاہور کے کینٹ میں واقع آرمی کے اُن فلیٹس میں سے ایک فلیٹ کی تلاش کر کے صبح سویرے پہنچی جو آرمی نے اپنے جونیئر افسروں کے خاندانوں کے لئے بنائے ہوئے تھے۔یہ نومبر کی ایک صبح تھی۔کئی طرح کے ناکوں سے گذر کر پوچھتے پاچھتے جب میں اُس دوسری منزل پر واقع فلیٹ کے دروازے پر پہنچی تو اندر باہر مکمل خاموشی تھی۔لگتا نہیں تھا اندر فلیٹ میں برصغیر کی ایک

بڑی خاتون شاعرہ، نثر نگار اور فکشن رائٹر کے ساتھ کئی زبانوں کی عالم اور انسانی حقوق کے لیئے لڑنے والی آواز خاموشی کی چادر اوڑھ کے ایک کمرے میں سو رہی ہو گی۔ میں نے بیل دی۔ کوئی نہیں آیا۔ میں نے پھر بیل دی۔ پھر دروازہ کھلا۔ بے اعتنائی کے ساتھ کسی نے پوچھا۔ ''کون؟'' تو میں بولی۔ ''فہمیدہ ریاض کو دیکھنا ہے۔'' اندر سے اُس نے کسی اور کو آواز دی۔ فہمیدہ کے کفن دفن کے لیئے شاید کوئی فون پر بات کر رہا تھا۔ میں پھر ٹھہری رہی تو ایک لڑکی آئی۔ جو میرا خیال تھا فہمیدہ کی ڈاکٹر بیٹی تھی۔ جس کے نام یہ فلیٹ الاٹ ہوا تھا اور فہمیدہ نے آخری سانس بیٹی کے پاس لیا تھا۔ اُس کو میں نے بتایا میں کون ہوں۔ اُس نے نہیں پہچانا اور کہا۔ ''وہ سامنے کمرے میں فہمیدہ ریاض لیٹی ہوئی ہیں۔ دیکھنا ہے دیکھ لو۔'' میں اندر گئی اور پلنگ کی پائنتی پر کھڑی رہی۔ ہمت نہیں تھی کہ اُس کے چہرے کو قریب سے دیکھ سکوں۔ بس پائنتی سے اُس کو الوداع کہہ کر باہر آ گئی۔ وہ جا چکی تھی۔

اب میں نے سوچا کہ آنس اور حبیب جالب کس حال میں ہوں گے تو میں وہاں گئی۔ دروازے سے باہر رکی۔ سنا اندر کیا ہو رہا ہے۔ میں نے اندر کچھ نہیں دیکھا بس سنا۔ حبیب جالب بول رہے تھے۔

''تم تاریخ دان کیا ہوتے ہو؟ بس ایک اُگال دان، جس میں زمانہ پان تھوک کے نکل جاتا ہے۔ تمہاری شراب میں نے پی لی لیکن تم دو نمبر انسان ہو۔ اپنے آپ کو ٹائن بی سمجھتے ہو۔ کیا ہو تم؟''

''میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ مگر جالب تم پوچھل پر کھڑے ہو گئے ہو۔''

''اوئے تم شراب کی وجہ سے لاہور میں مشہور ہو ورنہ تمہاری اوقات ہے کہ میں یہاں آ کر اتنا وقت ضائع کروں۔''

''جالب تم نے میری تین ہزار کی وہسکی ضائع کر دی ہے۔''

''تو کیا تم احسان جتا رہے ہو اور مجھے تم طعنہ دے رہے ہو۔ ایک اتنے بڑے انقلابی شاعر کو؟''

''ہاں اے انقلابی شاعر تم نے کبھی گھر میں جھانک کے دیکھا ہے۔ ایک بیوی اور چھ بچے تمہاری راہ دیکھتے ہیں اور تم سرِ شام شراب نوشی کے الزام میں پکڑے جاتے ہو۔ تمہارے بچوں میں سے کس کس نے سکول کا منہ دیکھا ہے اور تمہیں چھڑانے کے لیئے کبھی کشور ناہید کبھی اعتزاز احسن، کبھی عابد حسن منٹو کبھی شاہد سلیم اور کبھی میں ــــــ خیر چھوڑو۔''

''اوئے ہم جیسے انسانیت کے شاعروں کو یہ قربانیاں دینی ہوتی ہیں۔ انقلابی کو پہلے اپنے بچوں

کی اپنے گھر کی قربانی دینی ہوتی ہے۔ اس پر طعنہ دینے کے بجائے سمجھو میں نے سچ بولنے کی کتنی بھاری قیمت ادا کی۔''

''نہیں یہ تم نے شراب پینے کی قیمت ادا کی ہے۔ ورنہ فیض کی دونوں بیٹیاں آج دنیا کی بڑی خواتین میں شامل نہ ہوتیں۔''

''اوئے فیض کا نام مت لو۔ وہ سمجھوتے کرتا تھا۔ تالپوروں کا سندھ میں مہمان، ممدوٹوں کا پنجاب میں مہمان، بگٹی کا بلوچستان میں مہمان۔ وہ وڈیروں سے دوستی کرتا تھا اور شاعری عوام کے لئے کرتا تھا۔ وہ عوام جو خواص ہوتے تھے۔''

''جالب تم نے کوئی قربانی نہیں دی۔ قربانی تمہاری اولاد دے گی تمہارے مرنے کے بعد۔''

''اوئے بھاشن مت دو۔ میرا گلاس خالی ہے۔''

یہ ساری باتیں میں نے پہلے بھی سنی تھیں۔ لگتا تھا کوئی زمانہ دوبارہ اس کمرے میں آ گیا ہے۔ ایسا ہی تھا کہ آنس اُس زمانے میں چلے گئے تھے جیسے میں پچھلے کسی زمانے میں چلی گئی تھی۔ ہم دونوں کے ساتھ ایسا ہو رہا تھا۔ شاید ہم اس کی لذت لینے لگے تھے۔ ہم اپنے ماضی کے زمانوں میں اس لئے جا رہے تھے کہ ہمارے اپنے پاس کچھ نہیں تھا۔ جیسے کوئی اجڑا ہوا سیٹھ یا جاگیر دار اپنے اثاثے کو خرچ کرتا ہے۔ ایسے ہی ہم اپنے ماضی کے اثاثے کو بے دریغ خرچ کر رہے تھے۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ آنس اکیلے بیٹھے تھے۔ وہ سب خود کلامی تھی یا ذہن میں لگی ہوئی وہ ٹیپ تھی جو چل رہی تھی ــــــ

اب ایسے ہی ایک دن میں کسی کتاب کی تلاش میں آنس کی سٹڈی میں گھس گئی۔ سٹڈی کوئی ایک تو تھی نہیں پورا گھر لائبریری میں بدل چکا تھا۔ اوپر نیچے، ہر کمرے میں کتابوں کے ڈھیر ــــ ہر طرح کی کتاب۔ فلسفہ، تاریخ، بائیوگرافی، ناول، شاعری، نفسیات، سیاست، مذہب وغیرہ کے ساتھ دنیا بھر کے تراجم اور معلوم نہیں کیا کیا الم غلم جو ڈاک سے انہیں ملتا تھا۔ جس میں ''خودکشی کے سنہرے اصول''، ''موت کے بعد کا منظر'' اور ''والدین کے حقوق'' وغیرہ پر کئی طرح کے پمفلٹ بھی شامل ہوتے تھے۔ اب مجھے خیال آیا کہ گھر کا کاٹھ کباڑ نکالنا تو میری ذمہ داری ہے۔ سو میں نے کاٹھ کباڑ نکالنا شروع کیا اور دو تین ملازم کمر کس کر آ گئے۔ ایسے میں ایک جگہ ایک ڈائری جس کی جلد کتاب کی طرح تھی میرے ہاتھ آ گئی۔ اب جو کھولا تو وہ آنس کے ہاتھ کی لکھی تحریر تھی اور اُن کی ذاتی ڈائری تھی۔ اُسے کھولا تو وہ جرمنی کے شہر ہائیڈل برگ کے اُن کے قیام کی

تھی۔ جب وہ پوسٹ ڈاکٹریٹ کے لئے وہاں گئے تھے اور وہ علامہ اقبال ایونیو کے کسی اپارٹمنٹ میں ٹھہرے تھے۔ یہ میری شادی سے پہلے کی بات ہے۔ تو میں نے وہ ڈائری لے لی اور اُسے محفوظ کرلیا۔ اب یہاں سے آنس مجھ پر کھلتا ہے۔ شوہر بیوی سے کبھی سچ نہیں بول سکتا کہ یہ اس رشتے کی مجبوری ہے۔ ایسے ہی بیوی بھی شوہر سے سچ بول دے تو رشتہ نہیں چل سکتا۔ اس رشتے کی اس منافقت میں ہی رشتے کی بھلائی ہے۔ تو کیا پوری زندگی میاں بیوی ایک منافقت میں زندہ رہتے ہیں ـــــ یہ ایک حقیقت ہے۔ مگر کیا کریں یہ ہماری سوسائٹی کا سچ ہے ـــــ

اب جو میں نے پڑھنا شروع کیا تو وہ آنس کی بے ساختہ تحریر تھی۔ مجھے فکشن کا مزہ آنے لگا۔ جبکہ وہ فکشن نہیں حقیقت تھی۔ آنس اتنا رومینٹک تھا اور پھر اُس کے ساتھ کیا ہوا؟ یہ ایک سوال ضرور تھا لیکن میں تو اُس کی ڈائری میں گم ہوگئی تھی۔ آپ کو بھی سناتی ہوں۔

''ہائیڈل برگ کی پہلی شام ہے۔ میں اس چھوٹے سے یونیورسٹی ٹاؤن میں پہنچا تو میں نے عجب منظر دیکھا۔ دریائے نیکر کے دونوں طرف سائیکلوں کے قافلے تیزی سے گذر رہے تھے۔ لگتا تھا سائیکلوں کی میراتھن ریس کا وقت ہے۔ جبکہ ایسا نہیں تھا۔ یہ شام کی معمول کی زندگی تھی اور ان سائیکلوں پر یونیورسٹی کے لڑکے لڑکیاں اور اُستاد آ اور جا رہے تھے۔ رنگوں کی ایک کہکشاں اس طرح لہریں لے رہی تھی جیسے کوئی سرریلسٹک پینٹنگ ہو یا کوئی ایسی ہی کہانی ہو۔ میں اپنے اپارٹمنٹ کی طرف جا رہا تھا۔ جو علامہ محمد اقبال ایونیو کی لین میں تھا۔ جب علامہ اقبال یہاں آ کر رہے تھے تو اُن کی ایک نظم بھی اسی دریائے نیکر پر ہے جس کا نام ہے ''دریائے نیکر کے کنارے''۔ خدا گواہ ہے یہ نہ تو دریا ہوسکتا ہے نہ اس میں دریا کی جولانی تھی۔ محض ایک نہر سی تھی۔ جو پتلی سی لکیر میں یونیورسٹی کے درمیان چل رہی تھی۔ ایک طرف یونیورسٹی کا اکیڈیمک بلاک تو دوسری طرف رہائشی بلاک۔ جس میں طلبا و طالبات کے ہوسٹل، اساتذہ کے ہوسٹل اور مہمانوں کے لئے گیسٹ ہاؤسز تھے۔ مجھے ایک سٹوڈیو اپارٹمنٹ مل گیا تھا۔ اگرچہ مجھے بہت سفارش اور محنت کرنی پڑی تھی۔ وہ بھی ایسے ملا کہ ایک پوسٹ ڈاکٹریٹ کے سکالر کو اچانک سب کچھ اس لئے چھوڑ کے جانا پڑا کہ اس کے ملک میں انقلاب آ گیا تھا اور میری لاٹری نکل آئی تھی۔ سو میں براجمان ہوگیا۔ اُس شام یہ میری پہلی خوشی تھی۔ میں نے سٹوڈیو اپارٹمنٹ میں سامان رکھا اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں اپنے کھانے کا انتظام کیسے کروں گا۔ مجھے صرف آملیٹ بنانا آتا تھا اور میں اپنی بہنوں سے کھانے کی ترکیبیں لے کر آیا تھا۔ اب کیا ہونا تھا۔ میں نے سٹوڈیو اپارٹمنٹ

میں اپنا سامان رکھا اور پہلے تو خوش ہوا کہ مجھے سر چھپانے کو ٹھکانہ مل گیا ہے اور جب میں نے اپنے سٹوڈیو اپارٹمنٹ میں قدم رکھا تو مجھے معلوم ہو گیا کہ کچھ بنیادی ضرورت کی چیزوں کے لئے فوراً مجھے یونیورسٹی کی مارکیٹ میں جانا ہوگا۔ اگرچہ یونیورسٹی کے شروع میں ایک پاکستانی یا انڈین ریسٹورنٹ موجود تھا۔ مگر مجھے تو پیسے بھی بچانے تھے اور اپنی صحت بھی۔ میرے اپارٹمنٹ کے آس پاس اور سامنے بھی اسی طرح کے چھوٹے چھوٹے سٹوڈیو اپارٹمنٹ میرے جیسے ریسرچ سکالرز کے لئے تھے اور سب کے سب میں مختلف ملکوں کے سکالرز رہ رہے تھے۔ اُس شام تو میں نے یونیورسٹی کے ماحول اور مارکیٹ کا جائزہ لے کر اندازہ کر لیا کہ مجھے اپنے اپارٹمنٹ میں ہی کھانے پینے کا انتظام رکھنا پڑے گا۔ ہفتے میں ایک دو بار کھانا بنا چھوڑوں گا تو کئی دن گذارا ہوتا رہے گا۔ سو اس مقصد کے لئے ہر شے اُسی شام ہی مارکیٹ سے لے کر آیا۔ اگرچہ اپارٹمنٹ میں کراکری، برتن اور ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔ اس لئے بس ضرورت کی کھانے پینے کی خریداری کر لی اور فریج فریزر میں ڈال دی۔

جرمنی کا معلوم نہیں قومی مشروب ہے یا نہیں۔ مجھے محسوس ہوا بیئر اُن کا قومی مشروب ہو سکتا ہے۔ میں نے بھی بیئر، وائین اور وہسکی لے کر اپنے اپارٹمنٹ میں بار قائم کر دی۔ آنا تو کسی نے نہیں تھا پھر بھی میں تو وہاں رہنے والا تھا۔ لیکن معلوم نہیں تھا جلد یہ اپارٹمنٹ سجنے والا ہے۔ آس پاس کون رہتا تھا؟ ظاہر ہے اتنی جلدی معلوم کیسے ہو سکتا تھا۔ البتہ اُس رات جو کہ پہلی رات تھی مجھے معلوم ہوا کہ یونیورسٹی میں ہر شام رات گئے تک طلبا، طالبات اور اساتذہ سڑکوں پر موج مستی کرتے ہیں۔ سارے ریسٹورنٹ بھرے ہوتے ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کے ہاتھ میں بیئر کی بوتل یا مگ نہ ہو۔ یا کوئی اور ڈرنک نہ پی رہا ہو۔ میں یہ رات دیکھنا چاہتا تھا۔ اور اس کا حصہ بھی بننا چاہتا تھا۔ بس ایسے میں بہت سوں سے ہیلو ہائے بھی ہوئی اور کچھ کے متعلق پتہ بھی چلا کہ میرے آس پاس کے اپارٹمنٹس میں رہتے ہیں۔ میں نے اُس رات دو بجے تک یونیورسٹی کے فٹ پاتھوں، پارکوں، ریستورانوں اور شراب خانوں میں ایسی زندگی دیکھی کہ میں قائل ہو گیا۔ یورپ، امریکہ اور ترقی یافتہ دنیا کیوں ہر شعبے میں دنیا کی رہنمائی کرتی ہے۔ اُس رات کیسے کیسے موضوعات پر بات نہیں ہوئی ہوگی۔

معمول کی زندگی میں محسوس ہی نہ ہوا کہ وقت کیسے گذر رہا ہے۔ ایک رات میں دیر تک لائبریری اور خاص طور پر آرکائیوز میں بیٹھا کام کرتا رہا۔ اور مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ رات کا ایک بج چکا ہے۔ میں اپنے

اپارٹمنٹ کی طرف روانہ ہوا۔ تھکا ہوا تھا سوچا کل جو چکن بنایا تھا، وہ گرم کر کے روٹی فرج سے نکال کر گرم کر لوں گا اور اُس سے پہلے ٹھنڈی بیئر پیوں گا۔ میں جب اپنے اپارٹمنٹ کے دروازے پر آیا تو دیکھا ایک لڑکی جو خوبصورت بھی ہے، گورے ملک کی بھی ہے اور مختصر لباس میں بھی ہے، میرے اپارٹمنٹ میں چابی لگا کر کھولنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اور چابی اُس سے اندر نہیں جا رہی۔ میں پہنچا تو اُس نے کہا۔ آپ میری مدد کریں کہ تالا نہیں کھل رہا۔ پہلے تو آنکھ بھر کے میں نے اُسے دیکھا پھر خوشی ہوئی کہ وہ میری پڑوسی ہے۔ میں نے چابی لی اور کہا۔ آپ کا اپارٹمنٹ اگلا ہے۔ یہ میرا اپارٹمنٹ ہے اور میں نے اُسے اُس کا اپارٹمنٹ کھول کر دیا۔ وہ بہت خوش ہوئی کہ میں جلدی مدد کو پہنچا۔ اس کے اپارٹمنٹ کے اندر جھانکا تو بس بے ترتیبی دکھائی دی اور وہ شکریہ ادا کر کے چلی گئی۔ میں نے سوچا۔ چلو ایک سے تو جان پہچان ہوئی۔ وہ اُس رات شاید بیئر کی جگہ وہسکی پی آئی تھی۔ یہ بھی اچھی بات تھی کہ باذوق لڑکی ہے۔ مجھے اس کے قریب رہنے کی وجہ سے وہسکی کی بو محسوس ہو گئی تھی۔ بس یہ ایک واقعہ تھا گذر گیا۔

چھٹی کے دن میں کھانے بناتا تھا اور مختلف ڈبوں میں دنوں کے حساب سے فریز کر کے رکھ دیتا تھا۔ اب چھٹی کا دن تھا اور میں کھانے بنا کر فارغ ہو چکا تھا۔ میں نے جو کھانے بنائے تھے وہ سب پاکستانی اور دیسی تھے۔ جن میں بریانی، پلاؤ، کڑاہی گوشت، آلو گوشت اور دالیں تھیں۔ ان مصالحوں کی خوشبو سے میرا اپارٹمنٹ تو مہک اٹھتا تھا۔ اور میں اپنی ڈرنک لے کر بیٹھا تھا کہ بیل بجی۔ یہ پہلی بیل تھی جو بجی جب سے میں یہاں آیا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو محسوس ہوا وہی لڑکی ہے جو غلطی سے میرا اپارٹمنٹ اپنا سمجھ بیٹھی تھی۔ اُس نے کہا۔ آپ نے کیا پکایا ہے کہ خوشبو پورے اپارٹمنٹس میں پھیلی ہوئی ہے۔ میں نے دروازہ کھول دیا اور کہا آ کر دیکھ لو۔ وہ آئی اور اُس نے میرے کچن، فرج اور فریزر کا اچھی طرح جائزہ لیا اور میں نے اس دوران اُس کا جائزہ لیا۔ وہ تو بہت خوبصورت تھی۔ اب اُس نے پلیٹ لی اور بریانی ڈال کر کھانے لگی۔ میں نے اُسے ڈرنک آفر کی جو اُس نے لے لی۔ اور جب اُس نے میری بار دیکھی تو اُس نے بریانی کی پلیٹ رکھ دی اور کہنے لگی۔ مجھے اس بار سے کچھ لینا ہے۔ اس نے وہسکی لی اور محفل لگ گئی۔ اور جب مجھے لگا کہ وہ بہت لے چکی ہے تو میں نے بریانی کی پلیٹ اس کے سامنے رکھ دی۔ اُس نے وہ بھی کھا لی اور پھر ایک پیگ بنا لیا اور وہ بھی لے لیا تو اب میرے لئے ایسا کچھ نہیں تھا کہ میں اُسے اپارٹمنٹ سے نکالوں۔ میں نے اُسے کہا کہ اب آپ کو سو جانا چاہئے تو اُس نے کہا کہاں سو جاؤں؟ میں نے کہا میں آپ کو آپ کے اپارٹمنٹ میں لے جاتا ہوں۔ اس

پر اُس نے میرا شکریہ ادا کیا اور میں نے اُسے اُس کے اپارٹمنٹ میں سلا دیا ــــــ اور اپارٹمنٹ کا دروازہ بند کر کے آیا۔ اس سے ایک بات کا پتہ چلا کہ لڑکی یہاں کے اقدار سے وابستہ ہے اور وہ اپنی مرضی کی زندگی گذارنے کا ہنر جانتی ہے۔ باتوں میں اُس نے بتایا کہ اس کا نام سوزین ہے اور وہ آسٹرین ہے۔ جرمنی سے ملحق سرحد کے ساتھ اس کا گاؤں ہے اور وہ یہاں کے قدیم کلچر پر ریسرچ کر رہی ہے۔ اُس نے بتایا اس کی ماں یہودی ہے اور باپ کرسچن اور وہ خود کچھ بھی نہیں ہے۔ کبھی کبھی جب اس کے پاس پیسے نہیں ہوتے تو وہ چرچ چلی جاتی ہے۔ کہیں سے پیسے آجاتے ہیں۔ بس یہ رشتہ اُس کا گاڈ کے ساتھ ہے۔

سوزین کبھی کبھی کئی کئی دن دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اچانک آجاتی تھی اور بتاتی تھی کہ وہ اپنی ریسرچ کے لئے گاؤں گاؤں پھرتی رہتی ہے اور کبھی کبھی آسٹریا چلی جاتی ہے اپنی ماں کو ملنے۔ باپ اور ماں عرصہ ہوا ایک دوسرے سے الگ ہو چکے ہیں۔ ساتھ ساتھ رہتے ہیں مگر کوئی تعلق نہیں۔ گاؤں بھی مختصر گھروں پر مشتمل ہے۔ کوئی کتنا دور رہ سکتا ہے۔

ایک دن وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئی کہ آج بیئر فیسٹیول ہے۔ پورا جرمنی بیئر میں نہا جائے گا۔ ہم نے خوب بیئر اڑائی۔ گلیاں، بازار، ریستوران یوں لگتا تھا بیئر سے ہولی کھیل رہے ہیں۔ پھر وہ مجھے ایک ریستوران میں لنچ کے لئے لے گئی۔ یہ ٹرکش اور لبنانی فوڈ کا ریسٹورنٹ تھا تا کہ میں اپنے پاکستانی کھانوں کی کچھ جھلک یہاں دیکھ سکوں۔ یہ ایک خوبصورت دن تھا۔ اس نے پوچھا میری کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے؟

میں نے بتایا ابھی تو نہیں ہے۔ اس پر وہ مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے پوچھا تمہارا کوئی بوائے فرینڈ ہے؟ تو اس نے کہا۔ ''ایک تھا انڈین نیوڈ پینٹر تھا۔ نیوڈ پورٹریٹ بناتا تھا۔ فرانس سے پڑھ کے آیا تھا۔ یہاں کچھ دیر رُکا۔ اس نے میری نیوڈ بھی بنائی تھی۔ میرے اپارٹمنٹ میں لگی ہے آکر دیکھ لینا۔ اس کا نام ملہوترا تھا۔ پھر وہ انڈیا واپس چلا گیا۔''

میں جب آنس کی ڈائری پڑھتے ہوئے یہاں پہنچی تو حیران رہ گئی کہ یہی ملہوترا ہے جسے میں بنگلور میں مل چکی تھی اور جو اعلیٰ درجے کا نیوڈ پینٹر تھا۔ اور میری نیوڈ بھی بنانا چاہتا تھا۔ میں نے منع کر دیا تھا۔ دنیا کتنی چھوٹی ہے۔ اب مجھے پتہ چلا آنس سوزین کا ذکر بار بار کیوں کرتے ہیں۔ اب میرا تجسس بڑھ گیا۔ میں آگے پڑھنے لگی۔ البتہ یہ بتا دوں میرے اندر روایتی بیویوں والے جذبات نہ تھے نہ کبھی پیدا ہوئے تھے۔ نہ اب یہ

سب پڑھتے ہوئے رقابت کا کوئی احساس موجود تھا۔ میں تو ایک دلچسپ کہانی کے طور پر یہ سب پڑھ رہی تھی۔ مجھے ان عورتوں پر حیرت ہوتی ہے جو شوہروں کے معاملے میں اتنی حقوقِ ملکیت میں پہنچ جاتی ہیں جیسے کہ شوہر پالتو کتا ہوتا ہے۔

اب میں دیکھنا چاہتی تھی کہ آنس اور سوزین کا قصہ کدھر جاتا ہے۔ آنس نے لکھا ____

''کئی شامیں ایک ساتھ گذرتی تھیں۔ مگر سوزین چونکہ خود بھی مصروف رہتی تھی اور اُسے میرا بھی خیال تھا کہ میں سارا دن کہاں رہتا ہوں۔ وہ کسی بھی طور پر میرے لئے بوجھ نہیں بننا چاہتی تھی۔ جہاں اُسے پیسے نکالنے ہوتے نکالتی تھی۔ گویا وہ ابھی تک میری گرل فرینڈ نہیں بنی تھی۔ ویسے بھی یورپی لڑکیاں برابری کا رشتہ بنا کر خوش رہتی ہیں۔ یہ میں نے وہاں جا کر دیکھا۔ ایک دن سوزین بے دھڑک میرے اپارٹمنٹ میں آ گئی۔ جیسے کہ وہ آ جاتی تھی۔ اپنے ساتھ مارکیٹ سے شاپنگ بیگ لے کر آئی۔ کہنے لگی آج کھانا میں بناؤں گی اور مل کے کھائیں گے۔ یہ شاید کوئی ویک اینڈ تھا اور صبح سے جھڑی لگی تھی اور وقفے وقفے سے بارش ہو رہی تھی۔ بالکونی سے جھانک کر دیکھتا تھا تو اِکا دُکا گاڑی گذر جاتی تھی یا کوئی چھتری لئے تیزی سے گذر جاتا تھا۔ سوزین اپنے ساتھ بیئر اور وہسکی کی بوتلیں بھی لائی۔ میں نے کہا بھی کہ جب تم یہاں ہوتی ہو تو پھر یہ سب نہ کیا کرو۔ میری بار میں سب کچھ موجود ہوتا ہے۔ اُس نے مجھے دیکھا، مسکرائی اور کام میں لگ گئی۔ چونکہ آج اُس نے کھانا تیار کرنا تھا تو میں نے آفر کی کہ اگر میں کوئی مدد کر سکوں تو اُس نے کہا۔ اتنے چھوٹے کچن میں کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا ہاں اُس کا کام بڑھا ضرور سکتا ہے۔ مجھے اسی بات کی امید تھی، اس لئے میں وہاں سے ہٹ گیا۔

میں نے دیکھا وہ مچھلی کی کوئی ڈش بنا رہی تھی۔ اور چاولوں کے ساتھ چکن اور سبزی کی کوئی ڈش تھی۔ میں مطمئن ہو گیا کہ اُسے میرے کھانے کی عادتوں کا علم ہو چکا ہے۔ ویسے میں نے فرج میں دال اور چکن کا سالن بھی رکھا ہوا تھا۔ وہ کام کرتی رہی اور جیسا کہ دستور ہے کام کے ساتھ ہی ڈرنک بن جایا کرتی ہے تو وہ وہسکی کے گلاس بنا کر لے آئی۔ اور ہم نے وہ لینے شروع کئے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں، ریسرچ کی باتیں اور پھر اُس نے کہا۔ مجھے کیوں لگتا ہے ہم ایک زمانے سے ساتھ رہ رہے ہیں؟ میں نے کہا شاید اس لئے کہ ہم بہت کم وقت میں ایک دوسرے کو سمجھ گئے ہیں۔ اور اُن باتوں کا احترام کر رہے ہیں جو ہم دونوں میں مشترک بھی ہیں اور الگ الگ بھی ہیں۔ اس پر وہ اور خوش ہو گئی کہ وہ بھی یہی خیالات رکھتی تھی۔ اب چونکہ وہ آج کی شام کی

میزبان تھی اس لئے مجھے کچن میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس نے میری ڈرنک کا خیال رکھا اور اپنی ڈرنک کا بھی۔ اس دوران اُس نے بہت اچھا فرنچ سلاد بنایا۔ اس نے ڈائننگ ٹیبل پر کھانا سجایا اور ثابت کیا کہ وہ ایک مکمل عورت ہے۔ باتوں باتوں میں اُس نے بتایا کہ ملہوترا برا آدمی نہیں تھا۔ وہ میری نیوڈ نہیں بنانا چاہتا تھا۔ وہ کہتا تھا جس لڑکی سے میں پیار کرتا ہوں اُس کی نیوڈ نہیں بناتا لیکن میں نے اُسے کہا تم میری نیوڈ بناؤ کہ میں خود کو دیکھنا چاہتی ہوں، تمہاری نظر سے۔۔۔۔۔۔ ورنہ میں باتھ روم میں تو خود کو عریاں دیکھ ہی لیتی ہوں اور پھر میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ جب تم میری نیوڈ بناؤ گے تو میری روح میرے اوپر کیسے کپڑے پہنائے گی۔ مجھے کیسے میری نظر سے بچائے گی۔ اس لئے میں نے اُسے اجازت دی اور جب اُس نے وہ پورٹریٹ بنائی تو پھر مڑ کے میرے بدن کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ آرٹسٹ تھا کوئی بدمعاش نہیں تھا۔

اب سوزین نے کھانا لگایا اور سلیقے سے ڈرنک بھی بنائی اور اس شام کو مچھلی اور چکن کی ڈشز میں کئی طرح کی سبزیاں، پنیر اور مشروم کے ساتھ زبردست سلاد نے مہکا دیا تھا۔ سوزین نے کھانے کے بعد بھی ڈرنک لی کہ یورپ میں ایسا ہوتا ہے۔ اب جو میں نے کچن کو دیکھا تو ایک بے ترتیب میدانِ جنگ سامنے تھا۔ پلیٹیں گلاس فرائی پین چمچے اور دیگچیاں کہاں سے کہاں رکھی تھیں۔ یہ سوزین کا ایک ڈنر تھا۔ جب میں کچن میں کچھ ضروری کام کر کے باہر آیا تو وہ میرے بستر پر سو رہی تھی۔ میں نے اُسے اٹھانا مناسب نہ سمجھا اور زمین پر بستر لگانے لگا۔ اس نے کہا نہیں تم بھی اسی بستر میں سو سکتے ہو۔ واقعی اس کی بات درست تھی۔ سٹوڈیو اپارٹمنٹ میں ایک ہی بیڈ ضرور ہوتا ہے مگر اس کا سائز بڑا ہوتا ہے۔ دو لوگ آسانی سے سو سکتے ہیں۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا اور سو گیا۔ درمیان میں رات کے کسی وقت مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھ سے لپٹ کر گہری نیند سو رہی ہے۔ تب مجھے پتہ چلا وہ یہاں کیوں سوئی ہے۔ اس نے کپڑے بھی اتار دیئے تھے۔ کپڑے کیا تھے ایک چولی اور ایک چڈی۔۔۔۔۔ اب میں کروٹ بھی نہیں لے سکتا تھا کہ کہیں وہ اتنی اچھی نیند سے جاگ نہ جائے۔ میں اُسی انداز سے سویا رہا۔ پھر کسی وقت وہ مجھ سے الگ ہوئی اور میں نے کروٹ لی۔ صبح کے قریب پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔ مجھے اس کا بدن شدت سے محسوس ہوا۔ مجھے اچھا نہیں لگا کہ میرے جسم پر کپڑے تھے۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مجھے اس موقع کا کوئی فائدہ اٹھانا تھا۔ بلکہ مجھے ناروے کے ایک سفر میں اوسلو کی نیوڈ بیچ پہ جانے کا موقع ملا تھا۔ ہم دوست کپڑے اتارے بغیر وہاں چلے گئے جہاں سب بے لباس ساحل سمندر پر دھوپ میں لیٹے تھے۔ عورتیں مرد مختلف عمروں کے وہاں موجود تھے۔ اچانک مجھے احساس ہوا

کہ ہم نے ان کے آرام میں خلل ڈالا ہے یا تو ہمیں بھی اُن جیسا ہونا چاہیئے۔ ورنہ یہ تماش بینی کے زمرے میں آئے گا۔ میں سب کو وہاں سے باہر لے گیا کہ یہ بداخلاقی تصور ہوگی۔ لیکن میں چونکہ موقع کا فائدہ نہیں لینا چاہتا تھا اس لئے میں نے کپڑے نہیں اتارے۔ البتہ میں نے اُس کے بدن کی حدت کو اپنے جسم کی گرمی میں تحلیل ہوتے محسوس کیا۔

صبح اس نے کپڑے پہنے اور جانے لگی تو میں اُسے دروازے تک چھوڑنے گیا۔ اس نے کہا تم نے صبح موقع کا فائدہ نہیں اٹھایا۔ میں نے تمہارے جسم میں دوڑتی سنسنی کو محسوس کر لیا تھا۔ میں نے کہا۔ میں اندھیرے کا فائدہ نہیں اٹھاؤں گا۔ سب کچھ روشنی میں ہو تو اچھا لگتا ہے۔ وہ جاتے ہوئے بس یہ کہہ گئی تم انڈین اور پاکستانی ایک جیسے ہوتے ہو۔ دیر تک اس تجربے کی گرفت میں رہا اور ایک طرح کی رومانوی خوشی سے سرشار رہا۔۔۔۔۔ سوزین کے پاس ایک چھوٹی گاڑی تھی جو نیچے سڑک کے پاس پارک ہوتی تھی۔ اُس سے مجھے پتہ چل جاتا تھا کہ وہ اپارٹمنٹ میں ہے یا نہیں۔ وہ یونیورسٹی میں سائیکل استعمال کرتی تھی اور آسٹریا جانا ہوتا تو کار استعمال کرتی تھی۔ اب آتے جاتے میری نظر اُس کی سائیکل اور گاڑی پر رہتی کہ پتہ چل سکے وہ کہاں ہے۔ ایسا کیوں تھا؟ اُس وقت جرمنی میں وہ میرے لئے سب سے بڑی دلچسپی تھی۔ اسے محبت تو میں کہہ نہیں سکتا تھا کہ محبت کا مجھے کوئی شعور نہیں تھا۔ بس یوں کہہ لیں کہ وہ آجاتی تو اچھا لگتا تھا۔ اس رات اُس نے ایک اور بات بھی کی تھی۔ جب وہ میرے ساتھ بستر میں سوئی تھی۔ وہ بات اب یاد آئی ہے۔ اُس نے کہا تھا تم بستر میں اچھے دوست ہو۔ نہ تم ڈکار لیتے ہو نہ خراٹے۔۔۔۔۔ اور مجھے ان دونوں سے نفرت ہے۔

میں اپنی ریسرچ میں بھول گیا کہ وہ کہاں رہتی ہے۔ کبھی اس کی سائیکل غائب تو کبھی گاڑی۔ ایسے میں اُس کی موجودگی کا تعین کرنا مشکل ہو گیا تھا اور خود میں بھی خاصا مصروف ہو گیا تھا لیکن میں شام کے بعد اپنے اپارٹمنٹ میں دو ہی کام کرتا تھا یا تو ریسرچ کو ترتیب میں لاتا تھا یا کچن میں کھانا بناتا تھا۔ کہ ایسے میں ایک دن پھر دستک ہوئی۔ سوزین داخل ہوئی اور گلے لگ کر اُس نے مجھے اپنی غیر حاضری کی تلافی کرتے ہوئے گال سے گال ملائے اور سامنے بیٹھ گئی۔ کہنے لگی میں ایک ایسے گاؤں میں گئی تھی جہاں مجھے معلوم ہوا کہ کبھی ہندوستان سے جپسی قبیلے کے لوگ ادھر آ کر آباد ہو گئے تھے۔ یہ لوگ ہندوستان سے صدیوں پہلے راجستھان سے نکلے اور قریہ قریہ، گاؤں گاؤں، نگر نگر گھوم کر معلوم نہیں کب اس گاؤں میں آباد ہو گئے اور پھر بدلتے بدلتے وہ جرمنی کے مقامی لوگوں سے مل جل کر ایک ہو گئے۔ اب کوئی نہیں جانتا کہ ان میں صدیوں کا کون سا کلچر

موجود ہے۔ بس یہ دیکھنے گئی تھی۔

''تو کیا دیکھا؟ یا کیا نتیجہ نکالا؟''

''نتیجہ تو ابھی نہیں نکالا۔ مگر جو میری اینتھراپالوجی کہتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ تصور کہ وہ راجستھان انڈیا کے جپسی تھے جو یہاں آباد ہوئے بلکہ درست ہے۔''

اب میں نے تھوڑا تجسس کیا کہ میرا بھی یہ موضوع تھا کہ میں تاریخ سے تعلق رکھتے ہوئے یہاں ریسرچ کرنے آیا تھا۔ تو کہیں نہ کہیں ریسرچ کی شاخیں ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ سوزین اور میں ایک جگہ پہنچنا چاہتے ہیں۔ جب اس نے یہ بتایا کہ اس گاؤں میں آج بھی لوگ دودھ ڈالنے والے برتن کو بجا کر موسیقی پیدا کرتے ہیں تو بس میں نے سرا پکڑ لیا۔ اور تحقیق سے اس نتیجے پر پہنچا کہ پوری دنیا میں موسیقی کے آلات بنیادی طور پر برتن ہوتے تھے یا قدرتی طور پر پیدا ہونے والی گھاس۔ بارش سے بڑھنے والے پودے یا بانس کی قسموں کے نرسل ہوتے تھے جن سے ہم بچپن میں قلم بناتے تھے۔ اب مجھے اپنے ہندوستان کے گانے بجانے والے یاد آ گئے۔ بانسری بانس سے بنائی گئی۔ طبلہ دودھ کے برتن سے بنا جسے ولٹویا کہتے تھے یا گڑوی کہتے ہیں۔ ستار کا ساز بھی ایسے ہی ایجاد ہوا جب ایک دن تخلیق کار کی انگلی کسی تار کو چھو گئی تھی اور دیر تک جلترنگ بجتی رہی تو وہاں سے تین تار لے کر گول برتن پر اُسے لگایا گیا تو ستار کا ساز وجود میں آیا جو پہلے سہ تار تھا پھر ستار کہلایا اور اس کے تار بھی بڑھا دیئے گئے۔ برتن کی جگہ لکڑی کا خول بنایا گیا۔ اب میں نے بھی اُسے بتایا کہ ہمارے دیہاتوں میں اب بھی شادی بیاہ کے موقعوں پر غریب لوگ برتنوں کو بجا کر لوک گیت گاتے ہیں۔

اُس نے بتایا کہ راجستھان کا فوک شروع شروع میں جپسی قبیلوں کے ساتھ سفر کرتے یہاں پہنچا اور یہاں کے کنٹری میوزک میں وہ دھنیں آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔ مجھے یہاں مشہور پاکستانی گلوکارہ ریشماں یاد آئیں۔ میں نے اُسے بتایا کہ اُسی قبیلے کی ایک فوک سنگر ریشماں وہاں سے پاکستان آ گئی اور وہ دودھ کی گڑوی بجا کر میلوں اور عرسوں میں گاتی پھرتی تھی کہ اُسے ریڈیو پاکستان کے ایک ڈائریکٹر نے سن لیا اور اُسے لے آیا۔ پھر اس کا سفر انتہائی شاندار ہے۔ وہ اب بھی گا رہی ہے۔ میں تمہیں اُس کے گیت سنواؤں گا۔ وہ بہت خوش ہوئی کہ اس کی ریسرچ کو پَر لگ گئے۔ میں نے اُسے جپسی قبیلوں کے کئی قصے سنائے جن کو پنجاب میں پکھی واس کہتے ہیں۔ جس کا مطلب پرندوں کی طرح کی ہجرت ہوتی ہے۔ وہ بہت خوش

ہوئی کہ اُس کی ریسرچ کو ایک طاقت مل گئی۔ وہ ایسے کہ پرندے کی ہجرت تو ہزاروں میلوں کی بھی ہوتی ہے تو پھر یہ قبیلہ پکھی واسوں ہی کی طرح ادھر آ نکلا۔ ایک اہم پہلو کی طرف اس نے توجہ دلائی کہ بیچ میں رومانیہ، بلغاریہ، پولینڈ، چیکوسلواکیہ اور ہنگری جیسے ملک بھی آتے ہیں تو یہ قبیلے بہتر معاشرت کی تلاش میں وہاں بھی تو آباد ہوئے ہوں گے۔ اور ریسرچ یہ کہتی ہے کہ ان ملکوں کے لباس میں گھاگھرا اور چولی بنیادی لباس کے طور پر موجود ہیں۔ اور ان کا میوزک بھی اُن لوک دھنوں سے شدید متاثر ہے۔ یہ قبیلے چلتے چلتے سویڈن، سوئٹزر لینڈ، فرانس اور پھر ناروے تک پہنچے۔ یہ سب تسلسل اُس کی ریسرچ میں شامل ہے۔ اب تو مجھے یوں لگا کہ ہم دونوں شاید اسی مشترک ثقافتی اور تاریخی ملاپ کی وجہ سے قریب آ رہے ہیں۔ اور اب کرسمس کے آثار دور سے دکھائی دے رہے تھے اور سوزین میرے قریب آنے کی کوشش نہیں کر رہی تھی۔ میرے اندر بے چینی پیدا ہو گئی کہ کہیں اُسے کوئی بوائے فرینڈ تو نہیں مل گیا۔ اب میں اس پر فریفتہ ہونے کے لئے تراکیب استعمال کرنے لگا۔ بہانے بہانے سے اس کا انتظار کرنے لگا۔ کبھی کچھ بنا کر اُسے دعوت دینے لگا۔ وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی اور جان گئی تھی کہ میرے اندر کیا چل رہا ہے۔ میں اُس سے کھل کے کہہ سکتا تھا لیکن میں ذمہ داری سے ڈرتا تھا۔ میں ریسرچ کرنے آیا تھا اور میرا ایک خاص وقت اس جگہ پر طے ہو چکا تھا۔ مجھے تو جانا تھا۔ میں کیسے زنجیر پاؤں میں ڈال سکتا تھا۔ اگرچہ سوزین مجھے بے حد خوبصورت لگنے لگی تھی اور میں یہ بھی جان گیا تھا کہ وہ کسی بھی قسم کی ضرورتوں سے بہت دور ہے۔ چولی چڈی، جینز کرتی اُس کا کُل پہناوا ہے۔ میک اپ کی اُسے ضرورت نہیں۔ کھانے کا ذوق میں پورا کر سکتا ہوں تو باقی کیا رہ گیا؟ لیکن میں ڈر رہا تھا کہ اگر پہل کروں گا تو شاید وہ اپنی خواہشوں کا بوجھ مجھ پر ڈال دے۔ آخر ایک دن ایسا ہوا کہ میں نے اُسے اپنے اپارٹمنٹ میں کھانے پر بلایا۔ وہ آ گئی۔ ہم نے وہسکی لی۔ میوزک میں مجھے ریشماں کی کیسٹ مل گئی اور یہ میں نے ہائیڈل برگ یونیورسٹی کی نکڑ پر پاکستانی ریسٹورنٹ کے ایک بیرے سے لی۔ جو ریشماں کے ایک گیت کو سینے سے لگا کے غیر قانونی طور پر ایران کے راستے سے پہلے برلن پہنچا اور اب اس ریسٹورنٹ میں کام کر رہا تھا۔ گیت پرویز مہدی اور ریشماں نے گایا تھا اور وہ ہر غیر قانونی طور پر یورپ میں جانے والے پاکستانیوں کے دل کی آواز ہے۔ گیت کے بول یہ ہیں:

گوری اے میں جانا پردیس
ماہی وے میں جاناں تیرے نال

ایک مصرع پرویز مہدی نے گایا تو دوسرا ریشماں نے۔ جب میں نے وہسکی کے دو پیگ لینے کے بعد یہ کیسٹ چلائی تو سوزین پاگل ہوگئی۔ اور میرا اسٹوڈیو اپارٹمنٹ زندگی سے بھر گیا۔ وہ اٹھی اور میرے گلے سے لگ گئی اور ہم اُس گیت کی دھن پر ہلکا ہلکا رقص کرنے لگے۔ میں نے اُسے گیت کا مطلب سمجھایا مگر اُس نے کہا۔ کبھی گیت کا ترجمہ نہیں کرنا چاہئے۔ گیت قتل ہو جاتا ہے۔ گیت کسی زبان کا ہو، وہ اپنا معنی خود پہنچاتا ہے۔ آئندہ ایسا نہ کرنا ــــ اس دوران میں نے اُسے چوما اور اُس نے بھی مجھے چوم لیا۔ اب جب تیسرا وہسکی کا گلاس ہمارے ہاتھ میں آیا تو وہ کہنے لگی ــــ ''سنو تمہیں گرل فرینڈ کی ضرورت ہے یا نہیں۔ مجھے بوائے فرینڈ کی ضرورت ہے اور میرے آس پاس کچھ ہیں جو مجھے اپنی گرل فرینڈ بنانا چاہتے ہیں۔ اب تم بتاؤ کیا میں تمہاری گرل فرینڈ بن سکتی ہوں؟ کیونکہ وہ جن ملکوں سے ہیں وہ میں جانتی ہوں کہ مخلص نہیں ہو سکتے۔''

میں نے کہا۔ ''تم نے یہاں مجھے محسوس کرایا کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ میں تمہارا احسان مند ہوں۔ میں چاہوں تو ساری زندگی تمہارے ساتھ گذار سکتا ہوں لیکن ڈرتا ہوں کہ شاید تم ساری زندگی میرے ساتھ نہ گذار سکو۔''

''تو کس نے کہا میں ساری زندگی تمہیں برداشت کروں گی۔ یہ الگ بات کہ تم ڈکار نہیں لیتے اور خراٹے نہیں لیتے۔ پھر بھی تم میں بہت سے پرابلم ہیں۔ مثلاً تم بہت سوچتے ہو۔ جب وقت ہوتا ہے عمل کرنے کا تم سوچتے ہو۔''

اب میں بات سمجھ چکا تھا تو میں نے کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ بوائے فرینڈ کے طور پر حاضر ہوں۔''

اُس نے کہا۔ ''سنو، یورپ میں اب شادی کا ادارہ ختم ہو چکا ہے۔ کوئی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔ جرمنی میں بچوں کے پیدا ہونے کا تناسب بہت کم ہو چکا ہے۔ اس لئے جرمنی کو محسوس ہو گیا ہے کہ اگر دس پندرہ سال تک ایسا ہوا تو جرمنوں کی آبادی کم ہو جائے گی اور باہر کے ملکوں کے افراد کی آبادی بڑھ جائے گی۔ یہ پورے یورپ کا مسئلہ ہے۔ اس لئے جرمن حکومت نے بچہ پیدا کرنے پر الاؤنس دینے کے ساتھ بچے کی پوری تعلیم کی ذمہ داری لے لی ہے ــــ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''اس کا مطلب ہے تم بچہ پیدا کرو گی؟'' میں نے کہا۔

''نہیں، یہ تو میں نے تمہیں مطمئن کرنے کے لئے کہا ہے کہ اگر ہمارے درمیان کوئی بچہ آیا تو وہ تمہاری ذمہ داری نہیں ہوگی۔''

اب میری باری تھی اور میں اُٹھا اُسے چوما اور کہا۔''میں ذمہ داری سے بھاگتا نہیں ہوں لیکن مجھے ایک عرصے کے بعد یہ اپارٹمنٹ چھوڑنا ہے اور شاید اس کے ساتھ تمہیں بھی چھوڑنا پڑے تو اس وجہ سے میں اب تک نہیں بولا۔ ورنہ تم مجھے بے حد پسند ہو اور۔۔۔۔۔''

اُس نے کہا۔''تم بہت سے''اور'' لگا رہے ہو۔ جس سے لگتا ہے کہ تم ابھی بھی ڈر رہے ہو۔''

میں نے کہا۔''ہاں، بہت سے جذبات جمع ہو گئے تھے اس لئے اور اور آ گیا۔''

اب یہ ہوا کہ ہم نے وہ ڈنر جو میں نے تیار کیا تھا، لیا اور اُس نے چولی چڈی اتاری اور میرے بستر میں گھس گئی۔ میں نے بھی ایسے ہی کیا۔ یہ ہمارے نئے عہد کا آغاز تھا۔

اب ظاہر ہے کوئی پردہ نہیں تھا۔ اس کا اپارٹمنٹ میرا اور میرا اپارٹمنٹ اُس کا تھا۔ ہم دن رات ایک ساتھ رہنے لگے۔ اس دوران میں نے اُسے اچھی دوست اچھی بستر کی ساتھی پایا۔ ہم دونوں ریسرچ میں اب اکٹھے کام کرنے لگے اور وہ مجھے اور میں اُسے مدد دینے لگا۔ اس دوران کرسمس قریب آ گئی تو مجھے معلوم تھا یونیورسٹی یکا یک خالی ہو جائے گی۔ نہ آدمی نہ آدم زاد تو میں کیا کروں گا؟ اس حوالے سے میں نے سوچ رکھا تھا کہ برلن میں جو پاکستانی دوست ہیں اُن کے پاس چلا جاؤں گا یا کسی بھی جرمن شہر میں کوئی شناسا ہے تو اُس کے پاس چلا جاؤں گا، اگر انہوں نے مجھ سے ملنے کی خواہش کی۔ لیکن مجھے محسوس ہوا کہ کسی کو میری ضرورت نہیں تھی۔ کرسمس کے قریب یونیورسٹی ٹاؤن خالی ہونے لگا اور یوں لگا جیسے جِن پھر گیا ہو۔ میں اداس ہو گیا کہ سوزین کو تو ظاہر ہے اپنے گھر آسٹریا جانا ہو گا تو میں یہاں کیا کروں گا۔ تو ایسے میں چھٹیوں سے پہلے ہی سوزین آئی اور اُس نے کہا۔ اپنی کھانوں کی ساری ترکیبیں، مصالحے وغیرہ پیک کر لو۔ ہم کرسمس آسٹریا میں گذاریں گے۔ میری ماں نے مجھے دعوت دی ہے لیکن وہ کسی کام میں دخل نہیں دیتی۔

اب مجھے تو اِسی بات کا انتظار تھا۔ اِدھر یونیورسٹی بند ہوئی اور اُدھر ہم دونوں نے سامان رکھا اور آسٹریا کی سرحد کی طرف روانہ ہو گئے۔ میرے لئے یہ انوکھا تجربہ تھا کہ انتہائی سرسبز علاقوں سے گذر کر آسٹریا میں داخل ہونا تھا۔ ہم صبح منہ اندھیرے نکلے کہ شام سے پہلے پہنچنا ضروری تھا۔ اور شام دو فرلانگ کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ جبکہ میلوں کی دوری پر آسٹریا کی سرحد تھی۔ اس دوران مجھے اور اُسے کرسمس کے تحفے بھی لینے تھے۔ میں نے سوزین کے لئے اُسی کی پسند کا پرفیوم لیا۔ اس کی ماں کے لئے ایک سکارف اور سویٹر لیا۔ چاکلیٹس کے ڈبے اٹھائے اور نکل کھڑے ہوئے۔ راستے میں ٹریفک کچھ ایسی تھی۔ لوگ کرسمس کے لئے

گھروں کو جارہے تھے۔ شام سے پہلے ہم آسٹریا میں داخل ہو چکے تھے۔ بس کچھ دیر میں وہ گاؤں آ گیا۔ ایسے لگا کوئی خوبصورت لینڈ سکیپ پینٹنگ ہے۔ بہت سے درخت اور بہت سی ہریالی میں اور نچلی نشیبی سطحوں پر یہ گاؤں قدیم زمانوں کی بوباس لئے ہوئے خاموش کھڑا تھا مگر خاموشی بول رہی تھی۔ مختلف گھروں سے دھواں نکل رہا تھا۔ گویا یہاں گھروں میں لکڑیوں کا استعمال ہوتا تھا۔ سب سے نمایاں چرچ دکھائی دیا۔ سوزین نے بتایا یہ لکڑی اور پتھر سے بنایا گیا ہے۔ ہر گھر کے اندر جانوروں کے باڑے اور مرغیوں مرغابیوں کے احاطے موجود تھے۔

پھلوں میں سیبوں اور انگوروں کے باغ بھی دکھائی دیئے۔ جن سے ہر گھر میں وائین بنائی جاتی ہے۔ یہ گاؤں اپنی بنائی ہوئی وائین کی وجہ سے مشہور ہے۔ کھیتوں میں ہر طرح کی سبزی لہلہا رہی تھی۔ شام بہت سرد تھی۔ لکڑی کے ایک پرانے پھاٹک میں گاڑی داخل ہوئی اور رک گئی۔ ایک چھوٹا ٹریکٹر اور زرعی آلات ایک طرف رکھے ہوئے تھے۔ گویا یہ کسان کا گھر تھا۔ جونہی ہم گاڑی سے اُترے ایک سرخ بالوں والا کتا میری طرف دیکھ کر بھونکا اور پھر سوزین کے گلے لگ گیا۔ اُس نے اُسے بہت پیار کیا اور اپنی زبان میں میرا تعارف بھی کرا دیا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے ایک چھوٹا سا سن روم تھا جہاں ہم نے اپنے کوٹ اتارے، جوتے اتارے اور پھر اندر داخل ہوئے کہ یہ دستور تھا۔ اندر انگیٹھی میں لکڑیاں جل رہی تھیں اور لاؤنج بہت گرم تھا۔ سوزین کی ماں کچن سے آئی جو سامنے تھا۔ اس نے سر پر ریشمی سکارف باندھا ہوا تھا۔ لمبا فراک پہن رکھا تھا۔ سوزین نے بتایا کہ یہ میرا بوائے فرینڈ ہے۔ میں نے اُسے ہیلو کہا اور ہاتھ ملایا۔ اُس نے نگاہوں میں تولا۔ کچھ نہیں پوچھا میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ میں نے کرسمس گفٹ دیئے تو اس نے شکریہ ادا کر کے ایک طرف رکھ دیئے۔ اس نے کہا کہ وہ تندور میں ڈبل روٹیاں لگا رہی ہے۔ تندور لکڑیوں سے دہک رہا تھا اور وہ کئی طرح کی روٹیاں مختلف سانچوں میں رکھ کے آگ میں جھونک رہی تھی۔ میں بیٹھ گیا اور جائزہ لینے لگا۔ کھڑکی سے دیکھا تو باہر ہر طرح کی سبزی اور پھل لگے ہوئے تھے۔ سوزین کچن میں چلی گئی اور پوچھنے لگی۔ ''یہاں آ کر کیسا لگا؟'' میں نے کہا۔ ''جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔'' پھر ہم دونوں ساتھ کے کھیت میں سے سبزی اور سلاد چننے کے لئے نکلے اور ٹوکریاں بھر کے واپس آئے۔ کئی طرح کا سلاد اور کئی طرح کی سبزیاں کل کے لئے ہم توڑ کے لے آئے۔

رات کے کھانے میں گھر کی بنی وائین، پنیر، زیتون اور کئی قسم کے سلاد، ڈبل روٹی اور گھر کی مرغی کا

روسٹ شامل تھا۔ کرسمس ڈنر کے لئے میری ذمہ داری بریانی اور کڑاہی گوشت تھا۔ سوزین نے سلاد بنانے تھے اور اس کی ماں نے روایتی کرسمس کیک اور ٹرکی روسٹ کرنی تھی۔ ہم نے اپنی اپنی شفٹ لے لی اور شام سے پہلے ڈنر تیار ہو گیا۔ باہر شام کہے کہ آکر میرے گلے ملو۔ پورا گاؤں اپنے اپنے گھروں میں بند تھا۔ صرف چمنیوں سے دھواں باہر آ رہا تھا۔ میرا دل کرتا تھا خالی پگڈنڈیوں پہ چلوں۔ اس گاؤں کو اپنے اندر بسا لوں۔ گھروں سے روشنی کی ٹمٹماہٹ باہر آ رہی تھی اور نہ کوئی آواز نہ کوئی سایہ۔ بس خاموشی تھی بلکہ سناٹا تھا۔ میرا یہ پہلا تجربہ تھا کرسمس منانے کا کسی یورپی ملک میں ــــ اور یہ سوزین کی وجہ سے تھا۔ اب جب کرسمس ڈنر کی میز سجی تو میری بریانی، کڑاہی گوشت، ٹرکی روسٹ، سلاد اور کئی طرح کی ڈبل روٹیاں، پنیر، زیتون، مکھن کے ساتھ موجود تھیں۔ سوزین کی ماں تو میری بریانی اور کڑاہی پر فریفتہ ہو گئی جیسے سوزین ہوئی تھی۔ پس ثابت ہوا کہ عورت کے دل کا راستہ بھی پیٹ سے ہو کر جاتا ہے۔ سوزین کی ماں نے میرے لئے وہسکی کی بوتل نکالی اور گھر کی بنی وائین رکھ دی۔ ڈنر پر میں نے دیکھا سوزین کی ماں اور سوزین بھی میرے ساتھ وہسکی لے رہی تھیں۔ اور پھر کھانے پر ہم سب نے گھر کی بنی وائین بھی لی۔ اب میں آسٹریا کو اپنی بانہوں میں لے چکا تھا ــــ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ہائیڈل برگ میرے لئے اتنا خوبصورت بن جائے گا۔ سوزین کی ماں نے کوئی میوزک ایسا لگایا کہ مجھے محسوس ہوا وہ میوزک میری رگوں میں شامل ہے۔ موسیقی بھی آبشاروں، دریاؤں کی طرح ہوتی ہے۔ زمین کے ایک سرے سے چلتی ہے، ہواؤں کی طرح اور دنیا کے ہر حصے میں پہنچ جاتی ہے۔ کون جانتا ہے کہاں کا پانی چل کے کن پانیوں میں ملا اور سارے پانی ایک ہو گئے ــــ اس شام کی موسیقی کہیں دُور سے میرے بچپن سے آ رہی تھی اور کئی زمانوں کے سازوں کے ملاپ سے اس شام کے جادو میں ڈھل رہی تھی۔ اور میں سوچ رہا تھا پاکستان کا ایک تاریخ پر ریسرچ کرنے والا طالب علم کرسمس کی اس شام آسٹریا کے سرحدی گاؤں میں کیا کر رہا ہے۔ اور وہ بھی اپنی دوست کے ساتھ جو اُس کی مکمل ہم آغوش ہے۔ سوزین میں کوئی ایک نہیں کئی خاص باتیں تھیں۔ وہ رات کو مجھ سے لپٹ کے سوتی تھی اور فوراً ہی نیند میں چلی جاتی تھی اور جب تک وہ گہری نیند میں نہ جاتی میں خود کو اُس سے الگ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے میں بڑی احتیاط سے اُسی زاویے پر لیٹا رہتا۔ سوچتا رہتا، اپنے کام کے حوالے سے، آنے والے کل کے حوالے سے۔ جب اُس کے ننھے منے خراٹے پیدا ہوتے تو میں اپنا بازو آہستہ سے نکالتا اور کروٹ لینے کی پوزیشن میں ہوتا۔ مجھے اس کے بعد نیند آتی۔ صبح وہ جلدی اٹھ جاتی اور وہ مجھے بالکل تنگ نہ کرتی۔ جب میں نیند پوری کر لیتا تو معلوم ہوتا وہ یا تو باہر

گھوم رہی ہے یا گھر کا کوئی کام کر رہی ہے۔ اگر مجھے بیوی چاہیے تو پھر اُس سے اچھی بیوی تو ہو نہیں سکتی تھی۔ مگر اُسے میرے جیسا شوہر چاہیے یا نہیں۔ یہ بھی تو اہم بات تھی اور پھر مجھے تو اپنا کام مکمل کر کے آگے جانا تھا____ اور یہ بات ہمارے درمیان طے ہو گئی تھی۔ تو کیا انسان کو اپنے فیصلے اسی طرح کرنے چاہئیں؟ پھر قدرت کا عمل دخل کیا معنی رکھتا ہے؟ اب یہ تو مجھے ابھی دیکھنا تھا۔ کرسمس کی اُس رات بستر میں سوزین مجھ سے اس طرح لپٹی کہ اب کبھی ہم جدا نہ ہوں گے۔

اگلے دن اُس نے مجھے گاؤں گھمایا۔ مجھے جنت کا تصور مولانا صاحبان نے دے رکھا تھا۔ جبکہ جنت تو اللہ کی ہے اور یہ گاؤں بھی اللہ کا بنایا ہوا تھا۔ تو مجھے تو اللہ پہ بھروسہ رکھنا تھا تو میں نے سوچا۔ جنت ہے تو پھر ایسی ہو گی۔ پتھریلی گلیاں، پرانے گھر، پرانی پن چکیاں، پرانے درخت، ہر شے پر صدیوں کی مہر لگی تھی۔ قدموں میں ہریالی کا سیلاب اُمڈا ہوا تھا۔ کھیتوں میں ہر طرح کی سبزی اور پھل آپ کی ضرورت کے حساب سے موجود تھے____ آپ جائیں توڑ لیں۔ جنت کے بارے میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ جنت میں رہنے والے جب جس شے کی خواہش کریں گے وہ اُسے حاصل کر لیں گے تو یہ سب تو آسٹریا کے اس گاؤں میں بھی پورا ہو رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اللہ نے زمین پر بھی جنت رکھ دی ہے اگر ہم دیکھ سکیں تو؟____

یہاں سے قریب بڑا شہر سالزبرگ تھا۔ سوزین نے اپنے گاؤں کو خدا حافظ کہنے سے پہلے گاڑی کو لکڑی اور پتھروں سے بنے چرچ کے سامنے روکا اور کہا۔ ”میں ابھی آتی ہوں۔ مجھے گاڈ سے کچھ بات کرنی ہے۔“ وہ چلی گئی تو میں نے سوچا شاید اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اس لئے وہ گاڈ سے مانگنے گئی ہے۔ میرے پاس پیسے تھے۔ اس لئے میں نے سوچا اُسے بتا دوں گا۔ جب وہ آئی تو میں نے پوچھا۔ ”تم نے گاڈ سے پیسے مانگے؟ مجھ سے پوچھ لیتی۔ میرے پاس پیسے ہیں۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”اس دفعہ میں نے پیسوں کے لئے گاڈ سے بات نہیں کی“ اور پھر میری طرف دیکھا اور گاڑی چلا دی۔ ہمیں سالزبرگ جانا تھا۔ جو ہم پہنچ گئے۔ سالزبرگ میں سوزین مجھے نئے شہر سے لے کر نکلی اور پھر پرانے شہر میں لے گئی۔ اُس میں اُس کی نانی کی روح تھی۔ سالزبرگ میں وہ پتھر کی سو سال پرانی گلیوں میں لے گئی اور میں بھی تو تاریخ کا کیڑا ہوں اس لئے جب میں سوزین کے ساتھ وہاں سے گذر رہا تھا تو وہ ہر مکان پر رکتی اور کچھ پڑھتی اور پھر بتاتی کہ اس مکان کی تاریخ کیا ہے۔ ایسے میں مجھے سیکھنے کا موقع مل رہا تھا کہ مؤرخ کو ہر گلی ہر نکڑ پر ہر اشارے پر اور ہر موڑ پر رکنا ہوتا ہے۔ وہاں بھی ایک پرانا چرچ تھا۔ آرٹ گیلریاں اور موسیقی ہال تھے۔ ایسے میں سوزین کو یہاں

وہاں کچھ پرانی روحوں سے ملنا تھا۔ ہر عورت کی اپنی کہانی تھی جو وہ مجھے راستے میں سناتی جاتی تھی۔ میں تو اپنی کہانی میں اپنے کردار پر غور کر رہا تھا۔ میں ان بزرگ عورتوں کی کہانیاں کیا سنتا۔ البتہ جو یاد رہ گئیں وہ یہ تھیں کہ ایک عورت کو دوسری جنگ عظیم میں ایک مسلمان انڈین سے محبت ہو گئی جب وہ زخمی حالت میں اُسے ملا تھا۔ اس وقت اس کی عمر سولہ سال تھی۔ اور پھر اُس نے اُسے پناہ دے دی۔ ایک دن جرمن فوجیں اُسے ڈھونڈنے آئیں اور اُسے اُس کے سامنے گولی مار دی۔ وہ اس کی لاش لے کر دو دن بیٹھی رہی۔ آخر میں خود اُس کی قبر بنائی۔ ایک اور کہانی کہ ایک روسی آرکیٹیکٹ یہاں کام کے لئے آیا اور جس چھوٹے سے ہوٹل میں وہ ٹھہرا، ایک لڑکی وہاں ویٹرس تھی۔ عشق ہو گیا اور وہ اس کی گود میں ایک بیٹی دے کر چلا گیا۔ سوزین اُس بیٹی سے ملنے یہاں ضرور آتی تھی۔ ایک اور کہانی کے کردار سے بھی وہ ضرور ملنے یہاں آتی تھی اور وہ ایک انڈین حیدرآباد کی مسلمان عورت تھی، جو یہاں کبھی کسی عربی کے ساتھ آئی تھی جس نے اُسے حیدرآباد دکن سے شادی کے بہانے خریدا تھا۔ وہ اُسے یہاں کے براتھل میں فروخت کر گیا۔ تب سے اب تک وہ دھندے پر بیٹھی رہی۔ اب وہ دوسری لڑکیوں سے دھندہ کراتی ہے۔

سالزبرگ سے نکلے تو وی آنا جانا تھا۔ وی آنا میری حسرتوں کا شہر، خوابوں کا شہر۔ راستہ لمبا تھا اس لئے شام پڑے ایک چھوٹے سے شہر میں اُترے۔ سوزین چونکہ ہر جگہ سے واقف تھی وہ گاڑی کو پتھر کی گلیوں میں لے گئی اور پھر سو سال پرانے علاقے میں ایک ہوٹل کے سامنے رکی۔ جہاں وہ ٹھہرتی رہتی تھی۔ میرے لئے یہ ایک اور تجربہ تھا۔ عجیب و غریب شام تھی۔ خوبصورتی کا لفظ چھوٹا لگتا ہے۔ برفیں پڑی ہوئی تھیں اور وادیاں آس پاس پھیلی تھیں۔ لکڑی کے بنے اس پرانے ہوٹل میں گئے تو دو اَسّی اَسّی سال کی عورتیں لمبے فراک پہنے بیٹھی تھیں۔ اس ہوٹل کو دو بہنوں کا ہوٹل کہا جاتا تھا۔ ہوٹل ایک تین منزلہ چھوٹی سی عمارت پر مشتمل تھا۔ مشکل سے پندرہ کمروں پر مشتمل تھا اور اُس کے مخصوص گاہک تھے جو شروع سے بندھے ہوئے تھے، اُن میں ایک سوزین بھی تھی۔ اُن دو بہنوں نے جب سوزین کو دیکھا تو خوش ہو کر اٹھیں مگر مجھے دیکھ کر بیٹھ گئیں کہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ میں سوزین کے ساتھ آؤں اور ان کی ذاتی زندگی میں کوئی مداخلت کروں۔ اگرچہ ایسا نہیں تھا۔ اس لئے میں پیچھے ہٹ گیا اور پھر سوزین نے میرا تعارف کرایا تو وہ آگے آئیں اور انہوں نے ہمیں چابی دی۔ سوزین نے اپنی پسند کا کمرہ لیا۔ اس لئے کہ ہوٹل کرسمس کی چھٹیوں کی وجہ سے خالی پڑا تھا۔ یہ دونوں بہنیں باپ کے اس ہوٹل کو خود ہی سنبھالتی تھیں۔ وہ ہر کمرے اور باتھ روم کو روزانہ خود صاف کر کے بناتی تھیں۔ خود ہی کچن

اور کھانوں کا حساب رکھتی تھیں ـــــ جو لوگ ٹھہرتے تھے وہ عموماً ہنی مون کے لئے آتے تھے۔ وہ بھی یہ سمجھیں کہ ہم ہنی مون کے لئے آئے ہیں۔ جب سوزین نے اُن سے بات کی تو وہ میری طرف آئیں اور مجھے بیٹھنے کو کہا۔ یہ بھی ایک اور ہی طرح کی شام تھی۔ اوپر بیڈ روم میں گیا اور کھڑکی کا پردہ ہٹایا تو پھر ایک جنت کا نظارہ سامنے تھا۔ ایک وادی سامنے تھی اور میں اکیلا تھا۔ لیکن یہ میری مردانہ بیوقوفی تھی۔ میں اکیلا نہیں تھا۔ سوزین میرے ساتھ تھی ـــــ سوزین کے اندا ایک پرانی روح تھی شاید میرے اندر بھی تھی۔ ہر مؤرخ کے اندر اک قصہ گو چھپا ہوا ہوتا ہے اور ایسے ہی سوزین کے اندر بھی ایک قصہ گو کی روح موجود تھی جو اُسے نگری نگری لئے پھرتی تھی اور وہ ثقافتی جڑوں کو کھوجتی رہتی تھی۔ مشرقی عورتوں کو خواہ مخواہ آپس کی کانا پھوسی کی وجہ سے بدنام کیا گیا ہے۔ یہاں مغربی عورت کا بھی یہی حال دیکھا۔ اب سوزین اُن دو بہنوں کے ساتھ گھنٹوں لگی رہتی تھی۔ معلوم نہیں کن زمانوں کے قصے کھوجتی رہتی تھی۔ شاید ہم دونوں کی یہی قدر مشترک ہمیں قریب لے آئی تھی۔ اب وہ صبح ناشتے کے لئے بھی ان بہنوں کے کچن میں گھسی رہتی۔ یہاں دو دن یہاں کے بادلوں کی طرح اُڑ گئے۔

اب ہم وی آنا میں تھے۔ یہاں سوزین پھر اُسی طرح صدیوں پرانے ایک محل نما عمارت میں پہنچی۔ جو اَب ایک بوتیک ہوٹل میں تبدیل ہو چکا تھا۔ کیا شاندار ماضی تھا اس محل کا۔ کیا طرزِ تعمیر تھا اور داخلی کمروں اور ہال کمروں کی آرائش صدیوں بعد بھی وہی غرور اور شان رکھتی تھی۔ اس بوتیک ہوٹل میں سوزین ٹھہرتی تھی۔ مجھے راجستھان کے راجوں مہاراجوں کے محل یاد آ گئے جہاں اسی طرح کے بوتیک ہوٹل کھولے گئے ہیں۔ آج پوری دنیا کے ان محلات کو کوئی رکھنے کو تیار نہیں ہے۔ اس لئے مارکیٹ اکانومی کے تحت ان کا کمرشل استعمال شروع ہو چکا ہے۔

سوزین میں ایک بات میں نے دیکھی کہ وہ مرد کی ترجیحات پر زندگی نہیں گذارنا چاہتی تھی۔ اُسے جب جب جو جو چاہئے تھا وہ اُسے ملنا چاہئے تھا۔ شاید میں اُس کا عاشق نہیں معشوق تھا۔ اس بات سے میری مردانگی کو ٹھیس نہیں لگی کہ وہ مجھے اپنی مرضی سے لئے لئے پھرتی تھی ـــــ مجھے بھی ایسی زندگی بری نہیں لگتی جب کوئی میرے فیصلے کر رہا ہو۔ اور مجھے معشوق بنا کے گھما پھرا رہا ہو ـــــ سچائی شاید ان دو حقیقتوں کے بیچ میں ہوتی ہے جسے کبھی کبھی مرد نہیں سمجھ پاتا اور کبھی کبھی عورت نہیں سمجھ پاتی اور معاملات بگڑ جاتے ہیں ـــــ ہمارے درمیان معاملات سکون سے چلتے رہے اور ہم واپس ہائیڈل برگ پہنچ گئے۔ سردیاں، برف باریاں سب کچھ

میرے لئے تو حسین تجربہ تھا۔ میں اور سوزین پھر سے اپنی اپنی ریسرچ میں مصروف ہو گئے۔ کبھی لائبریری، کبھی کوئی کلاس، کبھی کوئی انٹرویو۔ مجھے بھی سکالرشپ کے مطابق اپنا کام مکمل کرنا تھا۔ میرا گائیڈ مجھے ہر طرح سے موقع دے رہا تھا کہ میں اس کی پسند کے مطابق اپنا کام کر جاؤں۔ یہ یورپی ملکوں کے پروفیسرز جانتے ہیں کہ ہم ایشیائی اداروں میں پڑھ کے آنے والوں کی اکیڈیمک کیمسٹری کیا ہوتی ہے۔ اس لئے وہ ہمیں گائیڈ کرنے کے طریقے بنا لیتے ہیں ـــــ ایسے ہی میرا کام دیکھا جا رہا تھا اور میرا گائیڈ مجھ سے مطمئن تھا۔ البتہ اپنی یورپی شان برقرار رکھنے کے لئے کبھی کبھی یہ ثابت کرتا تھا کہ میں کہاں بھٹک رہا ہوں ـــــ

اب مجھے سوزین کی عادت ہو گئی تھی۔ لیکن وہ میرے ہاتھ کم ہی آتی تھی۔ میں روزانہ اُس کی سائیکل اور گاڑی پر نظر رکھتا تھا۔ عجیب لڑکی تھی جب معشوق پہ پیار آتا تو ایسا کہ خود کو چھڑانا مشکل اور جب چاہا بے اعتنائی سے اِدھر اُدھر ہو گئے۔ لیکن سوزین سے میں اب بھی بہت پیار کرتا تھا۔ اور مجھے ایسے لگتا تھا کہ میں اس کے ساتھ باقی کی زندگی گذار سکتا ہوں۔ البتہ اس بات کا پتہ نہیں تھا کہ وہ بھی یہ زندگی گذار سکتی ہے یا نہیں ـــــ

ایک دن مجھے معلوم ہوا وہ اپنے اپارٹمنٹ میں ہے۔ یہ غالباً ویک اینڈ بنتا تھا۔ اس روز میرا پروگرام گھر میں کھانا بنانے کا تھا۔ جس میں کچھ تجربے بھی شامل تھے۔ خاص طور پر لاہوری مچھلی اور پرانز بنانے کے لئے اپنی پسند کی مچھلی اور پرانز لے آیا تھا۔ میں نے دستک دی تو وہ مجھ سے لپٹ گئی اور گلہ کیا کہ تم کہاں رہتے ہو؟ میری ذرا خبر نہیں لی۔ میں نے اُلٹا اُس پر یہی سوال کر دیا۔ تو وہ ہنسنے لگی کہ میں تو مذاق کر رہی تھی۔ میں مصروف تھی۔ میرے ہاتھ کچھ ایسی کتابیں اور ڈاکومنٹس لگی تھیں کہ میں انہیں ہر حال میں دیکھنا اور ریسرچ کرنا چاہتی تھی۔ "تو پھر کیا کیا ہے؟"

"پھر میں نے اُن سب پیپرز اور کتابوں کو دیکھا ہے۔ میرے پاس پورا تھیسس آ گیا اور اب میری ریسرچ کو عالمی سطح پر بہت پذیرائی مل سکتی ہے۔"

"تو پھر اس پر ایک شام ہمیں خوشی کو منانا چاہیئے۔"

"کیا ہے تمہارے پاس کوئی پروگرام؟"

میں نے ڈنر کی تفصیل بتائی تو اس نے کہا۔ "میں بھی کچھ لاؤں گی۔"

میں نے ڈنر تیار کیا اور اس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ لدی پھندی آئی۔ کچھ پھول، شیمپین، شیواز،

ریگل وہسکی اور دو طرح کا سلاد ـــــ باہر شام اُتر چکی تھی۔ باہر دھند پھیلی تھی اور کھڑکی دروازے کھولے تو دھند اندر آ گئی اور پھر ہم نے دروازے بند کر دیئے۔ ہم دونوں ایک کمبل میں بیٹھ کر وہسکی پینے لگے اور ہم نے بہت سی باتیں کیں۔ جو ہمارے اندر پہلے سے موجود تھیں۔ سوزین مجھے اس شام کو پہلے سے بھی خوبصورت لگی۔ جب ہم دونوں نے مل کے کھانا کھایا اور خود ہی میزبان سے مہمان بن گئے۔ باہر کی دھند کو بھی اپنے میں شامل کر لیا۔ بالکونی میں گلاس لے کر ہم ہنستے گئے۔ دور سے کوئی گاڑی آ رہی تھی، کوئی جا رہی تھی۔ یونیورسٹی کی لڑکیاں بھاگتی ہوئی شرارتی انداز سے ایک دوسرے کو چھیڑتی ہوئی گذر رہی تھیں۔ کوئی سائیکلوں پر آ جا رہے تھے اور اب رات پھیل چکی تھی۔ ہم دونوں کھانے پر آئے تو لاہوری مچھلی کا تو میں عاشق تھا وہ بھی فریفتہ ہو گئی۔ سلاد اور پرانز نے ہم دونوں کی ٹھنڈی رات کو گرما دیا۔ آخر میں جب شیمپئن کا تڑکا لگا تو میں سوزین کو پیار سے بالکونی سے اندر لے گیا اور اُس نے مجھے نہیں میں نے اُسے بوسے دیئے اور پھر ہم بستر میں چلے گئے ـــــ

اگلی صبح وہ بستر سے جلدی اُٹھ گئی۔ میں سویا رہا۔ جب اٹھا تو دیکھا پورا کچن صاف تھا۔ ڈائننگ ٹیبل صاف تھی اور وہ غائب تھی۔ میں سوزین کو جانتا تھا وہ کہاں ہو گی؟ وہ باہر گھوم رہی تھی۔ میں نے ہاتھ ہلا کے اُسے بتایا کہ ناشتہ میں بنا رہا ہوں۔ اُس نے کہا میں آتی ہوں۔ اب میرا کام شروع ہو گیا۔ میں نے پنیر، زیتون، شہد، ڈبل روٹیاں اور انڈے دو طرح کے بنا کر میز پر لگا دیئے اور جوس بھی رکھا اور وہ آئی۔ ہم نے ناشتہ کیا اور اُس نے کہا۔ ''اب ہم کل شام سے پہلے نہیں ملیں گے۔''

جن دنوں کی یہ بات ہے۔ ان دنوں جرمنی میں بچوں کی شرح پیدائش اتنی نیچے آ گئی تھی کہ جرمن حکومت نے بچوں کی پیدائش پر والدین کے لئے بچہ الاؤنس کے ساتھ اس کی تعلیم اور دیگر اخراجات کی ذمہ داری لینے کا اعلان کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یورپی ملکوں میں شادی کا ادارہ قابل اعتبار نہیں رہا تھا۔ طلاقوں کا تناسب بہت بڑھ گیا تھا۔ عورتوں اور مردوں نے شادی کے بغیر ساتھ رہنے کا نیا معاشرتی سمجھوتہ متعارف کرا دیا۔ اس میں بچے کے پیدا ہونے کا معاہدہ شامل نہیں تھا۔ جو جب تک ساتھ رہنے کے پابند ہوتے ہیں اُس وقت تک کچھ اصولوں پر عمل کرتے ہوئے ساتھ رہتے ہیں۔ اس میں دیانت داری پہلی شرط ہوتی ہے۔ لڑکا اور لڑکی یا عورت اور مرد اس دوران کسی اور کے ساتھ تعلقات پیدا نہیں کر سکتے۔ اور اگر اس کا کوئی امکان پیدا ہو جائے تو پھر وہ معاہدے سے باہر چلے جاتے ہیں۔ اس میں بچوں کو پالنے اور ذمہ داری نبھانے کا جھنجھٹ نہیں

رہتا۔ اسی معاہدے کے تحت میں اور سوزین یہاں رہ رہے تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی ذمہ داری نہیں تھے۔ ایک دوسرے کو ریسرچ میں مدد ضرور دیتے تھے اور باقی معاملات میں برابر کی شراکت موجود تھی۔ اس لئے ہم دونوں کے ماہانہ بجٹ بھی گڑبڑ نہیں ہو رہے تھے۔ یورپ میں کھانا پینا تو ویسے بھی سستا ہوتا ہے۔ ہمارے معاملے میں ایک آدمی پر جتنا خرچہ آنا چاہئے تھا، اس میں دولوگ آسانی سے گذارا کر سکتے تھے۔ اب موسم سرما آہستہ آہستہ سرک رہا تھا اور ہوا میں خوشبو پھیلنے لگی تھی۔ رنگ برنگے پتوں اور پھولوں نے ہر طرف بسیرا کر لیا تھا۔ یہ موسم بہار کی آمد کا اعلان تھا اور ہمیں معلوم تھا کہ گرمیاں شروع ہونے سے پہلے ہمیں اپنی ریسرچ مکمل کر کے یونیورسٹی کے حوالے کر کے اپنے اپنے ملک چلے جانا ہے۔ تو ایسے میں ہم ایک طرف تو اپنا کام مکمل کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کرنے لگے اور دوسرے زیادہ سے زیادہ وقت ساتھ گذارنے لگے۔ ایک ویک اینڈ پر وہ آسٹریا گئی۔ میں ساتھ نہیں جا سکا۔ اُسے وہاں سے اپنی پراپرٹی کا کچھ حصہ فروخت کرنا تھا کہ وہ اپنے مستقبل کے لئے کچھ پلاننگ کر رہی تھی۔ میں نے کچھ نہیں پوچھا کہ اُس کے اِس مستقبل سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ بعد میں ظاہر ہوا کہ اس مستقبل سے میرا بھی تعلق بننے والا تھا ـــــ وہ ایسے کہ سوزین کچھ دنوں کے لئے مجھ سے دور ہوگئی۔ میں سمجھا ریسرچ کے لئے اِدھر اُدھر چلی گئی ہوگی۔ میں بھی لائبریری میں کئی کئی گھنٹے لگانے لگا۔ رات کو تھک کے دو تین ڈرنک لے کر سو جاتا تھا۔ صبح پھر مجھے لائبریری جانا ہوتا تھا۔ ایسے میں سوزی کی مجھ سے دوری نے کچھ اندیشہ یا فرق پیدا نہ ہونے دیا ـــــ

ایک شام مجھے سوزین یونیورسٹی کی مارکیٹ میں ملی۔ کچھ خریداری کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''کہاں ہیں آپ'' اس سے زیادہ میں کوئی حق نہیں رکھتا تھا کہ کوئی گلہ کروں ـــــ اُس نے ہنس کے کہا۔ ''تمہیں موقع دے رہی تھی۔ مجھ سے الگ رہنے کی عادت ڈالنے کے لئے۔'' میں چونکا کہ سوزین ہمارے یہاں رہنے کی مدت پوری ہونے سے پہلے تو الگ ہونے کا فیصلہ نہیں کر چکی۔ میں نے کہا۔ ''سوزین الگ ہونے کی اتنی جلدی کیا ہے؟ مجھ سے ناراض ہو؟'' وہ ہنسی اور کہا۔ ''اب باقی کتنے دن رہ گئے ہیں۔ چلو چند مہینے اور بس ـــــ تو الگ ہونے کی تیاری تو دونوں کو کرنی چاہئے۔''

میں اب بھی کچھ نہ سمجھا، اتنا کہا۔ ''کب آ رہی ہو ڈنر پر؟'' اُس نے کہا۔ ''کل ہم تمہارے اپارٹمنٹ میں شام گذاریں گے اور تم نے دال چاول بنانے ہیں۔ وہ جو تم بناتے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں، صرف دال چاول نہیں اور بھی کچھ بناؤں گا۔ تم سلاد بنا کے لانا۔''

اب اگلے دن کا انتظار تھا۔ میں نے دال چاول کے ساتھ لیمب کی چانپیں بنائیں۔ ساتھ میں چکن روسٹ بھی تیار کیا۔ اندر سے میں وسوسے میں تھا کہ سوزین کی باتوں سے محسوس ہوا وہ پہلے جیسی سوزین نہیں تھی۔ اور میرے لئے یہ بات بہت اہم تھی کہ مجھ سے ایسا کیا ہوا ہے کہ وہ مجھ سے الگ رہنا چاہتی ہے۔ یا وہ پہلے جیسی گرم جوشی ظاہر نہیں کر رہی۔ میں سوچتا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ میں کوئی خواب بھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ نہ میں کوئی عشق افورڈ کر سکتا تھا۔ بس یہ تھا کہ ہم دونوں اس طرح ایک دوسرے سے جدا ہوں کہ دونوں طرف کوئی ملال نہ رہے جو دونوں کی آئندہ کی زندگیوں پر اثر انداز ہو۔ اس لئے میں نے اُس شام کو سوزین کے لئے ڈنر تیار کیا۔ ڈرنکس بھی سجا دیں۔ مجھے معلوم تھا سوزین کیا پسند کرتی ہے۔ میں نیچے سڑک پر دیکھنے لگا کہ سوزین کب آتی ہے۔ یہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں کیوں ایسا کر رہا تھا۔

آخر اس کا جلدی فیصلہ ہو گیا۔ ڈنر کے دوران جلد ہی وہ لمحہ آ گیا جب اُس نے ڈرنک لیتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا بہت شکریہ تم نے مجھے مکمل کر دیا۔'' ابھی میں اس کا مطلب سمجھ ہی رہا تھا کہ وہ بولتی چلی گئی۔ ''اُس دن آسٹریا کے گاؤں میں جب میں چرچ میں گئی تھی تو تم نے پوچھا تھا کیا مانگا؟ کیا پیسے کم ہو گئے تھے تو میرے پاس تھے۔ میں نے کہا تھا۔ نہیں کچھ اور مانگا ہے۔ تو جو مانگا تھا مجھے مل گیا ہے۔ میں نے آپس کے معاہدے میں تھوڑی سی بے ایمانی کی ہے۔ مجھے معاف کر دینا۔ میں جب تم سے ملی اور ہم نے ایک ساتھ بہت وقت گذارا تو مجھے اندازہ ہوا کہ تم سے بہتر بوائے فرینڈ شاید ہی کبھی مجھے مل سکے گا تو میں نے یہ سلسلہ بند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اب میری زندگی میں کوئی بوائے فرینڈ نہیں آئے گا۔ اس لئے میں نے ماں بننے کا فیصلہ کیا اور اب میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔'' ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ یہ خبر سامنے آئے تو میں کیا کہوں گا یا محسوس کروں گا۔ زندگی میں یہ پہلی بڑی خبر تھی جو مجھے مل رہی تھی۔ میں نے بس اتنا کہا۔ ''لیکن میں تو اس ذمہ داری کے لئے بالکل تیار نہیں ہوں۔ مجھے تو ابھی زندگی میں خود کو اس قابل بنانا ہے کہ فیملی کو سنبھال سکوں۔''

''آپ کو کوئی ذمہ داری نہیں لینی۔ میں اُس کے لئے بہت کچھ کر سکوں گی۔ کیونکہ یہ میری خواہش سے ہو رہا ہے۔ یہ اچانک کوئی حادثہ نہیں ہوا۔ مجھے یہ بچہ چاہئے تا کہ میں اُس کے ساتھ زندگی گذار سکوں اور اُسے دینے کے لئے میرے پاس بہت کچھ ہے۔ آپ اگر اُسے اپنا نام دے دیں تو مجھے بہت خوشی ہو گی۔ وہ آپ کے نام کے ساتھ رہے گا اور اگر نہیں دینا چاہتے تو کوئی بات نہیں ـــــ''

میں نے سوزین کو دیکھا۔ مجھے اُس کی ایک ایک بات میں سچائی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے فوراً ہی فیصلہ کیا کہ ہمارا یہ رشتہ جھوٹ پر مبنی نہیں تھا۔ یہ ہم دونوں کی مرضی تھی کہ ہم ایک ساتھ رہیں اس لئے میں اس بچے کو اپنا نام دوں گا۔ تم اُسے میرے متعلق سب بتا سکتی ہو۔ البتہ میں جس سے بھی شادی کروں گا۔ شاید اُسے یہ بات نہ بتا سکوں۔"

یہاں تک میں نے آنس کی ڈائری پڑھی تو سوچنے لگی اگر وہ یہ سب شادی سے پہلے بتا دیتے تو کیا میں اُن سے شادی کرتی؟ مگر وہ کیوں بتا دیتے؟ کوئی بھی شوہر یا بیوی ایک دوسرے سے اس طرح کے سچ نہیں بول سکتے ورنہ رشتہ چل نہیں سکتا۔ شوہر اور بیوی کا رشتہ ہمیشہ اسی منافقت سے کامیاب رہ سکتا ہے۔ اب معلوم ہوا آنس سوزین کا ذکر کیوں کرتے تھے اور پھر یہ کیتھرین کون ہے؟ یہ ایک اور راز تھا جس کی مجھے خبر لینی تھی۔ ایسی کوئی یادداشت ایسی ہی کوئی ڈائری اور بھی ہو سکتی تھی۔ یقیناً لندن کے ایک سال کے دوران بھی کوئی واقعہ ہوا ہوگا۔ اُس کے بعد آنس سے میری ملاقاتیں ہوئی تھیں اور ہماری شادی ہو گئی تھی۔ میں نے اس ڈائری کو اب اور پڑھا تو لکھا تھا۔

"میں نے سوزین کو کبھی فون نہ کیا۔ البتہ اُس کے خط کا انتظار تھا۔ آخر اس کا خط آ گیا جس میں ایک تصویر بھی تھی۔ یہ اُس کی بیٹی کی تصویر تھی۔ اُس نے لکھا کہ میں نے اس کا نام جیسمین رکھا ہے جو پھول کا نام ہے۔ جب یہ بڑی ہو گی اپنے مذہب کا خود ہی فیصلہ کرے گی۔ میں نے اُسے اپنی طرف سے کوئی مذہب نہیں دینا ـــــ میرے لئے وہ یاسمین تھی۔ جوں جوں وہ سکول سے کالج تک گئی، اس کی تصویریں مجھے ملتی رہیں ـــــ گویا سوزین یہ چاہتی تھی کہ میں اسے اپنی بیٹی کے طور پر جذباتی طریقے سے محسوس کرتا رہوں اور شاید میں نہ چاہتے ہوئے بھی کر رہا تھا۔ البتہ میری یاسمین سے کبھی بات نہیں ہوئی۔ میں یہ تعلق جوڑنا نہیں چاہتا تھا کہ میں اُسے کچھ بھی دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا ـــــ سوزین کا آخری خط یہ آیا تھا کہ اب میں خط نہیں لکھوں گی۔ اب جیسمین بڑی ہو رہی ہے۔ ایک دن وہ تم سے ملنے ضرور آئے گی اور شاید مجھے اس کے آنے کا انتظار ہے۔"

یہاں آنس کی ڈائری ختم ہو گئی اور اب میری ڈائری شروع ہوئی کہ میں ساری زندگی ایک منافقت کی چادر اوڑھے گذارتی رہی۔ ایک کہانی لکھنے والی رائٹر جو دوسروں کی منافقت کو بے نقاب کرتی ہے وہ خود منافقت میں زندہ ہے۔ اب جو میں نے مڑ کے دیکھا تو مجھے اپنی جیسی کئی رائٹرز اسی منافقت میں زندہ

رہیں ـــــ ایک نام نہیں ہے۔ کئی نام ہیں ـــــ خالدہ حسین، فہمیدہ ریاض، زاہدہ حنا تو سامنے کی باتیں ہیں اور میری جیسی خاموش رائٹرز تو شاید بے شمار ہوں گی۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ آنس تو اپنی زندگی کے گذارے سالوں کو تاش کے پتوں کی طرح شفل کرتا رہتا ہے۔ کب کون سا سال کون سا واقعہ سامنے آ جائے۔ کسی کو معلوم نہیں ـــــ میں آنس کے پاس اُن کے لکھنے کے کمرے میں گئی تو وہ پھر کسی سے باتیں کر رہے تھے اور وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے سنا وہ کہہ رہے تھے۔

''تم نے آنے میں دیر کر دی۔ تمہاری ماں نے تو مجھے بہت پہلے بتایا تھا کہ اب تم کالج میں جا رہی ہو اور مجھ سے ملنے کسی بھی وقت آ سکتی ہو۔ جیسمین تم نے دیر کیوں کر دی؟ میں شرمندہ ہوں کہ تمہیں وہ سب نہیں دے سکا جو اپنی اولاد کو دیا جاتا ہے۔ عجیب سا رشتہ تھا تمہاری ماں کے ساتھ۔ میں تو حیران ہوں کہ یورپ میں یا دنیا کے کسی بھی ملک میں اس طرح کا رشتہ رکھا تو جا سکتا ہے اور پھر زندگی بھر اُس کا قرض بھی تو اُتارنا پڑتا ہے۔ تم میرا قرض ہو جسے میں اُتار نہیں سکا ـــــ جیسمین میں قبر میں اس قرض کے بوجھ کے ساتھ جاؤں گا۔ جیسمین تم نے کون سا مذہب پسند کیا ہے؟ میں نہیں پوچھوں گا کہ سب مذہب ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ شرط اُن پر عمل کرنے کی ہوتی ہے۔ جیسمین مسلمانوں میں ایک اچھی بات ہوتی ہے کہ جب کوئی فوت ہو جاتا ہے تو اُس کی نمازِ جنازہ پڑھائی جاتی ہے۔ اور نماز کے بعد جو وارثوں میں سب سے قیمتی رشتہ ہوتا ہے، بیٹے کا بھائی کا یا چچا کا تو وہ اعلان کرتا ہے۔ ''حضرات اگر کسی کو اس میت سے کوئی قرض لینا ہو تو وہ مجھ سے رابطہ کرے۔ اُسے اُس کا قرض ادا کیا جائے گا۔ کوئی کسی قسم کا لین دین ہو تو اسے معاف کر دیں۔ ہم وہ لین دین پورا کریں گے۔ اب میرا وہ قرض جو تم پر ہے۔ وہ کون ادا کرے گا یا سمین۔ بتاؤ؟''

''میں ادا کروں گی آنس۔ میں۔ اس لئے کہ میں نے آپ کی ڈائری پڑھ لی ہے۔ آپ نے لکھ کر کتابوں میں کہیں رکھی تھی، مجھے مل گئی۔ آپ نے رکھی ہی اس لئے تھی کہ میں پڑھ لوں۔ اس لئے کہ آپ میں جرأت نہیں تھی کہ میرے روبرو وہ سب بتا سکیں۔ آپ نے تحریر کا سہارا لیا اور میں نے وہ پڑھ لی۔ آنس اب آپ کو یہ قرض نہیں چکانا۔ میں چکاؤں گی اگر میں زندہ رہی۔''

آنس نے مجھے دیکھا اور کہا۔ ''یاسمین آئی ہے۔''

''نہیں میں نے تو نہیں دیکھا۔ کون یاسمین؟'' میں نے کہا۔

''میری بیٹی جس کا قرض اتارنے کی آپ نے بات کی ہے۔'' آنس نے کہا۔

''آپ باتیں کر رہے تھے۔ میں نے اُسے نہیں دیکھا۔'' میں نے کہا۔

''ہاں وہ آئی تھی اور چلی گئی۔'' آنس نے کہا۔

''نہیں وہ گئی نہیں وہ یہاں رہنے کے لئے آئی ہے اور میں یاسمین کو سینے سے لگا کر رہوں گی۔''

''مگر یاسمین ہے کہاں؟''

''وہ میری روح میں آ گئی ہے۔ آپ نے جسے مجھ سے چھپایا وہ میری آغوش میں آ چکی ہے۔ مگر تم نہیں سمجھ سکتے۔''

''ہاں مگر یاسمین ہے کہاں؟''

''کہا تو ہے آپ نے اُسے مجھے گود دے دیا ہے۔''

''کیتھی کہاں ہے؟ میرا خیال ہے وہ بھی آئی تھی۔''

''کیتھی کون ہے؟''

''کیتھی، کیتھرین ہے۔ مجھے لندن میں ملی تھی۔ میں کل گیا تھا لندن یونیورسٹی کے سکول آف اورینٹل اینڈ ایفریقن سٹڈیز میں۔ اُسے ڈھونڈتا رہا نہیں ملی۔ سنا ہے اپنے قبیلے کے پاس تنزانیہ چلی گئی ہے۔''

''آپ کو وہ لندن کے اس سکول میں ملی تھی؟''

''کون؟''

''کیتھی۔ جس کی آپ بات کر رہے تھے۔''

''کیتھی کہاں ہے؟ آئی تھی؟''

''نہیں، آپ جو اس سے ملنے سکول آف اورینٹل اینڈ ایفریقن سٹڈیز میں گئے تھے۔''

''میں کب گیا تھا۔ وہ تو مجھے ایک تھیٹر ہال میں ملی تھی۔''

اب میں سوچنے لگی کہ کیتھی کی کہانی بھی کہیں لکھی ہوئی ہے۔ اگر میں آنس سے وہ کہانی معلوم کرتی ہوں تو وہ بھٹکتے پھریں گے۔ وہ تو وقت اور مقام کی قید سے آزاد ہو چکے ہیں اور اپنے ساتھ مجھے بھی وہ اُسی کیفیت میں لے آئے ہیں تو میں نے اچانک پوچھ لیا۔

''کیا آپ نے کیتھی سے اپنی ملاقات کی کہانی کسی ڈائری میں لکھی ہے؟''

''ڈائری ـــــ ہاں تو وہ تو میں نے بہت پہلے لکھ دی تھی۔ سوزین کی ڈائری اور کیتھی کی ڈائری تم

نے پڑھ لی؟''

''نہیں، کیتھی کی ڈائری کہاں پڑی ہے۔''

''میں کہاں ہوں؟ میں لندن میں ہوں یا جرمنی میں؟''

''آپ پاکستان میں ہیں، اپنے گھر میں ہیں۔''

''اچھا تو پھر کیتھی کہاں ہے؟ میں نے اُسے بہت ڈھونڈا ہے۔''

اب میں سمجھ گئی تھی کہ کیتھی کہیں اور نہیں ہو سکتی۔ آنس کی لائبریری کے کسی دراز میں ہو گی۔ میں نے آنس سے کہا۔ ''کیتھی مل جائے گی۔ وہ ضرور آپ سے ملنے آئے گی۔ وہ تنزانیہ چلی گئی تھی جب آئے گی تو وہ آپ سے ضرور ملنے آئے گی۔''

''ہاں، وہ دیکھو ڈاکٹر مبارک علی کبھی ملنے نہیں آیا۔ سنا ہے اُس کی آنکھوں کا مسئلہ ہے۔ میرا بھی تو مسئلہ چل رہا ہے یادداشت کا۔ تو ڈاکٹر مبارک سے کہو بھائی ہم سب کی آخری ریل چل رہی ہے۔''

''ہاں ہاں ڈاکٹر صاحب ضرور آئیں گے۔ وہ آج کل اپنی بیٹی کے ساتھ باہر آتے جاتے ہیں۔''

''اچھا تو میری بیٹیاں کہاں ہیں؟''

''آپ کی دونوں بیٹیاں خوش ہیں۔ ایک لندن میں ہے۔ دوسری کینیڈا میں ہے اور جیسمین کا مجھے پتہ نہیں ہے۔''

''ہاں کیا جیسمین آئی تھی ملنے؟ وہ ایک دن ضرور آئے گی ملنے۔''

''آپ کو اپنی دونوں بیٹیاں یاد ہیں؟''

''کیا مطلب؟ کیوں یاد نہیں۔ تم نے یہ کیوں پوچھا؟''

''اس لئے کہ آپ کو کبھی وہ یاد نہیں آئیں۔''

''مگر کیوں یاد نہیں آئیں؟ وہ تو ہر وقت میرے ساتھ ہوتی ہیں۔''

''آنس آپ اکثر جیسمین کو یاد کرتے ہیں۔ سوزین کو یاد کرتے ہیں اور اب کیتھی کو یاد کرتے ہیں۔''

''یاد اُن کو کیا جاتا ہے جن کو بھول جانا ہوتا ہے۔ کیتھی بھی ایسا ہی کردار ہے جو میری زندگی میں آیا۔ ایک لندن ڈائری کے نام سے میری ڈائری رکھی ہے۔ پڑھ لو۔ کہانی کار ہو مجھے سمجھنے میں مدد ملے گی۔ انسان محض ایک حادثے پر زندہ رہتا ہے۔ ہم سب اپنی اپنی زندگی کے حادثے ہیں۔''

وہ خاموش ہو گئے۔ میں ایک دن کچھ تلاش کر رہی تھی تو وہ ڈائری مل گئی۔

''لاہور۔۔۔۔ ہاں میں جرمنی سے لاہور واپس آ گیا۔ سوچ رہا تھا کسی یونیورسٹی میں پڑھانے لگوں یا کسی تاریخ کے ادارے میں بیٹھ جاؤں اور تاریخ پر جمی ہوئی گرد جھاڑ کر تاریخ کو دیکھوں۔ اور سرکاری تاریخ کو مانجھ کے، قلعی کر کے، چمکا کے شوکیس کروں اور روٹیاں توڑوں۔۔۔۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ ایک بہت بڑے عالمی ادارے کے ایک ریسرچ پروجیکٹ کے لئے انڈیا اور پاکستان کے تاریخ کے ریسرچ سکالرز سے پروجیکٹ آئیڈیاز مانگے گئے۔ فنڈنگ بہت معقول تھی اور لندن کی کسی یونیورسٹی سے منسلک تھی۔ مجھے معلوم تھا عام طور پر انڈیا کے ریسرچ سکالرز اس طرح کے سکالرشپ اور فنڈنگ اُچک لیتے ہیں کیونکہ وہاں تاریخ تو ایسے بکھری پڑی ہے کہ ہر پتھر کے ساتھ تاریخ جڑی ہوئی ہے۔ مجھے یہ بھی پتہ تھا کہ ان کے عام موضوعات میں مغل عہد، راجستھانی راجواڑے، بنگالی تمدن اور لکھنوی زوال وغیرہ شامل رہتے ہیں۔ میں کہیں اور ڈبکی لگانا چاہتا تھا۔ جس میں گندھارا کی جڑوں کو، ہندوستان کی تاریخ میں منگولوں، افغانیوں اور ترکوں سے جوڑتے ہوئے انگریزوں کے تسلط تک آنے کے بعد یہاں کی زبانوں، تہذیبوں، ثقافتوں اور فکری میلانات کے ساتھ جوڑا جا سکے۔ میں نے اس پر کام شروع کر دیا۔ جلد ہی میں پروجیکٹ تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔۔۔۔ جیسے کہ مجھے اپنے کام اور ریسرچ پر بھروسہ تھا۔ مجھے یہ فنڈنگ مل گئی۔ میری تعلیم مکمل ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ میں لندن روانہ ہو گیا۔ جرمنی کے قیام کے دوران دو ایک بار لندن جانے کا اتفاق ہوا تھا۔

لندن۔۔۔۔ اگست کی کوئی تاریخ ہو گی۔ لندن بارشوں میں سانس لے رہا تھا۔ مجھے جس پروفیسر کے ساتھ کام کرنا تھا وہ سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز میں پڑھاتے تھے۔ اس پروجیکٹ میں وہ میرے گائیڈ اور استاد تھے۔ میرے ساتھ ان کے ملنے کا وقت طے ہو چکا تھا۔ یونیورسٹی میں میرے جیسے ریسرچ سکالرز کو اپنی رہائش کا خود بندوبست کرنے کو کہا گیا۔ اس لئے کہ اس پروجیکٹ کی فنڈنگ میں سارے خرچے شامل ہوتے ہیں۔ میں لندن پہنچ کے کسی دوست کے ہاں چند دنوں کے لئے ٹھہر گیا۔

اگلے روز میں ''سواس'' پہنچا جو سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز لندن یونیورسٹی کا مخفف تھا۔ یونیورسٹی آف لندن کا یہ سکول دنیا میں بے حد مشہور ہے اور یہاں پوری دنیا سے طالب علم ادب، زبانوں، تاریخ، کلچر اور سماجی و تہذیبی علوم کے لئے داخلہ لیتے ہیں۔ ''سواس'' میں ماحول اور طلباء کی

سرگرمیاں دیکھ کر اپنی قسمت پر رشک آیا کہ کیسا سکالرشپ ملا ہے کہ اب میں یہاں سے ساؤتھ ایشیا کا اہم مؤرخ بن کے نکل سکتا ہوں۔

میں مقررہ وقت سے پانچ منٹ پہلے اپنے پروفیسر کے آفس میں پہنچا۔ اُس کی سیکریٹری ایک گوری لڑکی تھی ــــــ اُسے رپورٹ کی تو اُس نے بیٹھنے کو کہا۔ اُس کے سامنے میرے سارے کوائف فائل میں موجود تھے۔ اُسے ہر بات کی اطلاع تھی۔ وہ اندر گئی اور چند منٹ بعد آئی اور مجھے دفتر میں پروفیسر صاحب کے سامنے لے گئی۔ میں نے گڈ مارننگ سر کہا۔ انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر بیٹھنے کو کہا۔ وہ میرے متعلق فائل پڑھ چکے تھے۔ ان کی سیکریٹری بھی وہاں بیٹھ گئیں۔ اب انہوں نے کتاب سے نظر ہٹا کر کہا۔

''تمہیں پتہ ہے تمہارا موضوع کتنا پھیلا ہوا ہے؟''

''جی سر، مجھے معلوم ہے۔''

''یہ ایک مشکل ریسرچ ہے۔''

''سر آپ کی رہنمائی میں یہ آسان ہو جائے گی۔''

''اس طرح کے جواب مجھے مطمئن نہیں کر سکتے۔ سمجھ لو میری رہنمائی نہیں ہو گی۔''

''میں کوشش کروں گا کہ انگلینڈ کی لائبریریوں کو اچھی طرح دیکھوں۔''

''تمہیں پتہ ہے تم نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالا ہے؟''

''جی سر میں جانتا ہوں۔ اور ان بھڑوں کو بھی جانتا ہوں جنہوں نے ہندوستان کو اپنا چھتہ بنایا۔ میں ان بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ضرور ڈالوں گا۔''

وہ چونکے میری طرف دیکھا اور کہا۔

''تاریخ دان کو جانبدار ہونا چاہئے کہ نہیں؟''

''تاریخ دان کو صرف تاریخ دان ہونا چاہئے۔ جیسے شاعر کو صرف شاعر ہونا چاہئے۔''

''اگر آپ دی گئی تاریخ پر یہاں نہ آئے تو میں دوسرا موقع نہیں دوں گا۔ تاریخ دان کے لئے بارش اور طوفان کوئی معنی نہیں رکھتے۔''

''جی سر میں جانتا ہوں۔ مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ چرچل جب دوسری جنگ عظیم میں اگلے مورچوں کا دورہ کر رہے تھے تو اُس رات بہت بارش ہوئی تھی۔ ان کا پاؤں کیچڑ میں دھنس گیا تو انہوں

نے ایک جملہ کہا۔ ''صرف قدرت ہی میری دشمن ہو سکتی ہے ورنہ مجھے کوئی نہیں ہرا سکتا'' اور پھر تاریخ میں وہ بارش ہی جیتی تھی کہ نہیں''۔۔۔۔

اب پھر پروفیسر نے مجھے دیکھا اور کہا۔ ''آپ آج کے بعد غائب نہیں ہوں گے۔ مجھے اپنے کام کی پروگریس سے آگاہ کریں گے۔''

''جی سر، ایسے ہی ہوگا۔''

''اور آخری بات یہ ہے کہ یہ سکالرشپ میری رپورٹ سے رک بھی سکتا ہے اور جاری بھی رہ سکتا ہے۔ ہر تین مہینے بعد میری رپورٹ پر آپ کو فنڈ جاری ہوں گے۔ اب آپ جا سکتے ہیں''۔۔۔۔

''سر میری آخری بات بھی ہے۔''

''ہاں، بتاؤ۔''

''سر میں نے جن لائبریریز اور کتابوں کی لسٹ جمع کرائی ہے۔ اُس کے علاوہ بھی جو کتابیں اور لائبریریز آپ مجھے بتائیں گے، میں نے اُن کو بھی دیکھنا ہے۔''

''ہاں یہ ہو جائے گا۔ تم نے رہنے کا کیا انتظام کیا ہے۔ یونیورسٹی کے پاس اس طرح کے سکالر شپس کے لئے ہوسٹلز میں جگہ نہیں ہوتی۔''

''سر میں پرائیویٹ ہوسٹل میں انتظام کروں گا''۔۔۔۔

''او کے گڈ لک''۔۔۔۔

میں باہر آ گیا اور اب سوچنے لگا کہ کہاں رہنا ہوگا۔ میں سکول کے نوٹس بورڈ کی طرف گیا تو وہاں بے شمار نوٹس، خبریں اور پمفلٹ لگے ہوئے تھے۔ جن میں لندن میں ہونے والی اہم تقریبات کے اعلان تھے۔ یونیورسٹی آف لندن اور اُس کے سکول ''سواس'' میں ہونے والے پروگراموں کی تفصیل تھی۔۔۔۔ مختلف ڈیپارٹمنٹس کی سرگرمیاں اور اعلانات تھے۔ ایک جگہ طلباء کے لئے رہائش کے لئے کچھ معلومات بھی تھیں۔ جو میں تلاش کر رہا تھا۔ میری خواہش تھی کہ یونیورسٹی کے اس سکول کے قریب ہی کوئی اپارٹمنٹ مل جائے یا کسی کے ساتھ شراکت داری میں کمرہ مل جائے کہ اچانک ایک اعلان پر نظر پڑی۔ لکھا تھا۔

''لندن یونیورسٹی کے سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز کے ایک طالب علم کے لئے ایک قریبی اپارٹمنٹ میں شراکت کی بنیاد پر ایک کمرہ کرائے کے لئے خالی ہے۔ شراکت ایک افریقی لڑکی کے

ساتھ ہوگی۔فوراً رابطہ کریں۔''

میں نے سوچا کہ یہ اپارٹمنٹ یونیورسٹی کے اس سکول کے بے حد قریب ہے۔ میرے لئے موزوں ہے۔ میری بلا سے افریقی لڑکی رہے یا کوئی روسی لڑکی ــــ میں فوراً اُس دفتر میں پہنچ گیا اور اُس اپارٹمنٹ کے حوالے سے معلومات حاصل کیں۔ اگلے دن انہوں نے اُس افریقی لڑکی کو بھی بلا لیا اور مجھے بھی ــــ وہ آئی۔ اُس کا قد لمبا تھا، جسم سمارٹ اور لگتا تھا کہ جم میں روزانہ جاتی ہے۔ گردن لمبی تھی۔ جس سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ کسی ایسے افریقی قبیلے سے ہے جو پیدا ہونے کے بعد لڑکیوں کے گلے میں طوق ڈال دیتے ہیں۔ حقیقت تو بعد میں ثابت ہونی تھی۔ وہ کیتھرین تھی اور ایفریقن سٹڈیز میں ریسرچ کرنے آئی تھی۔ میں اورینٹل سٹڈیز میں تھا۔ ایک شرائط نامہ پر ہمیں دستخط کرنے تھے۔ پہلی شرط یہ تھی کہ اپارٹمنٹ میں سگریٹ، تمباکو پینا منع ہے۔ دوسری یہ تھی کہ کسی دوست یا رشتہ دار کو اندر لانے کی اجازت نہیں ہے۔ نہ کوئی ٹھہر سکتا ہے۔ ملنا ہو تو نیچے آفس میں ملا جا سکتا ہے۔ تیسری یہ تھی کہ شراب پی کر اونچا بولنے یا دوسرے کے آرام میں مداخلت کرنے پر فوری طور پر پولیس کو بلایا جائے گا اور پھر اپارٹمنٹ اُسی وقت چھوڑنا پڑے گا۔ چوتھی یہ تھی کہ ایک دن کوڑے کا تھیلا ایک کو نیچے رکھنا ہو گا دوسرے دن دوسرے کی باری ہو گی۔ کچن، ڈائننگ اور بیٹھنے کا لاؤنج مشترک ہو گا۔ باتھ روم الگ الگ اپنے اپنے کمروں کے ساتھ ہوں گے۔ ہم نے دستخط کئے اور شام کو میں سامان لے کر پہنچ گیا ــــ

لندن کی یہ ایک ٹھنڈی شام تھی۔ میں نے کمرہ دیکھا۔ مناسب تھا۔ کھڑکی سے باہر نیچے یونیورسٹی کا علاقہ ہونے کی وجہ سے خاصی چہل پہل تھی۔ گراسری سٹور، شراب کی دکانیں اور پب موجود تھے۔ ایک ایرانی ریسٹورنٹ سے میں نے شام کا کھانا لے لیا اور سوچنے لگا کہ کیتھی کے ساتھ رہنے کا کیا تجربہ ہو گا۔ میں لاؤنج اور ڈائننگ میں کھڑکی کھول کے باہر کی رونق دیکھ رہا تھا۔ مجھے معلوم ہوا میرے اپارٹمنٹ کے عین نیچے بس سٹاپ ہے۔ جہاں سے میں لندن کی کسی بھی جگہ جا سکتا تھا۔ انڈر گراؤنڈ سٹیشن بھی زیادہ دور نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا۔ شام کی ڈرنک لے آؤں یا کیتھی سے بھی پوچھ لوں ــــ کہ اچانک لاؤنج میں کیتھی داخل ہوئی۔ اُس کے جسم پر صرف زیرِ ناف ایک چھوٹا سا کپڑا تھا اور کمر کے گرد ایک ڈوری نے اُسے تھام رکھا تھا۔ باقی جسم پر کچھ نہیں تھا۔ دو جاندار چھاتیوں کے بیچ ایک ہار جھول رہا تھا جس میں قیمتی پتھر لگے ہوئے تھے۔ کانوں میں بالیاں چمک رہی تھیں اور کیتھی کا جسم کسا ہوا اس لئے تھا کہ اُسی

شام اُس نے بتایا وہ ایک گھنٹہ جم میں جاتی ہے۔ میں اُس کے اس طرح اندر آنے پر تیار نہیں تھا۔ مجھے لگا وہ غلطی سے اندر آ گئی ہے۔ مگر ایسا نہیں تھا ــــ میں نے نگاہیں اس کی چھاتیوں پر پڑنے نہیں دیں۔ وہ مسلسل یہی دیکھ رہی تھی کہ میرے اندر کے مرد میں کتنی شرافت اور کتنی بدمعاشی ہے۔ وہ سامنے صوفے پر بیٹھ گئی اور کہا۔

''میں اپنے اپارٹمنٹ میں اسی طرح رہتی ہوں۔ تم آ گئے ہو تو میں تمہاری وجہ سے خود پر غلاف نہیں چڑھا سکتی۔ میں افریقہ کے ایسے قبیلے سے ہوں جہاں مرد اور عورتیں لباس نہیں پہنتے۔ میری ماں مجھے گود میں اٹھائے جب پھرتی تھی تو میں اپنا منہ نیچے کر کے اُن کی چھاتی سے دودھ پینے کی کوشش کرتی تھی۔ جیسے شیرنی کے بچے بھاگتے دوڑتے ماں کے تھنوں سے جُٹ جاتے ہیں ــــ ہم جانوروں کے ساتھ رہتے ہیں۔ ہمارا قبیلہ مویشی پالتا ہے اور جنگلوں میں بسیرا کرتا ہے۔ جانور بھی کوئی لباس نہیں پہنتے اور نہ ہی وہ اپنے ساتھ جانور کا ریپ کرتے ہیں۔ ہمارے قبیلے میں بھی کوئی ریپ نہیں کر سکتا۔ جانور کبھی بھی ریپ نہیں کر سکتے۔ جب اُن کی مادہ کا دل چاہے گا تو وہ خود ہی اس کے سامنے بیٹھ جائے گی۔ اور وہ اس سے ملاپ کر کے چلا جائے گا۔ لیکن شیر جوڑے بنا کر رہتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی ایک شیرنی کے لئے دو شیر آ جاتے ہیں اور پھر دونوں میں مقابلہ ہوتا ہے۔ جو جیت جاتا ہے شیرنی اُسے غرور سے دیکھتی ہے اور پھر وہ اس کے قریب آ کر اس کے بے شمار بوسے لیتا ہے۔ اس کے چہرے کو زبان سے چاٹتا ہے۔ شیرنی اس کے سامنے بیٹھ جاتی ہے اور وہ اس کی گردن کو منہ میں لے کر اس کے ساتھ ملاپ کرتا ہے اور پھر فارغ ہو کر بھاگ نہیں جاتا۔ دیر تک اس کے جسم کو چاٹتا ہے اور جب تک وہ بچے نہیں دیتی اس کی حفاظت کرتا ہے۔ کیا تم انسانوں کا معاشرہ ایسے اصولوں پر کاربند ہے؟ اگر نہیں ہے تو پھر کبھی جنگل کے قانون کا حوالہ دے کر لاقانونیت سے اُسے تشبیہ نہیں دینا کہ جنگل کا قانون تمہارے مہذب معاشروں سے بہت بہتر قانون ہوتا ہے۔'' میں سنتا رہا اور اس دوران ایک بار بھی میری نظر اُس کی تھل تھل کرتی چھاتیوں پر نہیں گئی۔ مگر اُس نے وضاحت کر دی۔

''یہ میری چھاتیاں میرے جسم کا حصہ ہیں۔ جیسے یہ گردن، یہ بازو، یہ ٹانگیں۔ یہ میں نے کہیں سے لا کر یہاں نہیں چپکائیں۔ یہ میرے جسم کے ساتھ پیدا ہوئی ہیں۔ میں اسی طرح قبیلے میں بڑی ہوئی تھی، سب کے سامنے۔ کسی نے میری رس بھری چھاتیوں کو للچائی نگاہوں سے نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے میں تمہارے سامنے ایسے آ گئی ہوں کہ تم میرے جسم میں جھانکتے نہ رہو ــــ بس دیکھ لو ــــ عورت کا جسم ایسا

ہوتا ہے۔ میں جب چھٹیاں گذارنے اپنے قبیلے میں جاتی ہوں تو وہاں میں اُن جیسی ہو جاتی ہوں۔''

اب مجھے موقع مل گیا کہ میں اس سے بات کروں۔ تو میں نے کہا۔'' مجھے کوئی سرپرائز نہیں ملا۔ عورت کا جسم میں نے دیکھا ہوا ہے۔ مجھے کوئی گدگدی نہیں ہوئی ___ مجھے تمہاری سچائی بہت اچھی لگی ہے۔ میں نے ڈاکیومینٹریز میں اس طرح کے افریقی قبائل دیکھے ہیں اور اب تو ٹیلی وژن پر ان عورتوں کے آپ کی طرح کے جسم دکھائے جاتے ہیں۔ میں تاریخ کا طالب علم ہوں اور ہزاروں سالوں کی تاریخ میں قبیلوں، نسلوں اور علاقوں کی ثقافت اور تمدن کو دیکھنا میری ذمہ داری ہے۔ اس لئے سمجھ لو کہ اس اپارٹمنٹ کو شیئر کرنے کے لئے تمہیں صحیح ساتھی ملا ہے۔ تم جیسے رہنا چاہتی ہو رہو۔ لیکن کچھ باتیں تو بتا دو ___ لیکن شام نکلی جا رہی ہے۔ میں شام کو ڈرنک لیتا ہوں۔ تم لو گی؟''

''دیکھو ہمارا قبیلہ اپنی ڈرنک خود بناتا ہے۔ مگر اب وہ یہاں تو نہیں آ سکتی۔ وہ مختلف سبزیوں، پھلوں اور جڑی بوٹیوں کے ملاپ کو کشید کر کے جو ڈرنک بناتا ہے وہ تمہاری سکاچ، وہسکی نہیں بنا سکتی۔ لیکن اب یہاں جو ہے وہ میرے لئے بھی لے آؤ ___ لیکن ایک بات سن لو۔ ہم دونوں کچن شیئر کر رہے ہیں تو میں تمہیں بتا دوں کہ کچن میں جو کچھ پڑا ہو گا وہ مشترک ہو گا۔ ورنہ ہم نہیں رہ سکیں گے۔ جو آپ لائیں گے یا میں لاؤں گی تو اُسے ہم دونوں جب چاہیں گے استعمال کر سکیں گے۔''

''یہ بات میں آپ سے کہنا چاہتا تھا کہ کچن ہم دونوں کا ایک جیسا ہے۔ اب میں آپ کی ڈرنک لاتا ہوں۔''

میں نے ڈرنک بنائی اور لے آیا۔ اس نے گلاس لیا اور ہم نے گلاس ٹکرائے۔ میں نے کہا۔'' یہ ڈرنک میں نے بنائی ہے۔ باقی آپ خود لیں گی۔ کچن میں سب کچھ رکھا ہے۔''

اُس نے ڈرنک لی اور ہم دونوں میں جو رشتہ اس شام قائم ہونا ضروری تھا، ہو گیا۔ اب میں نے پوچھا۔'' کیتھی! تم یہاں ایفریقن سٹڈیز میں کیسے آ گئیں؟''

اُس نے کہا۔'' میں یہ بتانا چاہتی تھی کہ اپنے قبیلے سے یہاں تک کا سفر کیا ہے؟ ___ ہمارا قبیلہ جنگلوں میں رہتا ہے۔ موسم کے حساب سے جانوروں کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ جانوروں میں گائیں، بیل، بکریاں، بھیڑیں، کتے، مرغیاں، مرغابیاں اور گھوڑے ساتھ ہوتے ہیں۔ میں بچپن ہی میں گردن میں لوہے کا طوق پہنے ہوئے پھرتی تھی اور میرے بازوؤں پر بھی لوہے کی چوڑیاں چڑھا دی گئی تھیں۔ جس کا

مقصد یہ تھا کہ میری گردن لمبی ہو جائے کہ یہ افریقی عورتوں کے لئے دنیا میں خود کو نمایاں کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح بازوؤں کو بھی مضبوط ثابت کرنے کے لئے یہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اب ایسا ہوا کہ افریقہ میں کئی طرح کی عالمی فاؤنڈیشن کام کر رہی تھیں۔ کوئی صحت کے لئے، کوئی تعلیم کے لئے، کوئی ماحولیات کے لئے، کوئی وائلڈ لائف کے لئے ___ تو ایک دن تعلیم کی فاؤنڈیشن کے لوگ آئے اور انہوں نے ایک کیمپ لگایا۔ یہ جاننے کے لئے کہ چند بچوں کو تعلیم کے لئے منتخب کر کے لے جائیں اور پھر اُن کو مکمل تعلیم دے کر افریقی عوام کے لئے مختلف شعبوں میں اُن افریقی لوگوں کی خدمت پر لگا دیں۔ اس حوالے سے مجھے چن لیا گیا اور میرے والدین کے ساتھ انہوں نے ایک کنٹریکٹ کیا جس میں سب شرائط تھیں اور پھر وہ مجھے لے گئے۔ پہلے افریقہ کے سکول میں پرائمری تعلیم حاصل کی اور پھر امریکہ لے گئے جہاں میں نے سکول، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کی۔ میرے مضامین ہمیشہ سے سوشل سائنس کے رہے کہ میں نہ تو حساب جانتی تھی نہ فزکس نہ کیمسٹری۔ تو مجھے انہوں نے اینتھراپالوجی میں پڑھایا۔ پھر مجھے لندن یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کے لئے داخلہ دلوا دیا۔ یہ سب اُس فاؤنڈیشن کا کمال ہے۔ مجھے واپس جا کر اس تعلیم کا اپنے ملک اور قبیلوں کو فائدہ پہنچانا ہے۔"

اب ہم دونوں ایک دوسرے سے واقف ہو چکے تھے۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ عورت کو بے لباس دیکھ لینے کے بعد وہ جسم انسان کا جسم محسوس ہونے لگتا ہے کسی عورت کا نہیں۔ اب جو ڈرنکس کے بعد ہم نے کھانا میز پر رکھا تو اُس کا بنایا ہوا کھانا تو میں کھا نہیں سکتا تھا۔ خود اُس نے بھی نہ کھایا اور ہم نے ایرانی ریستوران کا کھانا ہی کھایا۔ اب مجھے اپنا مستقبل صاف نظر آنے لگا کہ مجھے اپنے لئے بھی کھانا بنانا ہے اور کیتھی کے لئے بھی کہ اُسے کھانا بنانے سے کوئی شغف نہیں تھا اور قبائل کی عورتیں سبزیوں کو آدھا کچا آدھا پکا بنا کر کھانے کی عادی ہوتی ہیں۔ دوسری طرف میری ریسرچ بے حد مشکل تھی۔ کھانا بنانے کے لئے صرف اتوار کا کچھ وقت ہی ملتا تھا۔ سو میں نے چکن بنانے اور آلو انڈا بنانے تک خود کو محدود کرنا تھا کہ یہ دونوں جلدی تیار ہو جاتے ہیں۔

یونیورسٹی کا یہ سکول چونکہ بیچ لندن میں تھا۔ اس لئے یہاں بھانت بھانت کے طلباء، طرح طرح کی زبانیں، مختلف لباس، دیکھنے سننے کو مل رہے تھے۔ یونیورسٹی کے اس سکول میں سارا دن مختلف پروگرام چلتے رہتے تھے۔ جن کی اطلاع یونیورسٹی کی دیواروں پر ہمیں مل جاتی تھی۔ کہیں موسیقی، کہیں شاعری، کہیں

رائٹرز کی گفتگو، کہیں سیاسی مذاکرہ، کہیں کسی مؤرخ کا لیکچر، یہ سب چل رہا تھا۔ اور پھر لندن میں جو سرگرمیاں شہر میں ہو رہی تھیں۔ اُن کی اطلاع بھی یونیورسٹی کی دیواروں پر پوسٹرز کے ذریعے مل جاتی تھی اور کیتھی اور مجھے ان سرگرمیوں میں اس لئے بھی حصہ لینا تھا کہ ایک طرف یہ ہماری ریسرچ میں کام آسکتی تھیں دوسرا ہمیں دوبارہ یہ موقع کبھی نہیں ملنا تھا۔ خاص طور پر جب انڈیا یا پاکستان سے یا انگلینڈ امریکہ سے کوئی مؤرخ برصغیر کی تاریخ پر بولنے کے لئے آتا تھا تو مجھے تو اس سے ملنا اور اس کا لیکچر سننا بے حد ضروری تھا۔ میں ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ اور اکثر ایسے موقعے مل جاتے تھے۔

یونیورسٹی سکول میں جتنی لائبریریاں تھیں پہلی فرصت میں مجھے اُن کو استعمال کرنا تھا۔ میرا کام مشکل اس لئے تھا کہ مجھے صرف تاریخ کی کتابیں نہیں پڑھنی تھیں۔ مجھے تمدن اور ثقافت سے متعلق کتابیں بھی پڑھنی تھیں۔ جن میں برصغیر کے کھانے اور پہناوے اور عادات واطوار اور میلے ٹھیلے اور ثقافتی مزاج کے ساتھ شادی بیاہ کی رسومات وغیرہ معلوم نہیں کیا کچھ دیکھنا تھا اور اوپر سے میرا پروفیسر ایک جملہ فالتو بولنے کا روادار نہیں تھا۔ اور اُس کے حکم سے میرا وظیفہ رک سکتا تھا۔ اب مجھے کیا کچھ اس ریسرچ میں دیکھنا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ میں سارا دن اِدھر سے اُدھر بھاگ رہا تھا ـــــ کبھی برٹش میوزیم کی لائبریری میں کبھی آکسفورڈ کی لائبریری میں کبھی کیمبرج کی لائبریری میں کبھی کسی اور یونیورسٹی کی لائبریری میں۔ ہر جگہ مجھے نئی سے نئی معلومات مل رہی تھیں۔ اور میرا پروفیسر مطمئن ہو رہا تھا۔ مجھے لگتا تھا میں اپنے انگریز پروفیسر کو دوبارہ پڑھا رہا ہوں۔ وہ میرا گائیڈ نہیں ہے اب میں اُس کا گائیڈ بن چکا ہوں۔ وہ میری ہر ریسرچ کی معلومات پر چونک جاتا تھا۔ لیکن وہ یہ ظاہر نہیں کرتا تھا کہ یہ معلومات اُس کے لئے ایک انکشاف ہیں۔ مگر میں سمجھ رہا تھا۔ اس سے مجھ پر یونیورسٹیوں کے پروفیسروں کا پول بھی کھل رہا تھا۔ بہر حال میرا وظیفہ جاری تھا۔

میں اور کیتھی سارا دن اسی طرح بھاگتے دوڑتے، ایک بس پکڑتے دوسری چھوڑتے اور ایک عمارت میں جاتے دوسری سے نکلتے۔ معلوم پڑتا شام ہوگئی اور ہم اپنے اپارٹمنٹ میں آجاتے۔ ہم دونوں تھکے ہارے کچن میں دیکھتے وہاں کچھ بھی نہیں ہوتا تھا تو میں ڈبل روٹی اور انڈے بنا کر کیتھی کو کھلاتا اور خود بھی کھالیتا تھا ـــــ اور ہم سو جاتے تھے۔ ہم دونوں کو ہوش ویک اینڈ پر آتا تھا لیکن ویک اینڈ میں بھی ہفتے کا دن میرا اور کیتھی کا مصروف ہوتا تھا۔ ہم دونوں صبح نیچے سے بس لے کر برٹش میوزیم چلے جاتے۔ وہ

ایفریقن سیکشن اور میں انڈین سیکشن میں جا کر مختلف ریفرنس بکس سے ریسرچ جمع کرتے۔ یہ ریسرچ بالکل ایسے تھی جیسے افریقہ کے بعض ملکوں میں دریاؤں میں سونے کے ذرّات پائے جاتے ہیں۔ جنہیں چھاننے کے لئے ایک عمر لوگ لگا کر ایک دو تولہ سونا جمع کر سکتے ہیں۔ مجھے بھی یہ ذرّے چننے کے لئے کئی کئی کتابوں سے گذرنا تھا۔

اتوار کو ہم دیر سے اُٹھتے اور پھر ہفتے بھر کا بوجھ اتارتے۔ اُس دن ہمیں مل کر گراسری سٹور جانا ہوتا۔ وہ اپنا سامان اور میں اپنا سامان لے کر آتے اور پھر ایک جگہ رکھ دیتے۔ جسے ہم دونوں نے مل کر استعمال کرنا ہوتا تھا ـــــ اس روز میں کھانا بنا کے رکھ دیتا تھا۔ کچھ دن وہ چل جاتا تھا۔ وہ ایسے کہ دوپہر کا کھانا ہم چلتے پھرتے کھا لیا کرتے تھے۔ کبھی کسی کینٹین میں کسی راستے میں کسی فٹ پاتھ پر۔ بس شام کا کھانا ہمیں گھر آ کر لینا ہوتا تھا ـــــ کبھی کبھی کیتھی دیر سے آتی تو اس نے کھانا نہیں کھانا ہوتا تھا۔ سیدھی جا کر سو جاتی تھی۔

اچانک ایک دن جب شام کی ڈرنک لے کر میں اور کیتھی بیٹھے تو مجھے اس کا ننگا جسم محسوس ہی نہیں ہوا۔ جیسے میں اس کا عادی ہو چکا تھا۔ یہ بات میرے لئے بہت بے چینی کی تھی۔ کہیں ایسا تو میرے ساتھ نہیں ہو رہا کہ میں عورت کی کشش سے رفتہ رفتہ محروم ہو رہا ہوں۔ کہیں میں منٹو کے ''ٹھنڈے گوشت'' کا سکھ کردار تو نہیں بنتا جا رہا۔ واقعی عورت کی کشش تو محسوس ہوتی رہنی چاہیے۔ کیا افریقی قبیلے بغیر لباس کے رہنے سے عورت کی کشش کھو دیتے ہیں اور کیتھی ہی نے بتایا تھا کہ ایک زمانے میں عورت سردار ہوا کرتی تھی تو ایسے میں ایک عورت کے دو دو شوہر بھی ہوتے تھے اور جانوروں کی طرح عورت کی بھی مرضی نہیں ہوتی تھی تو دونوں شوہروں کی مجال نہیں ہوتی تھی کہ اُسے چھو سکیں۔ میری بھی مجال نہیں ہو رہی تھی کہ اُسے چھو سکوں۔ مجھے جب اس نے اپنے بدن سے محسوس کرانا آہستہ آہستہ کم کرا دیا تو مجھے تشویش ہونے لگی۔ اب میں نے جان بوجھ کر اپنی مردانگی کو سوتے سے جگانے کی کوشش کی۔ اُسے آنکھ بھر کے دیکھنے لگا۔ کم سے کم اُس شام کی روشنی میں تو اُس کی چھاتیوں پر باہر سے آنے والی ہلکی ہلکی روشنی بھی پڑ رہی تھی۔ جسم کی پلی پلائی چھاتیاں، اس کے سینے پر رکھے دو براعظم تھے۔ ایک ایشیا اور دوسرا افریقہ۔ اس کے ہونٹ اب میں نے غور سے دیکھے تو بے حد رس بھرے دو موٹے شہتوت جیسے تھے۔ مگر نہیں تشبیہ کے لئے کچھ مجھے نہ ملا سوائے سنگترے کی دو قاشوں کے۔ افریقی عورتوں کی ناک اور ہونٹ ایک دوسرے سے تراش خراش اور

گولائیوں میں بہت حد تک نسبت رکھتے ہیں اور یہی افریقی عورت کی خوبصورتی کا اہم سبب ہوتا ہے۔اب مجھ پر کیتھی کا جسم کھلنا شروع ہوا۔ میں نے اور اُس نے دوسرا ڈرنک لیا اور وہ بھانپ گئی کہ میرے اندر کا سویا یا سہا ہوا مردِ غیرت میں آنا شروع ہوا ہے۔مگر میں اچانک اُس پر وار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ رومانس کے کچھ اصول تھے جو مجھے سوزین نے سکھا دیئے تھے۔اس شام مجھے سوزین بہت یاد آئی۔اُس نے جیسے مجھے گود لے لیا تھا۔ یہاں کیتھی مجھے گود لینے کو تیار نہیں تھی۔ یہاں وہ چاہتی تھی میں اُسے گود لوں۔ یہی مشکل مجھے پیش آ رہی تھی۔اب وہ اٹھی کچن سے سلاد لانے کے لئے تو میں نے اُس کی کمر اور پشت دیکھی۔اُس کے کولہے جسم کے پلے پلائے اور اپنے قد کے مطابق اُن کی گولائیاں کسی مصور نے جیسے بنا دی ہوں۔اُس کی رنگت میں کشش موجود تھی۔اب میں نے رفتہ رفتہ اپنے اندر ایک عیاش، اوباش رومانٹک، حسن پرست اور عشق پیشہ کے امتزاج کو پیدا کرنے کی کوشش کی کہ ایک کامیاب مرد کی کیمسٹری یہی ہوتی ہے۔اب کوئی مرد اس سے اختلاف کرے گا تو وہ جھوٹ بولے گا۔ مجھے اُس شام کچھ اپنے پر بھروسہ ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ کیتھی نے میرے اندر کے مرد کو برف سے نکلتے دیکھ لیا ہے۔ہم نے وہ کھانا کھایا جو میں نے بنایا تھا اور ہم دونوں جان بوجھ کے رومانوی گفتگو کی طرف آ رہے تھے۔میں نے پوچھا۔

''تم شادی اپنے قبیلے میں کرو گی؟''

''تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''میں افریقی عورت کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا چاہتا ہوں۔''

''شادی ہو جاتی ہے، شادی کی نہیں جاتی۔''

یہ بات کر کے اُس نے مجھے چونکا دیا___ میں نے ایسے ہی بات بنائی۔''میرا مطلب ہے ہر لڑکی کا کوئی خواب ہوتا ہے۔''

''ہر لڑکی کا خواب صرف ایک نہیں ہوتا۔کئی خواب ہوتے ہیں۔یہ اس دنیا کے ناول لکھنے والوں نے بہت کنفیوژن پھیلایا ہے کہ لڑکی صرف ایک خواب دیکھتی ہے۔کیا لڑکا خواب نہیں دیکھتا اور کیا وہ صرف ایک ہوتا ہے۔خوابوں کا پیکیج ہوتا ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔کیتھی! میں بس یہ پوچھ رہا تھا کہ تم شادی کے ادارے پر یقین رکھتی ہو کہ نہیں؟''

''ہمارے قبیلے میں شادی کا بہت بڑا جھنجھٹ ہوتا ہے۔اتنا آسان نہیں ہوتا ایک ننگی چھاتیوں

والی لڑکی کا دل جیتنا____''

''مجھے صرف اتنا بتا دو کہ دل کیسے جیتتے ہیں؟''____

''نہیں تم وہ سب نہیں کر سکتے۔ ڈرنک پیو اور سو جاؤ۔''

''نہیں میں ریسرچ سکالر ہوں۔ اس لئے پوچھ رہا ہوں۔''

''کیا تم شیر کو شکار کر سکتے ہو؟ کیا تم چیتے کے بچے کو پکڑ کر لا سکتے ہو؟ کیا تم ہرن کو پکڑ سکتے ہو؟ کیا تم جنگلی گھوڑے کی سواری کر سکتے ہو؟ اور تو اور جنگل کے کسی بھی جانور کو یا سمندر کی کسی بھی مچھلی کو پکڑ سکتے ہو؟____ یہ شرائط ہوتی ہیں ہم جنگل کے رہنے والوں کی۔ ہم پر کوئی قانون نہیں چلتا۔ ہم جنگل کے قانون کے تابع ہوتے ہیں۔ تم نے ناول ''روٹس'' تو پڑھا ہوگا؟''

''پڑھا بھی ہے اور اس کی ٹی وی سیریل بھی دیکھی ہے۔''

''تو پھر تم جانتے ہو ہزاروں سال کی غلامی کوئی ایک دن میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ جنگلوں کے ساتھ اُس میں رہنے والے قبیلے بھی بِک جایا کرتے تھے۔ ملک خریدے جاتے ہیں اور اُن میں رہنے والے عوام بھی بِک جاتے ہیں۔''

''یہ صرف تمہارے قبیلوں کے ساتھ نہیں ہوتا۔ ہم ایشیائی اقوام کے ساتھ بھی یہ ہوتا رہا ہے۔ ہم اِسی انگریز کے کتنے سال غلام رہے۔ ہم ابھی تک غلام ہیں۔ ہمیں غلامی میں رہنے کی عادت اور لذت ہو گئی ہے____ ہم بھی کئی ہاتھوں میں بکتے رہے ہیں۔''

''تم نے ہماری شاعری نہیں پڑھی۔ بلیک پوئٹری____''

''بہت پڑھی ہے۔ میں نے سینی گال کے شاعر ڈیوڈ ڈیوپ کو پڑھا ہے۔ میں نے لنگسٹن ہیوز، جبریل اوکارا کو پڑھا ہے جو نائیجیریا سے ہے۔ میں تمہیں ان کی نظمیں بھی سنا سکتا ہوں۔''

وہ اُچھلی۔ ''واقعی تم نے ان شاعروں کو پڑھا ہے۔ یہ تو میرے لئے سرپرائز ہے۔''

''دیکھو کیتھی شاعری کی زبان انسانوں کی زبان ہوتی ہے۔ وہ خود ہی سفر کر جاتی ہے۔ اُسے کسی پاسپورٹ ویزے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جیسے تم تک پہنچنے کے لئے مجھے کسی افریقی ملک کا ویزا نہیں لینا پڑا۔''

''اگر تم نے ہماری شاعری پڑھی ہے تو تم جانتے ہو، ہم نے دنیا کی بڑی اور عظیم الشان عمارتوں

میں مزدوری کی ہے۔ ہم نے دنیا کی ریلوے مشکل سے مشکل راستوں میں بچھائی ہے۔ ہم نے دنیا کی تمام بڑی فیکٹریوں اور کارخانوں کی مشینیں چلائیں۔ ہم نے دنیا کی زراعت میں زمین پر ہل چلائے۔ ہم نے دنیا کی سڑکیں بنائیں۔ دنیا کے ایئر پورٹ بنائے۔ ہم نے دنیا کو تفریح دی۔ جینا سکھایا ــــ فنونِ لطیفہ اور سپورٹس کو ترقی دی ــــ''

''کیتھی! میرا گلاس خالی ہے۔ تم اسے اپنی محبت اور جدوجہد سے بھر دو۔''

وہ اٹھی اور میرا اور اپنا گلاس بنا کے لائی۔ ایسا اکثر ہوتا تھا کہ ہم باتوں باتوں میں بھول جاتے تھے کہ گلاس خالی ہیں۔ اب اُس نے پھر سے بات شروع کی۔

''تمہیں پتہ ہے ہم بلیک لوگ جو کام بھی کرتے ہیں اس میں غصہ اور شدت ہوتی ہے۔ احتجاج اور حملہ ہوتا ہے۔ یہ ہمارا اظہار فنونِ لطیفہ میں بھی ہے۔ سپورٹس میں بھی ہے اور سڑک پر ہونے والے احتجاج میں بھی ہوتا ہے۔ جب ہمارا کوئی فٹ بالر فٹ بال کو زور سے کِک مارتا ہے تو وہ صرف فٹ بال کو ہِٹ نہیں کر رہا ہوتا۔ وہ ہزاروں سال کے ظلم کے خلاف غصہ نکال رہا ہوتا ہے۔ جب کوئی بلیک نوجوان ڈرم کو پیٹ رہا ہوتا ہے اور پوری طاقت سے مسلسل اُس پر کوڑے برسا رہا ہوتا ہے تو وہ ڈرم کو نہیں پیٹ رہا ہوتا وہ اپنے دشمن پر حملہ آور ہوتا ہے۔ جب کوئی باکسر چاہے محمد علی ہی کیوں نہ ہو جب اپنے مخالف باکسر پر حملہ آور ہوتا ہے خواہ وہ بلیک ہی کیوں نہ ہو، وہ صرف اُس کو پنچ نہیں مار رہا ہوتا تھا۔ وہ غلامی کے خلاف اپنا کتھارسس کر رہا ہوتا تھا۔ ایسے ہی جب کلا ئیولا ئیڈ بیٹنگ کرتے ہوئے ایک اوور میں کئی چوکے اور چھکے مارتا ہے تو وہ بال کو نہیں مارتا وہ اُس نظام کو مارتا ہے جس نے اُسے غلام پیدا کیا۔ جب کوئی بلیک ریس میں دوڑتا ہے اور سب کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے تو وہ بہت آگے نکلنا چاہتا ہے۔ وہ اس ظلم کے زمانے سے دور جانا چاہتا ہے۔ ایسے ہی کوئی بلیک گانے والا جب گاتا ہے تو اُس کی آواز انتہائی اونچی ہوتی ہے اور اس کے اندر سے فریاد کی لے اور احتجاج کی آواز اونچے سُر میں چلی جاتی ہے۔''

مجھ پر کیتھی آہستہ آہستہ کھل رہی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ ہالی وڈ میں سیاہ فام اداکاروں نے تو بہت ترقی کی ہے اور نام بنایا ہے۔ ان سے تعصب ہوتا ہے یا نہیں۔ جیسے جم براؤن ہے، سڈنی پوئٹر ہے اور بھی ہیں۔''

اس پر وہ زور سے ہنسی اور کہا۔ ''تم فلمیں دیکھتے ہو؟''

''ہاں، جو مشہور مشہور فلمیں ہوتی ہیں۔''

''پھر تم کچھ نہیں جانتے۔ آج تک کسی بلیک کو انہوں نے ہیرو اور گوری کو ہیروئن کے طور پر پیش نہیں کیا۔ کوئی مجبوری موضوع کی ہو تو میں کہہ نہیں سکتی۔ جتنی ایڈونچر فلمیں بنی ہیں، ان میں ہیرو اور اُس کے ساتھ گورے ہوتے ہیں۔ ایک ہمدردی بٹورنے کے لئے سیاہ فام کو ساتھ رکھ لیتے ہیں۔ جس نے آخر میں قربانی دینی ہوتی ہے۔ اور اُس سے یہ اپنی فلم کامیاب کرا لیتے ہیں ـــــ یاد کرو ''گنز آف نیوران'' یاد کرو ''ہیروز آف ٹیلی مارک'' قسم کی فلمیں یا ''میکاناز گولڈ'' ان سب میں ایک کالا کہیں ہوتا ہے پیچھے اور پھر وہ کسی گورے کے لئے قربانی دیتا ہے۔''

میں کیتھی کی بات سمجھ گیا تھا۔ یہ سارا نظام چاہے معاشی ہو، علمی وادبی ہو۔ یا فنونِ لطیفہ کا ہو۔ ہر جگہ محکوم کو محکوم ہی رکھا جاتا ہے۔ جیسے ہم انگریز کی غلامی سے نکل کر بھی کسی نہ کسی شکل میں آج بھی غلام ہیں ـــــ ہم دونوں نے اپنی اپنی بھڑاس نکالی اور پھر میں اٹھا اور کچن سے کھانا گرم کر کے میز پر لگایا۔ وہ ابھی تک خاموش گلاس تھامے بیٹھی تھی۔ میں نے وہ گلاس لیا اور اُسے کھانے پر لایا۔ وہ گم سم تھی اور پھر میں نے اُسے کھانا کھلایا اور وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ سو جائے۔ اُس نے میرا ہاتھ تھاما اور کہا تم بھی سو جاؤ۔

مجھے ایسے محسوس ہوا کہ وہ چاہتی ہے میں اُس کے ساتھ لیٹ جاؤں۔ اُسے شاید سہارے کی ضرورت تھی۔ پھر بھی میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی بھی بات کا فائدہ اٹھاؤں۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا اور واقعی سو گیا ـــــ

اب میرا اور کیتھی کا معمول وہی تھا کہ کسی کو کسی کا پتہ نہیں کہ کب آنا ہے اور کب جانا ہے۔ ریسرچ کے حوالے سے ہم دونوں کو اپنی اپنی فنڈنگ کو بچانا تھا۔ اس دوران لندن میں صبح سے شام تک ادب تاریخ موسیقی آرٹ اور تھیٹر کی اتنی سرگرمیاں ہو رہی تھیں کہ ہم کسی کو بھی نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ پوری دنیا سے فنکار، رائٹرز، مؤرخ کسی نہ کسی جگہ موجود ہوتے تھے۔ یہ مواقع بھلا کون گنوا سکتا تھا۔ ہم دونوں نے بھی ایک طرف ریسرچ اور دوسری طرف اِن تقریبات کو برابر کا وقت دینا شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ ہم دونوں آگے پیچھے تھکے ہارے اپنی اپنی بسوں سے باہر آتے اور اپنے اپارٹمنٹ میں دھڑام سے گر جاتے۔ جو کچھ میں نے بنا کے رکھا ہوتا یا ہم راستے سے لے کر آتے، ایک ایک دو دو ڈرنکس

لے کر کھا لیتے اور پھر ہوش نہ رہتا۔ بس چھٹی کے دن ہوش آتا۔

اس دوران میں نے محسوس کیا کہ کیتھی مجھ سے کھانا پکانا سیکھنا چاہتی ہے۔ جب میں کچن میں کھانا بنانے کے لئے آتا تو وہ بھی آ جاتی۔ میں پلاؤ، آلو گوشت، کڑاہی گوشت، دال اور سبزی بنانے کے لئے کچن میں پہلے سبزیاں یا پیاز بناتا تو وہ مجھے دیکھ رہی ہوتی۔ کچن اتنا تنگ تھا کہ صرف ایک کھانا بنانے والے کی گنجائش ہوتی تھی۔ وہ اندر آ جاتی تو مجھے کھانا بناتے ہوئے دیکھتی تو ایسے میں ہمارے جسم بھی ٹکراتے تھے۔ نہ تو وہ ایسا ارادی طور پر کرتی نہ میں جان کے ایسی حرکت کر سکتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے اس کی سانسیں سنائی دے جاتی تھیں۔ ہم دونوں کے بیچ جو تعلق قائم ہو رہا تھا وہ نا سمجھ میں آنے والا تھا____ نہ اُسے کوئی نام دیا جا سکتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ مرد ہوتے ہوئے بھی اُس سے دبا دبا رہتا ہوں۔ اس لئے کہ میرے حواس پر افریقی مرد اور عورت ہمیشہ سے بے حد بہادر، مظلوم اور جدوجہد کرنے والے لوگ تھے۔ اس لئے میں اُس سے خود کو کمزور محسوس کر رہا تھا۔

اُسے بھی اس بات کا احساس تھا کہ میں دَب گیا ہوں۔ وہ چاہتی تھی کہ میری مردانگی بحال ہو۔ اور وہ اس کے لئے کوشش بھی کرنے لگی تھی۔ ایسی ہی ایک کوشش میں کیتھی اور میں اپنے اپارٹمنٹ میں شام کے وقت ڈرنک لے رہے تھے کہ اُس نے مجھ سے پوچھا ''تم نے سیکس کی ہے؟''

''ہاں میں نے سیکس کی ہے۔ میں جرمنی میں جب ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں تھا تو۔''

''میں نے یہ نہیں پوچھا کہ کیسے کی ہے اور کب کی ہے اور کس کے ساتھ کی ہے؟''

''نہیں میں کچھ بھی نہیں بتا رہا۔ بس اتنا کہ یہ واقعہ کہاں ہوا۔''

''ویسے سیکس کی فلاسفی بہت کمزور ہے اور یہ بے حد مکینیکل قسم کی بے ہودہ جسمانی ورزش کے علاوہ کچھ نہیں اور آخر میں ایک شرمندگی خود سے بھی اور اپنے ساتھی سے بھی آپ کو محسوس ہوتی ہے۔ ایسی سیکس کا کیا کرنا جو مرد سے شروع ہوتی ہے اور مرد پر ختم ہوتی ہے۔ اس میں عورت کہاں ہے؟ عورت نہ بھی ہو تو مرد فارغ ہو جاتا ہے۔ اب تو سیکس شاپس نے سب کو ننگا کر کے رکھ دیا ہے۔ دنیا کو اس سیکس کے حوالے سے کوئی نئی تھیوری دینی چاہئے۔ نفسیات دانوں نے بہت تیر مارا اور سیکس کو سمجھنے کے لئے مرد کے لبیڈو کو ذمہ دار ٹھہرا دیا۔ یہ لبیڈو مرد کے اندر پیدا ہونے والا جنسی وفور ہوتا ہے جو اسے مجبور کرتا ہے کہ اُس کا اخراج ہو جائے۔''

''تو کیا عورت میں ایسا کچھ نہیں ہوتا؟''

''تم عورت کے جسمانی نظام کو کیا جانتے ہو۔ عورت کے لئے سیکس سب سے کم تر درجے کی تفریح ہوتی ہے۔ ویسے بیویاں خاوندوں پر قربان ہونے کے لئے ڈھونگ رچاتی ہیں کہ وہ خاوندوں سے سیکس کرنے میں خوشی محسوس کر رہی ہیں۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ جب خاوند فارغ ہو کر اُتر جاتا ہے تو عورت کے اندر کا سمندر چڑھ جاتا ہے اُسے اُتارنے کے لئے کسی کے پاس کوئی طریقہ ہوتا ہے۔''

میں کیتھی کی باتیں سن رہا تھا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا وہ اب میرے کپڑے اتار رہی تھی۔ اب میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں کیتھی سے پوچھ لوں کہ کیا تمہیں سیکس کا کوئی تجربہ ہوا ہے۔ اُس نے کہا۔''ہاں ہوا ہے۔''

''میں یہ نہیں پوچھوں گا۔ کب، کہاں، کس سے؟''

''میں خود بتاؤں گی۔ ہمارے قبیلے کی لڑکیاں تیرہ چودہ سال میں جوان ہو جاتی ہیں۔ میں بھی ہو گئی تھی۔ مگر میں اُس وقت بورڈنگ ہاؤس میں تھی جب مجھے سکول میں فاؤنڈیشن لے گئی تھی۔ میرے ساتھ افریقی لڑکیاں اُس فاؤنڈیشن کی وجہ سے بورڈنگ ہاؤس میں موجود تھیں۔ میرے لئے جنگل کی زندگی کے بعد ایک ایسی تبدیلی کا تجربہ تھا کہ میرے لئے حیرت کے بے شمار مقامات تھے۔ میرے ساتھ دوسری لڑکیاں قبائل سے نہیں تھیں وہ شہروں کے غریب گھروں سے تھیں۔ وہ ہر وقت آپس میں باتیں کرتی تھیں۔ مجھ سے جان کر دور رہتی تھیں۔ ان سب میں سے میں ہی سب سے اداس لڑکی تھی۔ میں ہر وقت حیران رہتی تھی۔ ہفتے میں ایک دِن پادری ہم سب کو نیکی کی تعلیم دیتا تھا۔ مجھے نیکی اور بدی کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آتی تھی کہ ایک چیز کس وجہ سے نیکی ہے اور دوسری چیز کس وجہ سے بدی ہے۔

ایک دن ہماری میٹرن جو اپنی یونیفارم میں ہوتی تھی، میرے پاس آئی اور کہا۔ پادری سر نے بلایا ہے۔ میں سمجھی میرے قبیلے سے کوئی ملنے آیا ہوگا۔ جب سے میں فاؤنڈیشن والوں کے ساتھ چھوٹے سکول سے بڑے سکول میں آئی تھی۔۔۔۔ میرے قبیلے سے کوئی مجھ سے ملنے نہیں آیا تھا۔ اور فاؤنڈیشن والوں کی طرف سے یہ شرط تھی کہ گھر سے کوئی ملنے نہیں آئے گا۔ ویسے گھر والی بات تو مجھے کرنی نہیں چاہیے۔ جنگل میں کوئی گھر نہیں ہوتا۔ میں اُس کے ساتھ چلی گئی۔ وہ میٹرن مجھے چرچ کے ساتھ ایک کمرے میں لے گئی اور کہا۔ پادری سر تم سے بات کریں گے۔ وہ چلی گئی۔ میں نے کمرے کو دیکھا۔ اس

میں تصویریں لگی تھیں، جن میں حضرت عیسیٰؑ کو سولی پر لٹکایا گیا تھا۔ مجھے اس کی زیادہ سمجھ نہیں تھی کہ ایک مردہ کیوں لٹکا ہوا ہے۔ وہاں کچھ مجسمے بھی رکھے ہوئے تھے۔

میں نے یہ سب پہلے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ پھر پادری سر آئے اور انہوں نے مجھے بتایا کہ تمہاری روح اور جسم کو پاکیزہ بنانا ہے۔ مجھے بالکل پتہ نہیں تھا کہ روح کیا ہے اور جسم کیا ہے اور اُن کو پاکیزہ کیسے کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد پادری سر نے مجھے ایک گلاس میں کچھ دیا اور کہا۔ یہ پی لو۔ یہ تمہیں سات آسمانوں کی سیر کرائے گا۔ مجھے سات آسمانوں کے متعلق پادری سر نے ہر صبح کے سرمن میں بتایا تھا کہ سات آسمان خدا نے بنائے ہیں اور وہ ہماری حفاظت کرتے ہیں۔ میں نے وہ گلاس پیا تو مجھے محسوس ہوا میں ہوا میں جھول رہی ہوں ـــــ پھر مجھے ایسے لگا میری چھاتیوں پر پتلا سانپ رینگ رہا ہے۔ پھر مجھے محسوس ہوا پادری میری ان چھاتیوں کا دودھ پی رہا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا اُن میں دودھ تھا یا نہیں۔ یا میری ان چھاتیوں کے اندر دودھ پھٹ گیا تھا ـــــ پھر میں نے محسوس کیا وہ سانپ جو پتلا تھا، آہستہ آہستہ بڑا ہو گیا ہے اور اب وہ میری زیرِ ناف سرسرا رہا ہے۔ مجھے ہلکا ہلکا یاد ہے کہ وہ سانپ مسلسل بڑا ہو رہا تھا اور وہ مجھے ڈسے جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ میں بے ہوش ہو گئی۔ اگلے دن میں نے محسوس کیا کہ میں اچانک بڑی ہو گئی ہوں اور میری چھاتیاں دودھ سے بھرنے لگی ہیں ـــــ بورڈنگ ہاؤس کی لڑکیاں مجھے دیکھ کر ہنستی تھیں۔ بعد میں پتہ چلا۔ پادری نے ان میں سے اکثر کو سات آسمانوں کی سیر کرائی تھی میں آخری لڑکی تھی۔ اس کے بعد وہ کسی کو دکھائی نہیں دیا ـــــ

ایسا تو ہمارے جیسے ملکوں میں بھی ہوتا ہے۔ ہر ملک میں ہوتا ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں زیادہ ہوتا ہے۔ چھوڑو۔ تم نے پوچھا میں نے بتا دیا ـــــ لیکن یہ بھی بتا دوں کہ ہمارے قبیلے میں یہ حق عورت کے پاس ہوتا ہے کہ وہ اپنے لئے کس مرد کو چنے۔ جیسے شیرنی کے پاس یہ حق ہوتا ہے کہ وہ کس کو اپنے پاس آنے دے۔ اور اس حق کی وجہ سے شیرنی شیر کا بہت کڑا امتحان لیتی ہے۔ اسے اپنی نظروں میں جھکاتی ہے۔ وہ پورے غرور کے ساتھ اُس کے سامنے کھڑی ہوتی ہے۔ اُسے کئی بار نظر انداز کرتی ہے۔ قریب نہیں آنے دیتی۔ شیر جانتا ہے کہ اُسے شیرنی کا دل جیتنے کے لئے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑیں گے اور وہ یہ سب کرتا ہے۔ جب شیرنی اُسے جھکا دیتی ہے اور اُسے بتا دیتی ہے کہ تمہاری طاقت مجھے فتح کرنے میں نہیں میری حفاظت کرنے میں ہے اور میرے بچوں کی حفاظت کے لئے تم نے موجود رہنا ہے، اس کے بعد شیرنی اُس کے

سامنے لیٹ جاتی ہے۔ اور شیر خوش ہوتا ہے کہ اُس نے اُس کا دل جیت لیا ہے۔ ہماری بچپن میں تربیت انہی خطوط پر ہوتی ہے۔ اس لئے پادری کے تجربے کے بعد میں نے اپنے قبیلے کی روایت اور تربیت پر عمل کیا اور اپنے لئے مرد کو خود چنا ___ اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ کون تھا ___ یا کون تھے؟''

''میں یہ پوچھنا بھی نہیں چاہتا۔ ہم دونوں کون ہیں اور ہمارے کس کس سے تعلقات تھے۔ یہ نہ تو ضروری ہے نہ یہ ہمارے اس اپارٹمنٹ میں ایک ساتھ رہنے کے لئے کوئی شرط ہے۔''

''ہاں، میں آج بھی اپنے ساتھ سونے کے لئے خود مرد کا انتخاب کرتی ہوں۔''

''میں نے تو یہ سب پوچھا ہی نہیں۔''

''ہاں آج کے بعد میں فیصلہ کروں گی کہ مجھے کیا چاہئے۔''

''کیا میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ مجھے تم چاہئے ہو؟''

''نہیں، میں نے تو ایسا نہیں کہا۔ میں نے صرف یہ بتایا ہے کہ ہم دونوں کو جو بھی تعلق بنانا ہے وہ میری مرضی سے ہوگا۔ لیکن تم شیر کی طرح میرے آس پاس منڈلا سکتے ہو اور شیر جس آزمائش سے گذرتا ہے تم بھی گذر سکتے ہو۔''

اس کے بعد ہم دونوں اپنے اپنے کمروں میں جا کر سو گئے۔ اور پھر سے ہمارا معمول شروع ہو گیا۔ مجھے ریسرچ کے لئے ہر لائبریری سے کچھ نہ کچھ مل رہا تھا ___ اور ہندوستان پر حکومت کرنے والوں کی اصل حقیقت سامنے آ رہی تھی۔ لگتا یہ تھا کہ ہندوستان تو غلام ہونے کے لئے پیدا ہوا تھا۔ یہاں جو نسلیں آباد تھیں ایک تو ان میں سے کوئی بھی خالص نسل نہیں تھی۔ صدیوں کی اُتھل پتھل اور بیرونی حملہ آوروں کی آمیزش سے کئی طرح کی ملاوٹیں شامل ہو چکی تھیں۔ جس کے نتیجے میں کوئی بھی قوم یا نسل خالص نہیں بچی تھی۔ اس لئے بظاہر ہر قوم اور نسل اپنی غیرت اور اپنے نسلی افتخار کا جھنڈا اٹھائے پھرتی تھی۔ مگر اندر سے غلامی اور بے غیرتی کے تمام تر عناصر کے ساتھ ہر حملہ آور کے سامنے بچھ جانے کو تیار بیٹھی تھی۔ انہوں نے بڑی کامیابی سے غیرت اور نسلی افتخار کا ملمع خود پر چڑھایا۔ وہ ملمع اس قدر پختہ ہو گیا کہ پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے قبیلوں، قوموں اور اعلیٰ نسلوں نے یہ ملمع ابھی تک اُترنے نہیں دیا۔ لیکن ان کی غیرت اور حمیت صرف عورت کی آزادی تک محدود ہو چکی ہے۔ اب وہ عورتوں کو غیرت کے نام پر قتل کر کے اپنے شملے اونچے رکھتے ہیں اور جب کوئی ظالم ملک کی باگ ڈور سنبھالتا ہے تو سب مل کر اُس کے ہاتھ مضبوط کرتے

ہیں۔ اسمبلیوں میں رعایا کے ووٹ سے پہنچتے ہیں اور پھر ہر طاقت ور کے آگے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔ یہ سرکس کے شیروں کی طرح ہر چابک پر اپنی وفاداری بدل لیتے ہیں ـــــ ان پر ملمع کیسے چڑھایا جاتا رہا ہے۔ تاریخ میں دلچسپ باتیں لکھی ہوئی ہیں۔ مگر وہ تاریخ نایاب ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اس تاریخ کا کھوج لگایا کیونکہ ان تاریخوں کو غائب کرا کے کرائے کے مؤرخوں سے اپنی مرضی کی تاریخیں لکھوائی گئیں اور اس بات کا خیال رکھا کہ جن مؤرخین سے مرضی کی تاریخ لکھوائی جائے وہ بڑی یونیورسٹیوں سے پڑھے ہوئے ہوں تا کہ ان کا اعتبار کیا جا سکے۔ ایسے کرائے کے تعلیم یافتہ لوگ ہر زمانے میں آسانی سے پیسوں کے عوض دستیاب رہے ہیں۔ آج بھی ہیں۔ پھر یہی مؤرخ سرکار دربار سے عہدے اور اعزازات حاصل کرتے رہے ہیں ـــــ اُن کی لکھی ہوئی جعلی تاریخوں کو مقبول بنانے کے لئے پورے کے پورے محکمے بنائے جاتے رہے جو اُن کا ڈھول پیٹتے تھے۔ ہر مؤرخ نے ایک ہی بات لکھی ہوئی تھی کہ بادشاہ، راجہ، مہاراجہ، سردار، چوہدری وڈیرا بے حد انصاف پسند تھا۔ رعایا سے بے پناہ محبت کرتا تھا ـــــ رعایا کے دکھ درد میں شریک ہوتا تھا۔ اُس کی راجدھانی میں امن و امان کی وجہ سے عوام سونا اچھالتے رہتے تھے۔ خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ عوام چین کی نیند سوتے تھے وغیرہ، وغیرہ۔

یہ سب ملمع ان انصاف پسند حکمرانوں پر کیسے چڑھایا جاتا تھا۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ عوام یا رعایا سے حکمران یا راجوں کو کوسوں دور رکھا جاتا تھا۔ عوام کے نظم و نسق اور ٹیکس کی وصولی کے لئے درجہ وار عملہ تعینات کیا جاتا تھا۔ مختلف جگہوں پر ان کے عہدوں اور رتبوں کے نام مختلف ہوتے تھے۔ عام طور پر گورنر، صوبے دار، منتظم، وزیر، منصب دار اور تعلقہ دار وغیرہ جیسے عہدے ہوتے تھے۔ پھر درجہ بدرجہ نیچے تک اقتدار منتقل ہوتا تھا۔ حکمرانوں اور رعایا کے بیچ یہ سب محکمہ دار ہوا کرتے تھے۔ رعایا سے اچھا برا سلوک انہی محکمہ داروں سے منسوب ہوا کرتا تھا۔ حکمرانوں کا چہرہ صاف رہتا تھا۔ بلکہ اکثر حکمران خود ان عہدیداروں کے ذریعے ظلم کراتے تھے اور پھر اس ظلم کے خلاف رعایا کو انصاف فراہم کر کے نیک نامی کماتے تھے۔ تاریخ میں ان عہدیداروں کے نام کالے حروف سے لکھے گئے جبکہ حکمرانوں کے نام سنہری حروف سے لکھے جاتے رہے۔ وہ عہدیدار بادشاہ یا حاکم کے نام پر جو ظلم کرتے تھے، اس کا بھاری معاوضہ لیتے تھے اور پھر بادشاہوں اور حاکموں کے چہرے کی کالک اپنے چہروں پر مل لیتے تھے۔ خود ظلم کر کے پھر انصاف کرنے کے بے شمار واقعات ان کتابوں میں درج ہیں۔

آج بھی ایسا ہی ہو رہا ہے۔ یہ اصلی نسلی خانوادے اپنی غیرت رعایا پہ استعمال کرتے ہیں اور

اسمبلیوں میں پہنچ کر فوج کے آگے لیٹ جاتے ہیں۔تاریخ کے یہ دلال سینکڑوں سالوں سے ہر زمانے میں اپنی قیمت بڑھاتے رہے ہیں ___ قومی اور نسلی افتخار کے یہ نام نہاد خانوادے اور راجواڑے اب ان دلالوں کے ہاتھوں بلیک میل ہو رہے ہیں کہ دلالوں نے اپنی امپائرز قائم کر لی ہیں اور وہ خود ان کی جگہ لینے کے لئے مختلف مافیاؤں میں تبدیل ہو چکے ہیں ___ ان غیر تمند قومی اور نسلی افتخار کے خانوادوں نے اپنی بیٹیاں ان دلالوں کے مالدار مافیاؤں کے فرزندوں کے ساتھ بیاہنا شروع کر دی ہیں۔کبھی وہ اپنی بیٹیوں کو ایسے فرزندوں کے ساتھ بھاگ کے شادی کرنے پر غیرت کے نام پر قتل کر دیا کرتے تھے۔

میں تاریخ کی گپھاؤں میں داخل ہوتا گیا اور مجھے ہندوستان اور پھر پاکستان کے موجودہ سیاسی کلچر میں اُسی ریاستی نظام کی جڑیں آج بھی پھلتی پھولتی دکھائی دیں۔گماشتے اور دلال کرائے کے مؤرخ اور دانشور ارزاں نرخوں پر ہر زمانے میں موجود رہے ہیں۔

میں جب کوئی ایسی ریسرچ اپنے انگریز پروفیسر کے پاس لے کر جاتا تھا جس میں ہندوستان کے ریاستی نظام کی بداعمالیاں، انسان دشمنیاں اور خاندانی حکومتوں کی کمزوریوں کی نشاندہی ہوتی تھی تو وہ مسکراتے تھے ___ گویا انہیں نہیں پتہ تھا کہ انگریز نے ہندوستان کو کیسے فتح کیا تھا ___ انگریز کو ہندوستان پلیٹ میں رکھ کر ملا تھا۔صرف بنگال میں مزاحمت ہوئی تھی۔جب نواب سراج الدولہ اور نواب حیدر علی کے فرزند ٹیپو سلطان نے جغرافیائی بنیادوں پر انگریزوں کے چھکے چھڑائے تھے۔باقی تو راجستھان، پنجاب، اودھ، دلّی اور دیگر اطراف میں انگریز کو کوئی دقت نہیں ہوئی تھی ہندوستان پر قبضہ کرنے کے لئے ___ میرا پروفیسر میری ریسرچ سے اس لئے خوش تھا کہ میں انگریز کی حاکمیت کا جواز فراہم کر رہا تھا۔اب یہ میری مجبوری تھی کہ میری جیب میں کھوٹے سکّے تھے۔

جب کیتھی کے ساتھ میں نے اپنی ریسرچ اور اُس کی ریسرچ پر بات کی تو اُس نے کہا۔"ہماری غلامی کی تاریخ اور ایشیائی غلاموں کی تاریخ میں کیا فرق ہے؟ جیسے یہاں امریکیوں اور سفید فام حاکموں نے سیاہ فام غلاموں سے ریلوے لائن بچھوائی، اپنی شوگر ملوں کے لئے گنے کے کھیت آباد کرائے اور اپنی اونچی عمارتوں کے لئے مزدوری لی۔اُسی طرح انگریزوں نے ایشیا میں ان غیر تمند راجوں، مہاراجوں،

مقامی چوہدریوں، قبیلوں کے سرداروں سے بے غیرتی کراتے ہوئے کڑیل کسانوں کو انگریز فوج کے حوالے کیا۔ جنہوں نے پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں جھونک دیا اور وہ ایندھن بن گئے۔''

کیتھی اور میں اپنی ریسرچ سے اس نتیجے پر پہنچے کہ دنیا میں صرف دو طبقے ہیں۔ ایک حاکم دوسرا محکوم۔ ایک ظالم دوسرا مظلوم۔ اور جو بیچ کا تیسرا طبقہ ہے وہ صرف دلال ہے۔ دونوں کے بیچ دلالی کرتا ہے۔

ہم دونوں کا زیادہ وقت اب لائبریریوں، سیمیناروں اور اپنے اپنے گائیڈز کے ساتھ گذرنے لگا۔ اس لئے کہ ہم دونوں کی ریسرچ بہت مشکل موضوعات پر تھی۔ ہمیں فاؤنڈیشن کی طرف سے اپنے اپنے وظیفوں کی حفاظت کرنی تھی۔ میری رپورٹ میرا گائیڈ دے رہا تھا۔ جس کی وجہ سے کبھی فنڈز کی کمی کا مسئلہ پیش نہیں آیا۔ ہر مہینے مقررہ تاریخ پر میرے اکاؤنٹ میں پیسے آجاتے تھے۔ اس حوالے سے طالب علم کو اپنے گائیڈ یا پروفیسر کو مطمئن رکھنا ضروری تھا۔ بعض طلباء ایسے بھی تھے جو اپنا کام نہ تو وقت پر کرتے تھے نہ وہ اس قابل تھے کہ اپنی ریسرچ کو بین الاقوامی معیار پر ثابت کرسکیں۔ تو سننے میں آیا کہ وہ اپنے گائیڈز اور پروفیسروں سے مرضی کی رپورٹ لینے کے لئے بھاری رشوت دے رہے تھے اور یہ انگلینڈ کی یونیورسٹیز میں ہورہا تھا۔ تو ایسے میں آکسفورڈ، کیمبرج، لندن یونیورسٹی اور دیگر نامور یونیورسٹیز کا اعتبار سوالیہ نشان بن رہا تھا ـــــ لیکن یہ سب بہت کم یونیورسٹیز میں کچھ شعبوں میں سننے میں آیا۔ جس کی وجہ سے انگلینڈ کی یونیورسٹیوں کا اعتبار قائم رہا اور شائد آئندہ بھی رہے گا۔

میں اور کیتھی شام کے بعد تھک تھکا کے اپارٹمنٹ میں آتے اور کیتھی چونکہ جم سے آتی تھی تو وہ اکثر نہاتی تھی۔ وہ جم میں نہانے کا خرچہ بچاتی تھی۔ میں بھی آکر فریش ہوتا تھا۔ کیتھی میں ایک تبدیلی میں نے دیکھی۔ اب اس نے اپنے قبیلے کا لباس یا بے لباسی ترک کردی۔ اب وہ ہلکی پھلکی شرٹ پہننے لگی تھی۔ شاید اُسے محسوس ہوگیا تھا کہ مردوں کو عورت کے جسم کی پراسراریت میں دلکشی محسوس ہوتی ہے۔ شروع میں تو اُس نے اپنے قبیلے کی روایت کے احترام کو مجھ پر ثابت کرنے کے لئے ایسا کیا اور وہ اُس پر یقین بھی رکھتی تھی۔ لیکن اچانک اس نے ایسا کیوں کیا؟ اب یہ میرے سوچنے کی بات تھی۔ کیا وہ چاہنے لگی تھی کہ میں اُس میں دلچسپی لوں۔ یا وہ مجھے پسند کرنے لگی تھی۔ میرا خیال ہے ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ شاید یہ چاہتی تھی کہ ہم دونوں میں دوستی کی فضا برابری کی سطح پر ہو۔ اب وہ میرے لئے لندن کی ایک لڑکی تھی۔ اور میں اُس کا اپارٹمنٹ شیئر کررہا تھا ـــــ

اس دوران موسم بدل چکا تھا۔ سرمانے لندن کے درختوں پہ بسیرا کرلیا تھا۔ شام جلدی ہونے لگی۔ بازار پانچ بجے بند ہو جاتے تھے۔ ہم دونوں بسیں بدلتے ہوئے اپنے اپارٹمنٹ پہنچتے تھے۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ ہم دونوں کسی نوبیل انعام یافتہ ادیب یا سائنس دان یا امن کے شعبے کے انعام یافتہ کا لیکچر سننے کے لئے رک جاتے تھے اور ایک ساتھ واپس آتے تھے۔ اُس شام بھی ایسا ہی ہوا اور ہم دونوں ایک ہی بس سے اُترے اور اپنے اپارٹمنٹ میں ایک چابی کے ساتھ داخل ہو گئے۔ پھر وہ اپنے کمرے میں اور میں اپنے کمرے میں۔ پھر میں اپنے باتھ روم میں، وہ اپنے باتھ روم میں۔ یہ ایسا تعلق تھا جس کا کوئی نام نہیں تھا۔ دوست بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ جب ہم دونوں اپنی اپنی ڈرنک لے کر بیٹھے تو معلوم نہیں تھا کہ آج ڈنر میں کیا ہوگا؟ اچانک ایک ڈرنک پر مجھے خیال آیا تو میں کچن میں گیا اور دیکھا کہ وہاں تو کھانے کو کچھ نہیں۔ میں نے جائزہ لیا تو فرج میں چکن موجود تھا۔ میں نے کیتھی کو آواز دی اور ہم دونوں مل کے ڈنر بنانے لگے۔ اُس نے پیاز کاٹی، میں نے چکن بنانے کی تیاری کی۔ کیتھی کو مختلف قسم کی ڈبل روٹیاں بہت پسند تھیں۔ وہ پوری بیکری اٹھا لاتی تھی۔ اوپر سے سخت اندر سے نرم ڈبل روٹی مجھے بہت پسند تھی۔ ہم دونوں چھوٹے سے کچن میں ڈنر بنا رہے تھے۔ ساتھ ساتھ ڈرنک بھی چل رہی تھی۔ میں چکن کڑاہی بہت اچھی بناتا تھا۔ وہ مجھے بناتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس دوران اُس نے بتایا کہ بچپن میں اُس نے قبیلے میں جشن کے کئی موقعوں پر دیکھا کہ کسی نے کوئی ہرن یا بارہ سنگھا یا کوئی نیل گائے کا شکار کیا ہے تو سب جمع ہو جاتے تھے۔ پہلے سب مل کے اس جانور کی کھال اتارتے تھے۔ پھر اس کا ایک ایک حصہ الگ کرتے تھے۔ جیسے ہمارے ہاں قربانی کا جانور ذبح ہونے کے بعد اُس کی ایک ایک چیز الگ کر کے کئی طرح بھونی اور پکائی جاتی ہے۔ بالکل اُسی طرح اُس کے قبیلے کے لوگ بھی الاؤ جلاتے اور پھر اُس کے گرد اجتماعی رقص کرتے۔ ڈرم بجتے، سب مل کر گاتے اور بڑے بڑے برتنوں میں سبزیاں، پیاز ڈال کر وہ گوشت پکایا جاتا۔ کلیجی اور دوسرے مختلف حصے الگ پکائے یا بھونے جاتے۔ پھر سارا قبیلہ مل کر وہ بھوجن کرتا۔ کیتھی نے بتایا وہ اپنی ماں کے ساتھ ناچتی تھی۔

اس دوران میں کیتھی کی بات سن رہا تھا اور چکن بھی بنا رہا تھا۔ اُس نے میری آخری ڈرنک بنائی اور اپنی بھی ـــــ میں نے کہا بھی کہ مجھے لگتا ہے یہ ڈرنک شاید زیادہ ہے۔ مگر کیتھی نے کہا یہ میری طرف سے ہے۔ One for the road ـــــ میں نے سوچا مجھے تو کہیں نہیں جانا۔ میری سڑک تو کہیں نہیں جاتی۔ ہم دونوں اس مختصر سے کچن کے کیپسول میں بند تھے۔ وہ سلاد بنا چکی تھی اور میرا چکن ـــــ دھیمی آنچ پر تھا کہ میں نے سبز

مرچیں اس میں ڈال دی تھیں۔ جو آنچ یہاں دھیمی ہوئی تھی۔ اُس نے کیتھی کے اندر آگ پکڑ لی تھی۔ اس نے میرا گلاس ایک طرف رکھا اور اپنا بھی۔ اور پھر وہ بے تحاشا شدت سے میرے ہونٹ چومنے لگی۔ ہم دونوں اب اُسی کیفیت میں کچن سے باہر آ گئے اور لابی میں ہم بہت دیر کی پیاس سے الجھتے رہے۔ اس دوران کیتھی نے اپنی شرٹ اتاری پھر میری شرٹ اتاری اور ہم اُسی کیفیت میں کیتھی کے بیڈروم میں آ گئے اور اُس کے بستر پر گر گئے۔ مجھے لگا افریقہ کے جنگلوں میں آگ لگ گئی ہے اور جانور سب اِدھر اُدھر بھاگ رہے ہیں۔ کیتھی کا قبیلہ مل کر اُس جنگل کی آگ کے گرد اجتماعی رقص کر رہا ہے۔ اس کے قبیلے کے لوگ مل کر موسیقی پیدا کر رہے ہیں ـــــ جنگل میں شیر بپھر گیا ہے اور وہ ہر طرف اپنی شیرنی کے پیچھے دیوانہ ہو کر بھاگ رہا ہے۔ بھیڑیئے چودھویں کے چاند کو نیلے آسمان پر دیکھ کر اجتماعی بین کر رہے ہیں یا خوشی کا اظہار کر رہے ہیں۔ سارے جانور مل کے ایک اجتماعی مظاہرہ کر رہے ہیں اور پھر اچانک جنگل کی آگ خاموش ہو گئی۔

صبح ہم دونوں اپنے اپنے وقت پر نکل گئے۔ اور ہم دونوں نے صبح اپنے اپنے بستر سے کی ـــــ پھر وہی معمول۔ لیکن اس تجربے نے میرے اندر مردانہ اعتبار پیدا کر دیا تھا۔ میں افریقی جنگلوں میں پلی ہوئی لڑکی سے خوفزدہ تھا ـــــ جس میں جنگلوں کی خوشبو کے ساتھ جانوروں کی فطرت کا رچاؤ موجود تھا۔ اور اُس کا جسم دھوپ میں پک کر تانبے کا ہو چکا تھا اور جم کی ورزش نے اُسے اور صیقل کر دیا تھا۔ کیتھی اگلے دو تین دن دیر سے آئی اور کچن سے کچھ لے کر سونے چلی جاتی تھی۔ میں سمجھا اُس میں کوئی تبدیلی آ گئی ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ اُس کے پروفیسر نے اچھی رپورٹ نہیں دی تھی جس سے اس کا سکالرشپ رُک سکتا تھا۔ اس لئے وہ زیادہ محنت کرنے لگی تھی ـــــ میں رات کے کھانے کے لئے اُس کی پسند کی کوئی نہ کوئی ڈش رکھ دیتا تھا اور وہ کھا لیتی تھی۔ اُسے معلوم تھا میں یہ سب اُس کے لئے کر رہا ہوں۔ خود میرا یہ حال تھا کہ کرسمس سے پہلے مجھے اپنے پروفیسر کو مطمئن کرنا تھا کہ میں اپنے موضوع کی ریسرچ کا مواد جمع کر چکا ہوں اور اب صرف مجھے اُسے ترتیب دے کر نتائج نکالنے ہیں ـــــ ایسے میں مجھے ہندوستان کی تاریخ نے ایک سبق یہ سکھایا کہ نام نہاد حاکم طبقے نے چاہے اُن میں مغل تھے، چودھری تھے، راجے مہاراجے تھے، وڈیرے تھے یا سردار تھے، نے اپنے دلالوں کے ذریعے رعایا کے انتہائی ذہین تخلیق کاروں، ہنرمندوں، فنکاروں، مصوروں، نقاشوں، موسیقاروں، سازندوں، گلوکاروں اور اداکاروں کو بے عزت کرنے کے لئے کئی طرح کے نام دیئے۔ مثلاً موسیقی، رقص اور اداکاری کے لئے میراثی، ڈوم ڈھاڑی، ناچے، کنجر، کسبی، طوائف وغیرہ۔ ہنرمندوں کے لئے موچی، نائی، جولاہا، کمی

کمین، بڑھئی، لوہار، کمہار، ٹھٹھیار، بھٹیارہ، سنارہ، ترکھان وغیرہ۔ سب پیشوں کے نام تھے ___ لیکن انہیں تحقیر کی علامت کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اشرافیہ اور حاکموں نے جو زبان استعمال کی وہ آج تک رائج ہے۔ اس دوران مختلف زبانوں کے صوفی شاعروں نے مل کر مزاحمت کرتے ہوئے احتجاج اپنی شاعری کے ذریعے کیا۔ تمام صوفی شاعران فن کاروں اور ہنر مند تخلیق کاروں کے ساتھ کھڑے ہو گئے اور اعلان کیا کہ ہم سب میراثی ہیں۔ ہم سب موچی، نائی اور جولاہے ہیں۔ اگرچہ ہندوستان کے مقامی حاکموں، سرداروں اور راجوں مہاراجوں کو انگریزوں نے اپنی اطاعت اور احترام پہ مجبور کر دیا اور ہر ریاست سے معقول مالیہ اور انتظامی اخراجات کے نام پر ہر سال لگان وصول کرتے رہے۔ ان مقامی حاکموں کے دلالوں اور گماشتوں میں بھی حاکموں جیسی خصوصیات پیدا ہو گئیں اور نیچے تک یہ خصوصیات منتقل ہو گئیں کہ آج بھی ہندوستان کے ہر طبقے میں ماضی کے حکمرانوں، جاگیرداروں اور راجاؤں کی روح کنڈلی مارے بیٹھی ہے۔ بعض مؤرخ اور سوشل سائنس دان اس ذہنی رویے کو انگریزوں کی غلامی کی یاد سے تعبیر کرتے ہیں جو سراسر غلط حقیقت ہے۔ یہ ذہنی رویے انگریزوں سے بھی صدیوں پہلے کے حاکمانہ تسلط کی یاد دلاتے ہیں۔

میری ریسرچ کے ساتھ اتفاق سے کیتھی کی ریسرچ بھی نئے پہلو آشکار کر رہی تھی۔ کرسمس آنے میں چند دن رہ گئے تھے اور یونیورسٹی کی چھٹیاں ہونے والی تھیں۔ جب لندن عملاً بالکل خالی ہو جاتا ہے۔ ہم دونوں ابھی تک اپنے کام میں الجھے ہوئے تھے ___ لیکن ایک شام کیتھی اور میری ملاقات ذرا فرصت کے لمحات میں ہوئی۔ اُس شام ہم دونوں اپنا اپنا ریسرچ ورک اپنے اپنے گائیڈز کو دے آئے تھے اور امید تھی کہ وہ پروفیسر کرسمس کے بعد ہی اُسے ہاتھ لگائیں گے۔ گویا اب ہمیں ایک طرح کی فرصت بھی تھی اور کرسمس کے دنوں میں کیا کرنا ہے؟ یہ بھی ایک سوال سامنے کھڑا تھا۔ ایسے میں اُس شام میں نے دو تین ڈشز بنائیں۔ ایک تو بریانی تھی، دوسری چکن کڑاہی اور تیسری چنے کی دال تھی۔ مجھے پتہ تھا اگلے دو دن ہمارے لئے یہ کافی تھیں۔ اور کیتھی کو بھی بہت پسند تھیں۔ کیتھی کچن میں خوشبو سونگھ آئی تھی۔ چونکہ اُس کے دماغ پر اُس کی ریسرچ سوار تھی جو وہ کئی دنوں کی محنت سے تیار کر رہی تھی تو وہ ڈرنک لیتے ہوئے، اُس پر شروع ہو گئی۔ ڈرنک میرے لئے بھی اُس نے بنائی تھی۔

”ہم افریقی سیاہ فام قوموں کے اندر کوئی پیدائشی کمی ہے۔ کوئی کھوٹ ہے۔ کوئی قومی بے وفائی ہے۔“

”کیا مطلب؟ یہ بات تو ہندوستان کی قوموں میں بھی ہے۔“

''جو میں نے دیکھا اور پڑھا ہے۔ میں تو وہ بتا سکتی ہوں۔ ہماری تاریخ سیاہ فاموں کی بے وفائیوں سے بھری ہوئی ہے۔''

''اور ہماری تاریخ بھی اپنوں کی بے وفائیوں سے بھری ہوئی ہے۔''

''ہماری تاریخ میں سیاہ فام کو سیاہ فام کے خلاف استعمال کیا گیا ہے۔''

''ہماری تاریخ میں بھی انگریز نے اپنوں کو اپنوں کے خلاف استعمال کیا۔''

''ہمارے سیاہ فام غلاموں کی تاریخ بہت طویل ہے۔ زنجیروں، قید خانوں اور اذیت خانوں سے بھری ہوئی ہے۔ ہمارے غلاموں کو ہیرے اکٹھے کرنے کے لئے دریاؤں میں استعمال کیا گیا اور اُن پر ہمارے ہی سیاہ فام مسلح سپاہیوں کو تعینات کیا گیا۔ ہر بیس سیاہ فام سپاہیوں پر ایک سفید فام تعینات ہوتا تھا جو نظر رکھتا تھا کہ سیاہ فام سپاہی کوئی رعایت تو نہیں کر رہا۔ ایسے میں سفید فام کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہمارے ہی سیاہ فام سپاہی ہمارے ہی سیاہ فام غلاموں کو اُن کے اسلحہ سے بھون دیتے تھے۔''

''ہمارے آزادی کے حریت پسندوں کے خلاف انگریزوں نے ہمارے مقامی ہندوستانیوں کو بندوقیں دے کر اُن حریت پسندوں کے خلاف صف آرا کیا۔''

''ایسے ہی ہمارے سیاہ فاموں کے خلاف اپنوں کو استعمال کیا گیا۔ ہمارے خون میں وفا نہیں ہے۔ ہم ایسے ہی رہیں گے۔''

''ہم تو ایک قوم تھے نہیں اس لئے ہر طرح کے قبیلے میں اور گروہوں میں نہ زمین سے وفا تھی نہ اپنے آپ سے، صرف اپنے مفاد سے وفا تھی اور آج تک یہ ہو رہا ہے ـــــ''

کچھ دیر بعد ہم دونوں اپنی اپنی ریسرچ سے باہر آئے اور کرسمس کے بعد تک جو اطمینان حاصل ہو رہتا تھا، اُس پر دھیان دینے لگے۔ اُس شام ہم نے کچن سے چھٹی کی اور ایرانی ریستوران سے کھانا منگوا لیا۔ ڈرنکس کے دوران کیتھی نے بچپن کا ایک واقعہ سنایا۔ جس سے محسوس ہوا وہ ابھی تک سیاہ فام تاریخ میں اٹکی ہوئی ہے۔ اُس نے بتایا کہ میں نے اپنے بچپن میں سیاہ فام قبیلوں کی آپس کی جنگ دیکھی ہے ـــــ قبیلوں میں یہ دستور ہے کہ اگر کسی قبیلے کی عورت دوسرے قبیلے والے لے جائیں تو پھر عورت کا قبیلہ اپنی عورت مانگتا ہے۔ اگر انکار ہو جائے تو پھر دونوں میں جنگ ہوتی ہے۔ ایسے ہی ہمارے قبیلے کی ایک عورت دوسرے قبیلے کا مرد لے گیا۔ دونوں سیاہ فام قبائل ایک دوسرے کے سامنے آ گئے۔ جنگل کے سب پرندے گھونسلوں سے پر پھڑ پھڑا

کر فضاؤں میں پھیل گئے۔ جنگل کے سب جانور دور دور سے اُمڈ آئے اور ایک اونچی پہاڑی پر جمع ہونا شروع ہو گئے۔ میں ایک درخت کے نیچے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ میری نظر جانوروں پر تھی۔ ایسی لڑائیاں تو یہ قبیلے لڑتے رہتے تھے۔ دونوں طرف کے سیاہ فام یہ بھول چکے تھے کہ وہ سب سیاہ فام ہیں۔ اسی مٹی سے ہیں۔ ایک جیسی عادات رکھتے تھے۔ پھر بھی عورت کے لئے قتل و غارت پر اُتر آئے۔ دونوں طرف کے کئی جوان بوڑھے گھائل ہوئے۔ کسی کو نیزہ لگا، کسی کو بھالا لگا، کسی کو لاٹھی لگی ___ بس اسی طرح کا اسلحہ قبیلوں کے پاس ہوتا تھا۔ یہ اسلحہ جانوروں پہ استعمال نہیں ہوتا تھا۔ اپنے سیاہ فام انسانوں پہ استعمال ہوتا تھا۔ اس لئے کہ جانور انسانوں پر حملہ نہیں کرتے تھے ___ انسان ہی انسانوں پر حملہ کرتے تھے۔"

"تو پھر اُس جنگ میں کتنا نقصان ہوا اور کیا وہ عورت واپس آئی؟"

"جب دونوں طرف کے مرد اور عورتیں ایک دوسرے سے لڑائی میں تھک گئے تو وہ عورت سامنے آئی اور اُس نے یہ جنگ رکوا دی اور وہ اپنے قبیلے میں واپس آ گئی۔ لیکن میں نے یہ دیکھا کہ اس دوران جنگل کے سب جانور اونچی جگہ پر جمع ہو کر یہ سب تماشا دیکھ رہے تھے۔ اُن میں شیر شیرنی، ببر شیر، چیتے، ہاتھی، زیبرا، زرافہ، دریائی گھوڑا، گینڈا، بندر، بھیڑیے، نیل گائیں، بھینسے، ہرن، بارہ سنگھے، ریچھ اور لگڑ بگڑ سے لے کر تیندوے تک سب جمع ہو چکے تھے۔ اور وہ سب ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ کہیں گلہری اور جنگلی بلی بھی موجود تھی۔ جب یہ لڑائی ختم ہوئی تو سب جانوروں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور واپس پلٹ گئے۔ اُس دن کسی جانور نے کسی دوسرے جانور کا شکار نہیں کیا۔ بس سر جھکا کر چلے گئے۔"

اُس شام یہ سب کیتھی سے سن کر مجھے محسوس ہوا کہ جنگل کا قانون انسانوں کے قانون سے افضل ہے اس لئے کہ وہ قانونِ فطرت ہے اور ہمارا قانون انسان کا بنایا ہوا ہے اور اُس میں ہر لمحے ترمیم ہوتی رہتی ہے بلکہ سالوں میں کئی طرح کی ترامیم ہو جاتی ہیں۔ انسان سیاست جانتا ہے۔ جانور سیاست نہیں جانتا ___

میں نے اور کیتھی نے اس پر غور کیا ___ اور پھر ہم دونوں یہ سب بھول گئے اور ہم نے کرسمس منانے کے لئے سوچنا شروع کر دیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب اس وجہ سے بھی آ گئے تھے کہ دونوں کی نسلی اور قومی تاریخ ایک جیسی تھی۔ اُس شام ہم نے اپنی بہت سی باتیں کیں۔ جو ہم دونوں کے اندر رہ گئی تھیں اور انہیں رہنا بھی چاہئے کہ انسان اگر بہت سی باتوں کو اندر رکھ لے تو وہ کچے آم کی طرح آم کو پال میں رکھ لیتا ہے جو اندر ہی اندر پک کے تیار ہو جاتا ہے۔ تو ہم دونوں نے اپنی باتوں کو پال میں رکھ لیا تھا۔ وہ شاید کبھی باہر نہ

آسکیں۔ ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ لندن کے اس اپارٹمنٹ میں کرسمس کی چھٹیاں گذارنا ایسے ہوگا جیسے روز ایک جیسا کھانا کھانا ــــــ اور پھر شاید یہ ہم دونوں کے لئے آخری موقع ہو لندن میں کرسمس گذارنے کا۔ یا اس طرح سے دونوں کا مل کر کرسمس منانے کا۔ تو ایسے موقع کو ضائع نہیں ہونا چاہئے۔ ہم نے ایک نقشہ نکالا اور اپنے اپنے وظیفے کے پیسوں کا حساب بٹھایا۔ طالب علموں کے لئے ایسے یورپی ملکوں میں بہت سہولتیں ہوتی ہیں، جن میں ایک یوتھ ہوسٹل کی بھی ہوتی ہے مگر ہم وہ سہولت نہیں لینا چاہتے تھے۔ ہم اس ٹور کو یادگار بنانا چاہتے تھے سو ہم نے ایسے ہوٹل تلاش کئے جو بیڈ اینڈ بریک فاسٹ کے لئے مشہور تھے ــــــ اور اُن میں بھی ہم نے ایسے ہوٹل تلاش کئے جو سستے تھے۔ یہ سوچ کر ہم نے ایرانی ریستوران کا کھانا کھایا اور دھڑام سے اپنے اپنے بستر میں سو گئے۔ جب اُٹھے تو وہ ایک بستر تھا اور میرا بستر تھا ــــــ

لندن میں کرسمس کی تیاریاں مکمل ہو گئی تھیں۔ ہر دکان، ہر شاپنگ مال سج چکا تھا۔ ہر بازار ہر سٹریٹ جگمگا رہی تھی۔ ہم دونوں سارا دن لندن کی سڑکوں پر پیدل چل کے لندن کا لطف اٹھا رہے تھے کہ دوبارہ شاید یہ ہمیں نصیب نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم دونوں وظیفوں پر پلنے والے پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہے تھے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو وائین کی ایک ایک بوتل کرسمس تحفے میں دی اور دونوں نے مل کر پی بھی لی۔

ہم خانہ بدوشوں کی طرح سفر کرنا چاہتے تھے۔ موٹروے پر دونوں نے لفٹ لینے کا تجربہ کیا۔ کہیں وہ آگے کھڑی ہو جاتی تو اُسے دیکھ کر ٹرکوں والے خاص طور پر رُک جاتے جب وہ مجھے بلاتی تو ٹرک ڈرائیور بُرا سا منہ بناتے گویا اُن کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ یہاں مجھے معلوم ہوا کہ سیاہ فام لڑکی کی اس گورے دیس میں بہت اہمیت ہے۔ جب بھی کیتھی سڑک پر اشارہ دیتی گاڑی رک جاتی تھی اور جب وہ مجھے بلاتی تو لفٹ دینے والے کے ارمانوں پر اوس پڑ جاتی تھی۔ اس طرح ہم دونوں نے قریب قریب ہزار میل کا سفر مفت میں کیا۔ اور ہم بیڈ اینڈ بریک فاسٹ کے ہوٹل میں پہنچ جاتے تھے۔ کیتھی کی اہمیت کا اندازہ مجھے اس سفر میں ہوا۔ کیتھی کو اپنے اس آرٹ کا پتہ پہلے سے تھا۔ اس لئے وہ خود سڑک پر آ جاتی اور مجھے چھپا دیتی تھی ــــــ دو تین دفعہ ایسا بھی ہوا جب گاڑی رکی اور کیتھی نے مجھے بلایا اور میں کسی درخت یا کسی اوٹ کے پیچھے سے نکلا تو گاڑی والے نے گاڑی دوڑا دی اور نکل گیا۔ ایسے میں جو پھنس گیا وہ پھنس گیا۔ ہم نے ویلز، لیک ڈسٹرکٹ اور سکاٹ لینڈ کے مختلف علاقوں تک کرسمس کے دنوں کو پھیلا دیا۔ یہ وہ دن تھے جب لوگ عام طور پر گھروں سے باہر نہیں نکلتے اس لئے ہمیں بآسانی سستے ہوٹل مل گئے۔ بس یوں سمجھیں بعض ہوٹلوں نے تو صرف بریک فاسٹ کے پیسوں

ہیں رہائش مفت میں فراہم کر دی تھی۔ ہم دونوں دور چھپے کھیتوں میں سے ہوتے ہوئے درختوں میں گھری کسی لیک کے کنارے بیٹھ جاتے اور اپنے ساتھ کھانے پکانے کا سامان لے جاتے اور اکثر وہیں پکاتے۔ وہاں ایک دو جگہیں ایسی تھیں جو ٹورسٹس ایریاز کے لئے مخصوص تھیں۔ وہاں باتھ روم، کچن، پارکنگ ایریا سب کچھ تھا۔ مگر خالی پڑا تھا۔ کرسمس کی وجہ سے کس نے آنا تھا۔ سو ہم اس کا اچھا استعمال کرتے۔ کھلے آسمان کے نیچے درختوں میں ہم نے محبت کے ہر طرح کے تماشے کر ڈالے۔ جو میری زندگی کے عجیب و غریب لمحات ہیں ــــ

ایک ایسی ہی جگہ ہم پہنچے تو پارکنگ ایریا میں ایک کاروان موجود تھا۔ ہم نے دستک دی تو میاں بیوی باہر آئے اور ہم سے ملاقات ہوئی۔ معلوم ہوا وہ بھی میاں بیوی نہیں ہیں۔ ہماری طرح ہیں۔ بس تو پھر انہوں نے اُس دن ہماری میزبانی کی۔ وہ پیسے والا جوڑا تھا۔ اُن کی کاروان گاڑی میں بار تھی، کچن تھا اور ہر طرح کی سہولت کے ساتھ ہر طرح کی فوڈ تھی۔ جب انہیں پتہ چلا کہ میں اچھا پکا لیتا ہوں تو انہوں نے کچن میرے حوالے کیا۔ میں نے اپنی پسند کی ڈرنک لی اور ظاہر ہے اس دفعہ مہنگی تھی کیونکہ وہ میزبان کی طرف سے تھی۔ یہ دوپہر یادگار تھی کہ باقاعدہ ہم نے لیخ ندی کے کنارے درختوں میں ڈائننگ ٹیبل لگا کر لیا۔ سب نے میرے کھانے کو خوب جی بھر کے انجوائے کیا۔ یہ تجربہ ہمیں سکاٹ لینڈ میں فورٹ ولیم شہر سے ذرا دور ایک جنگل کے پاس ہوا ــــ یہ فورٹ ولیم وہ شہر ہے جس کے نام پر انگریزوں نے کلکتہ میں پہلا اورینٹل کالج فورٹ ولیم کالج کے نام سے قائم کیا اور کیوں کیا؟ یہ بھی وہاں جا کر معلوم ہوا ــــ انگریز نے سکاٹ لینڈ کے باشندوں کو غلام بنا رکھا تھا اور جس طرح پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں پنجاب اور ہندوستان کے مختلف علاقوں سے جبری بھرتی کی گئی تھی، اسی طرح جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے کلکتہ کے ساحلوں پر بسیرا کیا تو جو پہلی فوجی بٹالین وہاں اُتری اُس میں فورٹ ولیم شہر کے سکاٹش کسان تھے۔ جنہیں برطانوی فوج نے جبری بھرتی کیا تھا۔ اس لئے اس شہر کے نام پر فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا۔ ویسے فورٹ ولیم ایک قصبہ تھا۔ شہر تو وہ کسی بھی طرح سے نہیں لگتا تھا۔ ہم دونوں اُس سے آگے نکل گئے تو ہمیں جھیلیں ملیں، جنگل ملے، اور آبادی کے بغیر علاقے ملے ــــ میں اور کیتھی جو ریسرچ کے لوگ تھے۔ یونہی بیٹھے بٹھائے ایڈونچر میں آ گئے۔

اب ہم نے واپسی کا سفر شروع کیا تو پھر کرسمس کی چھٹیاں تھیں۔ ہمیں راستوں میں خالی سڑکیں، خالی گاڑیاں اور خالی شہر ملے ــــ اور یہی ہم چاہتے تھے۔ کیتھی اور میرا رشتہ اس دوران بہت مضبوط ہو چکا تھا۔ محسوس ہوتا تھا ہم میاں بیوی ہیں اور عرصے سے ساتھ رہ رہے ہیں۔ مجھے محسوس ہوا عورت مرد کا رشتہ ہوتا

ہی کیا ہے؟ بہت کم بستر کی سیکس اور بہت زیادہ روزمرہ کی قربت۔ اب اگر روزمرہ کی رفاقت کمزور ہو تو بستر کے تعلق میں رکھا ہی کیا ہے۔ دس منٹ بیس منٹ کی فضول سی ایکسر سائز اور بس ـــــ

میں نے محسوس کیا کہ زندگی میں مجھے جتنا جینا تھا وہ تو میں نے جرمنی میں سوزین اور لندن میں کیتھی کے ساتھ رہ کے جی لیا ہے۔ اب آگے فیملی پالنے کی ضرورت کیا ہے۔ لیکن یہ دونوں تجربے تو ذمہ داری کے بغیر تھے۔ شادی کا تجربہ اور وہ بھی مشرقی ملک میں ظاہر ہے بہت بڑی ذمہ داری ہوا کرتا ہے۔ اُس وقت میں ایک رومانس میں اڑا جا رہا تھا۔ لگتا تھا میں پھر کسی اتفاقی رشتے میں بندھ جاؤں گا اور اس طرح زندگی کا خوبصورت زمانہ گذار کر بڑھاپے کی سیڑھیوں پر اکیلا شراب کے سہارے بیٹھ کر ان رومانوی دنوں کو یاد کروں گا۔ اور ایک دن ان ہی سیڑھیوں پر ایک اوورکوٹ میرے مردہ جسم پر پڑا ہوگا ـــــ اور کارپوریشن کی گاڑی آئے گی اور لے جائے گی۔ ذمہ داریوں کے بغیر تو پھر یہی انجام ہوتا ہے۔ ایسا انجام دنیا کے بے شمار مصوروں، شاعروں، ناول نگاروں، موسیقاروں اور فنکاروں کا ہو چکا ہے ـــــ لیکن کیا ضمانت ہے کہ ذمہ داریاں نبھانے کی مکمل جدوجہد کرنے کے بعد بھی مصوروں، شاعروں، ناول نگاروں، موسیقاروں اور فنکاروں کا یہ انجام نہ ہو۔ میں نے پڑھا ہے اور کم از کم اپنے ایشیائی ملکوں میں یہ دیکھا ہے کہ کسی بھی تخلیقی اور ذہنی مشقت کرنے والے نے اپنے شعبے میں مکمل خون جلایا ـــــ دن رات ایک کر کے اپنے خاندان کو معاشی سطح پر آسودہ کیا۔ اولاد کو دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں پہنچایا۔ اپنے حصے کی شہرت بھی سمیٹی۔ اپنے حصے کا دیا بھی جلایا۔ دن رات جدوجہد کے پسینے میں ہانپتا رہا ـــــ بالآخر تھک کر گر گیا۔ اُس پر ذمہ داریوں کی چادر ڈال دی گئی۔ جنازے میں چار ہمسائے اور دو ملازم شریک ہوئے کہ اُس دن اخبار والوں کی چھٹی تھی اور پھولوں کی دکانیں بھی بند تھیں۔ اُس کے بچوں کو ترقی یافتہ ملکوں میں اطلاع دے دی گئی تھی۔ مگر سب کی فلائٹس کئی کئی دن بعد کی تھیں ـــــ

میں نے سوچا کہ جب بغیر ذمہ داری نبھائے بھی یہی انجام ہے اور ذمہ داری کی گاڑی کھینچنے کے بعد بھی یہی انجام ہے تو پھر کیا کیا جائے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ آدمی کو اُس لمحے پر یقین رکھنا چاہئے جو اُس کے پاس ہے۔ اُسے بہتر خوشی کے ساتھ گذارنا چاہئے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ فٹ پاتھ پر گر کر مر جائے کسی شاعر کی طرح یا لاہور ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر گر کے مر جائے صوفی تبسم کی طرح یا اپنے بنگلے کے ٹھنڈے کمرے میں یا فائیو سٹار ہسپتال میں کیا فرق پڑتا ہے؟

میں ایک تاریخ دان بننے کے لئے یہاں جرمنی کے بعد لندن آیا تھا۔ ایک تاریخ دان شہرت کے محاذ

پر کیا کر سکتا ہے۔عوام اور مقبولیت کے کتنے دروازے کھول سکتا ہے۔ وہ تو ماضی کا فنکار ہے۔ وہ تو ہزاروں سالوں کا مسافر ہے۔اُسے فوری مقبولیت کی سیڑھی کیوں ملے گی۔وہ فلم کا اداکار نہیں۔وہ لاکھوں دلوں کا گلوکار نہیں۔ وہ موسیقار نہیں۔ وہ بڑا مصنف نہیں، جس کے لاکھوں قاری ہوتے ہیں ــــــ وہ تو آثار قدیمہ کی دیمک ہے۔ جو آہستہ آہستہ اپنا سفر طے کرتی ہے۔تو مجھے تو کچھ بھی نہیں ملنے والا تھا۔لیکن میں اُن بڑے رائٹرز بڑے مصوروں اور بڑے ناول نگاروں کی آنکھیں کھول سکتا تھا۔اور اُن کے لئے بڑے ناولوں کا خام مواد بن سکتا تھا۔اور میں جانتا تھا کہ مجھے کتنی بیدردی سے ناول نگار استعمال کرے گا اور میرا ذکر تک نہیں کرے گا۔ چاہے وہ ناول کسی کلاسیکی شاعر کی زندگی پر ہو ــــــ کسی صحرا میں خشک ہونے والے دریا پر ہو یا کسی گمشدہ تہذیب پر ہو یا کسی ایسے کردار پر ہو جس کو میں نے تاریخ میں اُجاگر کیا ہوگا۔مؤرخ کا نام کوئی ناول نگار نہیں لے گا ــــــ یہ تعصب ناول نگار کا ہمیشہ رہے گا کہ وہ مؤرخ سے ڈرتا ہے۔اُس کے مدمقابل صرف تاریخ دان ہے۔ کیونکہ تاریخ دان کی زندگی صدیوں پر پھیلی ہوتی ہے اور ناول نگار کی زندگی کبھی کبھی سالوں تک اور کبھی کبھی بڑھ جائے تو سینکڑوں سالوں تک اور اگر ناول تاریخ کے دائرے میں آجائے تو ہزار سالوں تک ــــــ مگر مؤرخ کی زندگی کا کوئی حساب نہیں ہوتا۔اگر اُسے اعتبار مل جائے تو وہ صدیوں تک پھیل جاتا ہے۔مگر وہ اس مقبولیت کے لئے صدیوں کی زندگی تو نہیں پا سکتا۔بس یہی فرق ایک ناول نگار اور مؤرخ میں ہے۔

اب میں سوچ رہا تھا کہ ''انڈے دیں بی فاختہ اور کوے موج اُڑائیں'' تو ایسے میں مؤرخ بن گئے فاختہ کے انڈے اور کوے بن گئے ناول نگار۔ مجھے اپنی ریسرچ میں جب برصغیر کی مختلف قوموں اور ریاستوں کے نوابوں، راجوں، جاگیرداروں، راجپوتوں اور سرداروں کا چہرہ دِکھا تو میری سمجھ میں آیا یہاں تو صدیوں تک ترقی پسند نظریے اور عوامی انقلاب کا خواب تعبیر نہیں پا سکتا تھا۔پھر ہمارے ترقی پسند ادیبوں نے کیا سوچ کر اپنا وقت ضائع کیا؟ یہاں کے کسانوں، مزدوروں، کلرکوں اور نچلے طبقے کے پیشوں کی نفسیات میں اپنی اپنی ریاستوں کے آقاؤں کا خمیر رچ بس چکا تھا۔یہ سوال میں سجاد ظہیر، فیض احمد فیض اور علی سردار جعفری سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ لوگوں نے عام قاری کے دلوں میں خواب تو پیدا کیا، لیکن اسی خواب میں رومان پرور جذبات کا رس گھول دیا جس سے اُس قاری نے آپ کے مشاعروں کو گرما دیا اور آپ کے شعری مجموعے بکنے لگے۔اِس سے آگے تو نہ کچھ ہو سکتا تھا نہ ہوا۔شاید آپ کو بھی اس کا علم تھا کہ آپ صرف اپنی وقتی شہرت کا چراغ جلا رہے ہیں۔روس اور چین تو اتنے دور تھے کہ اُن کے سرخ سویرے کی آنچ تو عام آدمی کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتی

تھی۔ تو یہ خوابوں کی فصل اُگانے والے آپ تھے جو زمین کی صلاحیت دیکھے بغیر خوابوں کے بیج ڈال رہے تھے۔ مگر آپ ایسا اس لئے کر رہے تھے کہ آپ کو یہ زرخیز زمانہ مل جائے جس میں ترقی پسندی کا پھریرا لہرانے کے تمام تر امکان موجود تھے۔ اور اس میں آپ سب کی شہرت کا سامان موجود تھا____

اب میں اور کیتھی لندن واپس آ گئے۔ نیا سال آیا اور ہم پھر سے اپنے اپارٹمنٹ میں آ گئے۔ جہاں ہماری دوڑ پھر سے شروع ہو گئی۔ ہم دونوں کے فائنل ریسرچ پروجیکٹ کا مرحلہ آ گیا۔ اس دوران کیتھی اور میں بہت قریب آ چکے تھے۔ کیتھی اور کسی بھی مشرقی لڑکی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ میں اُس سے شادی کر سکتا تھا مگر وہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ اُسے جس فاؤنڈیشن نے یہاں تک پہنچایا تھا اُس نے اُس سے بانڈ بھروایا تھا کہ وہ اپنی تعلیم کے دوران شادی نہیں کرے گی اور واپس اپنے افریقی ملک آ کر اپنے لوگوں کی خدمت کرے گی۔ شادی کے لئے میں بھی تیار نہیں تھا۔ صرف میں اُس کی عزت اور بھروسہ رکھنے کے لئے یونہی بات کر رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا یہ ہم دونوں کے لئے ٹھیک نہیں ہے۔ اب ہم دونوں جو اپنے اپنے خطّوں کی تاریخ کا بیگیج اٹھائے ہوئے تھے، حیرت میں ڈوبتے گئے کہ تہذیب و تمدن کے حوالے سے جو تصورات راسخ ہو چکے تھے وہ اکثر غلط تھے اور مؤرخ اندھا دھند اُن تصورات کے حوالے سے برصغیر کے تمدن اور ثقافت کے بنیادی مظاہر جن میں پہناوا، پکوان اور گھریلو رہن سہن کے ٹوٹکے شامل ہیں، پر ایسے حاشیے چڑھائے ہوئے تھے کہ میں حیران رہ گیا۔ ہر بات کو ترکوں کے کھاتے میں ڈال دیا گیا تھا۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں خلافت کی تحریک نے ہمیں ترکوں کو ہیرو ماننے پر مجبور کر دیا تھا اور یہ آج بھی ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ جبکہ ہم نے نہ سندھ کی طرف دیکھا نہ بلوچستان کی طرف نہ بنگال کی طرف نہ راجستھان کی طرف نہ کیرالہ کی طرف نہ گجرات کاٹھیاواڑ کی طرف نہ لکھنؤ کی طرف نہ کشمیر کی طرف۔ اگر ہم ان علاقوں کے تمدن اور ثقافتوں کو دیکھ لیتے تو ہمیں اپنی تہذیب پر کسی اور بیرونی حملہ آور کا ملمع چڑھانے کی ضرورت نہ ہوتی____ اب ہوا یہ کہ سب پہناوے ہمارے اپنے تھے۔ سب پکوان ہماری اسی دھرتی کے تھے۔ دھوتی ساڑھی کیسے بنی۔ شلوار سکڑ کر پاجامہ کیوں بنی____ پلاؤ اور آلو گوشت میں ترکی یا سنٹرل ایشیا کیسے گھس آیا۔ یہ ساری غلط فہمی کی تاریخ ہے جسے میں نے ثابت کیا____

ہُوا یہ کہ ہر شے اپنی زمین سے اُگی ہوئی تھی اور ہر شے دیسی آب و ہوا میں پلی تھی۔ تمام مصالحے اسی سرزمین سے تھے۔ ساری ٹیکسٹائل اسی دھرتی کی تھی مگر ہمارے مؤرخ چونکہ امپیریلزم اور سامراج کے گُن گانے والے تھے، اس لئے انہوں نے ہماری تہذیب، تمدن اور ثقافت کے تمام مظاہر پر حملہ آوروں کے ٹیگ

لگا دیئے۔ جو شے ہماری تھی وہ ہماری نہ رہی۔ ہر پہناوے پر ہر پکوان پر جو کہ ہمارا تھا، اُس پر حملہ آور کا ملمع لگا دیا گیا۔ اور آج تک یہ تصورات ہماری زندگی اور ہماری تاریخ کے اعصاب پر چھائے ہوئے ہیں۔ ایسی ہی بات کیتھی نے کی کہ ہماری تاریخی روایات پر پانی پھیر دیا گیا ہے۔ اور افریقی تمدن پر امریکی امپیریلزم اور امریکی نارسی ازم اور امریکی سُپر کلچر نے اپنے ٹیگ لگا دیئے۔ ہمیں جنگلی قبائل، خانہ بدوش، پسماندہ اور جاہل اقوام کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ اور ہم ہمیشہ کے لئے ایسے ہی رہیں گے۔ جبکہ ہم افریقی قبائل اور افریقی اقوام نے جو جدوجہد کی ہے اور جس طرح اِس کائنات میں اپنی جستجو کی ہے۔ اُس کو کوئی امریکی کہیں بھی تسلیم نہیں کر سکے گا۔

اب یہاں میں اور کیتھی ایک صفحے پر آ چکے تھے کہ ہمارا رشتہ اب عورت مرد کا نہیں تھا۔ مظلوم اقوام کا تھا ــــــ ہماری تاریخ ہمیں بتا رہی تھی کہ دنیا کی اکثر تاریخیں غلط لکھی گئی ہیں اور ہم دونوں اُن مظلوم قوموں میں سے ہیں جنہیں لکھنے والے مؤرخ سب کے سب بیوپاری تھے۔ اور انہوں نے حملہ آور اقوام کی ساری خصوصیات کو اس طرح ہضم کر لیا تھا جیسے کتے کارپوریشن کا کچلا کھاتے ہیں اور پھر ہمیشہ کی نیند سو جاتے ہیں۔

اصل تاریخ میں جو میں نے اور کیتھی نے دریافت کرنے کی کوشش کی وہ ہم دونوں کو لوک گیتوں، ٹپوں، ماہیوں، صوفیاء کی شاعری، قدیم لوک دانش، لوک قصوں کہانیوں اور پرانی داستانوں سے ملیں ــــــ کیتھی نے بتایا افریقی دانش کے خزانے بھی لوک گیتوں، لوک قصوں اور قبائلی روایات میں چھپے ہوئے ہیں اور جدید دنیا افریقی میجک کو تو یاد رکھتی ہے۔ اُس کی پراسرار جادوائی کہانیوں کا ذکر تو کرتی ہے۔ کبھی افریقی فلسفے، افریقی تخلیقی فنون اور افریقی معاشرت پر غور نہیں کرتی۔ اس لئے پوری دنیا میں کالے گینگسٹرز، غنڈے، جیب کترے، لٹیرے اور قانون توڑنے والے ہوتے ہیں۔

ہم دونوں دنیا کے تاریخ دانوں اور معاشرتی تجزیہ نگاروں کے تعصبات پر کڑھتے رہے۔ پھر ہنستے رہے اور اب ہم دونوں کے بچھڑنے کے دن قریب آ رہے تھے۔ مجھے پاکستان اور امریکہ سے ایک دو یونیورسٹیوں سے پڑھانے کی آفرز آ رہی تھیں۔ لیکن میں ابھی اپنا یہ پراجیکٹ مکمل کرنا چاہتا تھا۔ اور کیتھی کو اُس کی فاؤنڈیشن واپس افریقہ لے جانا چاہتی تھی کہ اُس نے اُن کے ساتھ بانڈ بھرا ہوا تھا۔ ہم بچھڑنے کے بالکل قریب تھے کہ ہمیں یقین تھا ہم کبھی دوبارہ نہیں مل سکیں گے۔ جیسے ایشیا کبھی افریقہ سے نہیں مل سکتا۔ ہم دونوں اپارٹمنٹ میں شام کے بعد آتے تھے اور کھانے پینے کا ہوش تک نہیں ہوتا تھا مگر ایک دن جب میں باہر سے ایرانی ریستوران کا کھانا لے کر آیا تو اپارٹمنٹ میں بے شمار خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں۔ پھر میں نے دیکھا کیتھی

کچن میں تینوں چولہے جلا کر تین طرح کی ڈشز بنانے میں مصروف ہے۔

خوشبوئیں جانی پہچانی تھیں۔ اُس نے جو مجھ سے سیکھا تھا اب اُس کی مشق کر رہی تھی۔ اُس شام اُس نے چکن کڑاہی، لیمب بریانی اور چنے کی دال بنائی۔ مارکیٹ سے ہر شے وہ خود خرید کے لائی تھی۔ اُس نے مجھے کچن میں نہیں آنے دیا اور سب کچھ خود ہی بنایا۔ پھر میں نے اُس کے لئے اور اپنے لئے ڈرنک بنائی۔ اور جب کھانے تیار ہو گئے تو وہ میرے پاس آکر ڈرنک کرنے لگی۔ اس نے دال کو جو تڑکا لگایا تھا اُس کی خوشبو آ رہی تھی۔ بریانی پر زعفران کا پانی اور تلے پیاز کو جب اوپر سے چھڑکا تو مجھے خوشبو سے اندازہ ہو گیا کہ اب بریانی دم پر آ گئی ہے۔ اب ہمارے بچھڑنے کا موسم تھا۔

اُس نے کہا۔" وہ اپنے ساتھ میرے بنائے ہوئے کھانے لے کر جائے گی۔ ہو سکتا ہے وہاں ہوٹل کھول لے۔"

"تم ایسا کیوں کرو گی؟ اتنی بڑی تعلیم کے بعد تمہیں تو کسی افریقی علمی ادارے کا سربراہ لگا دیں گے۔"

"وہ اپنی جگہ مگر میں ہوٹل ضرور کھولوں گی، تمہارے نام کا۔"

"اور ایک دن میں کسی کانفرنس میں وہاں آیا اور اچانک سامنے میرے نام کا ہوٹل آ گیا جس پر لکھا ہو گا پاکستانی اور افریقی کھانوں کا بہترین امتزاج۔ تو میں تمہیں ڈھونڈ لوں گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ امتزاج کیا ہوتا ہے؟"

یہ فیوژن ہوتا ہے۔"

"اگر پاکستانی اور افریقی موسیقی کو ملا دیں تو وہ بھی فیوژن ہو گا؟"

"افریقی موسیقی میں کچھ بھی نہیں مل سکتا ــــــ اُسے افریقی ہی ہونا چاہیے۔"

اُس رات ہم بہت قریب تھے اور ان دنوں کو یاد کر رہے تھے جو ہمارے درمیان گذرے تھے۔ ہمیں ہمیشہ کے لئے بچھڑنا تھا۔ اس لئے ذرا ذرا سی بات یاد آ رہی تھی۔ ایک دوسرے پر رُعب جمانے کے لئے کیا کیا طریقے استعمال کئے گئے۔ ایک دوسرے کیلئے خود کو قابل قبول بنانے کے لئے کیا کیا پرفیوم استعمال ہوئی۔ سب کچھ ہم نے تسلیم کر لیا۔ اس دوران ہم جسمانی طور پر ایک دوسرے میں شریک ہو چکے تھے۔ ڈرنکس مکمل ہونے کے بعد اُس نے کھانا لگایا اور خوشبو لندن میں پھیل رہی تھی۔ اُس رات پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کے جتنے بھی ریستوران تھے، سب میں اگر غیرت ہوتی تو وہ سب گھٹنے ٹیک کر کیتھی کے سامنے

آتے اور کہتے۔ ''دَسی گریٹ ہوہمارانی آف افریقہ۔''

اب ہم دونوں کے پاس وقت نہیں تھا۔ اس لئے ہر وقت ہم سڑکوں پر ہوتے تھے۔ لندن میں یہ زمانہ علمی ادبی اور تعلیمی اعتبار سے بہت فعال ہوتا ہے۔ کانفرنسیں، فیسٹیول، سیمینارز، مصنف سے ملاقات، کسی ملک کے نوبیل انعام یافتہ سائنس دان یا ادیب سے ملاقات، اس زمانے میں مجھے سائنس دانوں کے لیکچر سننے اور اُن سے ملاقات کی تقریبوں میں جانے کا موقع ملا___ تو میں نے محسوس کیا کہ نوبیل انعام یافتہ سائنس دانوں کو سننا ضروری ہے۔ اگر آپ تاریخ یا ادب کو سمجھنا چاہتے ہیں___ میں نے دو تین ایسے سیشن سنے جن میں نوبیل انعام یافتہ سائنس دانوں نے گفتگو کی۔ میں نے یہ سمجھا کہ تاریخ تمدن اور ادب کو ہم ان سائنس دانوں کی باتوں کو سنے بغیر نہیں سمجھ سکتے۔ مجھے جرمن نوبیل انعام یافتہ ادیب برتولت بریخت یاد آیا جس نے ڈرامہ ''گلیلیو'' لکھا اور اُس میں پوری دنیا کے لئے ایک تاریخی جملہ لکھ دیا۔ بلکہ ایک نہیں دو جملے۔ وہ دو جملے یہ تھے۔ جب گلیلیو کو پھانسی کی سزا ہوئی تو اُس کے شاگردوں نے کہا کہ وہ اپنے سچ کا عدالت میں انکار نہ کرے چاہے پھانسی چڑھ جائے۔ جبکہ اُس کی بیٹی نے باپ سے کہا کہ وہ صبح عدالت میں اس بات سے انکار کر دے کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے تا کہ مذہبی پنڈت خوش ہو جائیں اور وہ پھانسی سے بچ جائے___ ایسا بیان دینے سے زمین سورج کے گرد چکر لگانے سے رک تو نہیں جائے گی۔ اگلے دن گلیلیو نے عدالت میں بیٹی کی بات مان کر بیان سے انکار کر کے جان بچالی۔ جب وہ عدالت کی سیڑھیاں اتر رہا تھا تو شاگردوں کے گروہ نے سامنے سے آ کر طنز کیا۔ افسوس آج ہماری قوم نے ایک ہیرو کو جنم دینے کی شکتی کھودی۔ گلیلیو نے یہ سنا اور دو جملے کہے۔ پہلا یہ کہ افسوس اُس قوم پر بھی ہے جسے ہر روز ایک نیا ہیرو چاہئے۔ اور دوسرا یہ کہ ہم میں اتنی شکتی نہیں کہ سچ کا بھاری پتھر اُٹھا سکیں۔ ہم میں بس اتنی شکتی ہے کہ ہم سچ کو ذرا سا دھکا دے کر آگے بڑھا دیں۔ اور میں نے آج کر دیا ہے___ مجھے اور کیتھی کو سائنس دان ہی دنیا کی سب سے بڑی حقیقت معلوم ہونے لگے۔ مؤرخ اور ادیب اُن جیسے کھرے نہیں ہوتے۔ ایک دوسرے کا خون پی کر زندہ رہتے ہیں۔

لندن___ جنوری کا آخر ہے۔ شدید سردی۔ ہر سڑک پر سیاہ رنگ کے لمبے کوٹ ہر مرد اور عورت نے پہن رکھے ہیں۔ پانچ بجے شہر بند ہو جاتا ہے۔ یونیورسٹیوں کے طالب علم اور اُستاد اپنی اپنی بسیں، انڈر گراؤنڈ ٹرین اور اپنی اپنی ٹرانسپورٹ لے کر نکل جاتے ہیں۔ کچھ لمحوں میں سڑکیں خالی ہو جاتی ہیں۔ یہ شہر کا ایسا منظر ہوتا ہے کہ جس پر رشک آتا ہے۔ اُس کے بعد لندن شہر کے سارے پب، سارے کلب، سارے

ریستوران، سارے تھیٹر ہال، سارے کافی ہاؤس، سارے سینما ہال کھل جاتے ہیں۔

ایسے میں ایک دن کیتھی نے مجھے یونیورسٹی کے ایک ریستوران میں لنچ پر دیکھ لیا۔ اور ہم دونوں اپنی اپنی پسند کے ساتھ ٹرے میں لنچ لے آئے اور مشکل سے خالی دو سیٹوں پر بیٹھ گئے کہ یونیورسٹی ریستورانوں میں لنچ پہ جگہ ملنا مشکل ہوتا ہے۔ کیتھی نے حکم لگایا کہ یونیورسٹی سے جلدی نکلنا ہے اور مارکیٹس بند ہونے سے پہلے ہم نے ایک بڑی شاپنگ چین میں جانا ہے۔ اب لنچ کے بعد ہم دونوں کے شعبے ساتھ ساتھ ہونے کی وجہ سے ہم ایک ساتھ نکلے اور معلوم ہوا کہ میرا پروفیسر تو کہیں آئرلینڈ گیا ہوا ہے۔ وجہ محض یہ معلوم ہوئی کہ میرا پروفیسر اپنے تاریخی شعور اور تاریخی دیانت داری کا ثبوت دینے کے لئے آئرلینڈ ایک سیمینار میں جا چکا ہے۔ یہ وہ وقت تھا کہ انگلینڈ کو اپنے یورپین ملکوں کو دوسری جنگ عظیم کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لئے برٹرینڈ رسل اور چرچل کے بیانات کا سہارا لیتے ہوئے، آئرلینڈ، سکاٹ لینڈ اور دیگر محکوم علاقوں سے تعلقات بنانے کے لئے معاشرتی اور علمی فضا بنانے کو اہمیت دینا پڑی ـــــ میرا پروفیسر ہر طرح سے حکومت برطانیہ کے ایک پرزے کے طور پر کام کر رہا تھا۔ بلکہ ہر اونچے عہدے کا یونیورسٹی پروفیسر اسی طرح کے کام پر مامور تھا۔

میں اور کیتھی اُس شام سے پہلے ایک مشہور شاپنگ مال میں گئے اور وہ مجھے ایک مشہور برانڈ کے سٹور میں لے گئی اور مجھے معلوم تھا کہ یہ مہنگا سٹور ہے۔ اُس نے مجھے کہا تم میری طرف سے یہاں سے اپنی پسند کا سوٹ لے لو۔ میں نے کہا۔ ”کیتھی، یہ تو بہت مہنگا ہے اور میں جانتا ہوں کہ تمہیں ایک فاؤنڈیشن وظیفہ دیتی ہے۔ میں یہ نہیں لے سکتا۔“

”تمہیں نہیں پتہ میری فاؤنڈیشن مجھے کرسمس پر افریقہ کے اپنے شہر تک کا جہاز کا ٹکٹ دیتی ہے اور کرسمس الاؤنس دیتی ہے۔ جو اس سال میں نے بچا لیا ہے۔ انہی پیسوں سے میں تمہیں یہ گفٹ دے رہی ہوں۔“

”اوکے تو پھر میری فاؤنڈیشن نے بھی مجھے پاکستان تک کا ٹکٹ کرسمس کی چھٹیوں کے لئے دیا تھا۔ میں نے بھی وہ بچا لیا تھا ـــــ اس حساب سے اب تم بھی مجھ سے گفٹ لو گی۔“

”ہاں میں لوں گی۔ مجھے اسی طرح کے سٹور میں لے جاؤ۔ میں لے لوں گی۔“

اب اس طرح یہ تحفوں کا تبادلہ ہو گیا۔

اب ہمارے پروفیسر آ گئے اور ہماری پیشی ہوئی اور ہم نے اُن سے اپنی اپنی ریسرچ پر دستخط ثبت کرائے۔ اور ہم دونوں کو یقین تھا کہ ان دونوں پروفیسروں نے ہماری ریسرچ کا ایک بھی لفظ نہیں پڑھا تھا۔

یہ حال تھا انگلینڈ کی یونیورسٹیوں کا۔ اُس شام ہم بہت ہنسے کہ ہم دونوں پر ہماری فاؤنڈیشنز نے اتنا خرچ کیا اور جو محنت ہم نے کی، اُسے پڑھا ہی نہیں گیا ـــــ میری جو ریسرچ تھی اُس نے برطانوی آقاؤں کو آئینہ دکھایا تھا جسے میرے پروفیسر نے قبول کیا تھا۔ اسی طرح کیتھی نے بھی افریقی غلاموں کا کیس اچھی طرح پیش کیا، جس پر اُس کے پروفیسر نے اُسے نہ صرف قبول کیا کہ یہ بات اُس کے حق میں جاتی تھی ـــــ اُس نے عالمی فورم پر افریقی اور کمزور اقوام کے حق میں اس لئے موقف اختیار کیا تھا کہ اس سے اُسے لندن کی یونیورسٹی میں اگلے گریڈ میں لیا جا سکتا تھا۔

اب ہم دونوں سرخرو ہو کر اپنے اپارٹمنٹ میں آ گئے اور یہ ہماری آخری شام تھی اور اگلے دن میری پاکستان کی فلائیٹ تھی۔ میں کیتھی کے ساتھ پوری رات جاگنا چاہتا تھا لیکن ہم نے فیصلہ کیا کہ آج کی شام ہم گھر نہیں بیٹھیں گے تو ایسے میں ہم دونوں باہر نکل گئے۔ اور پورا سینٹرل لندن ہمارے قدموں میں تھا ـــــ گورے ہم دونوں کو رُک کر دیکھ لیتے تھے کہ کیتھی کا قد گوروں سے ذرا اونچا تھا ـــــ ہم ایک پب میں گئے۔ بیئر لی۔ پھر دوسرے پب میں گئے۔ بلڈی میری لی اور نکل گئے۔ ایک اور پب میں ریڈ وائین لی اور نکل گئے۔ ہم لندن کو چکھنا چاہتے تھے اور اُس کا ہر ذائقہ اُس رات ہم اپنے اندر اتارنا چاہتے تھے۔ ایک وقت ایسا بھی آ گیا کہ ہم اپنے فلیٹ واپس آتے ہوئے بہت خوشی میں ایک دوسرے کو چوم رہے تھے مگر دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ صرف بسیں گذر رہی تھیں۔ لندن بانہیں پھیلائے ہم دونوں کو کسی ہائیڈ پارک کے بغیر قبول کر رہا تھا۔ افریقہ اور ایشیا کی مظلوم قومیں آپس میں مل رہی تھیں۔

ہم دونوں اُس رات سینٹرل لندن کی سڑکوں، فٹ پاتھوں اور راہداریوں میں بھاگ رہے تھے ـــــ ہمیں ایسے لگتا تھا کہ پورا لندن ہمارا گھر ہے اور ہمارا بیڈ روم ہے۔ ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ اور ہم نے جو چاہا وہ کیا ـــــ ہم دونوں ہائیڈ پارک کے بالکل بیچ میں آ گئے اور وہاں دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ ہم دونوں نے وہاں محبت کا آخری کنارا چھو لیا۔ کیتھی اور میں نے لباس اتارا اور ہم ایک ہو گئے۔

جب ایک سے دوبارہ دو ہوئے تو واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ میں لندن سے پہلے نکلا۔ کیتھی نے ابھی رُکنا تھا۔ مجھے جلد اپنے انٹرویو کے لئے پاکستان پہنچنا تھا۔ ہیتھرو ائیر پورٹ تک کیتھی مجھے چھوڑنے آ رہی تھی۔ جبکہ میں نے اُسے منع کیا تھا کہ جانے والوں کی مثال نشیب پر گرتے پانی کی طرح ہوتی ہے، جس نے رُکنا نہیں ہوتا۔ لیکن اُس نے ضد کی اور میرا سامان بھی خود ہی پیک کیا۔ اُس اپارٹمنٹ کے مختلف حصوں میں

تصویریں بھی بنائیں کہ یہ ہم دونوں کی زندگی میں ایک پل بن کر آیا تھا ـــــ اور پھر ہیتھرو ائیر پورٹ میں داخل ہونے والے دروازے باہر گاڑیوں کی قطار میں ہماری گاڑی کھڑی ہوگئی اور میں نے اپنا سامان ٹرالی پر رکھا اور کیتھی کو گلے سے لگا کر ہمیشہ کے لئے جدا ہونے کے لئے پیار کرنے لگا۔ گاڑی ڈراپ لین پر تھی۔ کسی نے ہارن نہیں بجایا۔ اس لئے ہم دونوں کچھ لمحے ایک دوسرے سے لپٹے رہے اور پھر ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے ایک دوسرے کو محسوس کرتے رہے۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میں بے وفائی کر کے جا رہا ہوں۔ جبکہ ایسی بات نہیں تھی ـــــ جب میں اس سے الگ ہوا تو اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور کہا۔ ''میں نے تھوڑی سی بے ایمانی کی ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔ کیسی بے ایمانی؟'' ـــــ

''میں تم سے بچہ چاہتی تھی۔ میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا۔ میں کسی سیاہ فام سے بچہ نہیں چاہتی۔ اُس کی وجوہات تم جانتے ہو۔ مجھے صرف ایک بچہ چاہئے تھا جو میں دنیا کے ایسے آدمی سے لینا چاہتی تھی جو یا تو عرب ہو یا ایشین ہو۔ مجھے تم مل گئے تھے تو میں نے تمہیں آزمایا۔ تم پورے اُترے۔ تمہاری جینز ٹھیک ہیں۔ مجھے صرف ایک بچہ چاہئے جس کی جینز میں سچائی ہو، بے وفائی نہ ہو، تعصب نہ ہو، بددیانتی نہ ہو اور بے وقوفی نہ ہو۔ تم میں یہ سب میں نے دیکھ لیا تھا۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ میں تمہارے بچے کی ماں بنوں گی۔ تمہیں نہیں بتایا، اس کے لئے مجھے معاف کر دینا۔ میں اب تمہارے بچے کی ماں بنوں گی۔ لیکن اس بچے کو تمہارا نام نہیں دوں گی کہ میرے قبیلے والے اُس بچے کو کوئی اور نام نہیں دیں گے۔ ہمارا دستور ہے کہ کسی بھی لڑکی کا بچہ ہو جائے تو اُسے ماں کا نام دیتے ہیں۔ اس حوالے سے ہمارے قبائل عورت کو حق دیتے ہیں اور دنیا میں سب سے لبرل قبائل ہمارے ہیں۔ اس لئے تم پریشان نہ ہونا۔ وہ میرے بچے کو قبیلے کا بچہ مان لیں گے۔ کبھی آپ کو اُس بچے کے لئے اپنی جائیداد کا حصہ نہیں دینا ہوگا، اس لئے کہ دنیا کے ریکارڈ میں میرا بچہ ہوگا۔ لیکن ایسا ہو سکتا ہے کہ کبھی وہ بچہ چاہے لڑکا ہو یا لڑکی ـــــ ایک دن تمہیں ڈھونڈتا آئے گا اور صرف یہ بتائے گا کہ وہ میرا بچہ ہے۔ لڑکا یا لڑکی ـــــ ہاں ایک دن وہ شاید آئے گا اور آئے گی اور صرف تمہیں ملے گا یا ملے گی۔ اور چلی جائے گی یا چلا جائے گا ـــــ

''تو پھر مجھے کیا کرنا چاہئے ہوگا؟''

''یہ اب آپ سوچیں، میں تو جا رہی ہوں۔''

اور وہ چلی گئی اور میں سوچنے لگا۔ وہ بچہ یا بچی کب آئے گا یا آئے گی۔ یہ بات میرے اندر بیٹھ گئی اور اس خبر کے بعد میں تاریخ کا ریسرچ سکالر تاریخ میں کہیں گم ہو گیا تھا____ جب میں پاکستان آ گیا تو کئی دنوں تک کیتھی میرے ساتھ رہی۔ پھر وقت نے سوزین کو بھی میرے ساتھ ملا دیا۔ اب میں نے جو لکھا ہے، یہی میرا سچ ہے۔''

جب میں نے یہ پڑھ لیا تو میں سوچنے لگی آنس نے اتنے بڑے سچ مجھ سے چھپائے۔ وہ دو ناجائز بچوں کا باپ تھا پھر بھی میں نے اُس سے شادی کی اور ہمارے تین بچے ہوئے اور تینوں اب ہمارے ساتھ نہیں تھے۔ دو لندن میں اور ایک کینیڈا میں____ اور دو بچے آنس کے اور ہوئے۔ ایک جرمن عورت سے دوسرا افریقی عورت سے۔ وہ بچے کہاں ہوں گے؟ معلوم نہیں____ اب مجھے انتظار تھا کہ سوزین اور کیتھی کے بچے کب یہاں آئیں گے۔

اب میں آنس کو نہیں بتانا چاہتی تھی کہ اُس نے جو ڈائریاں لکھ کر اِدھر اُدھر چھپا دی تھیں، وہ میں نے پڑھ لی ہیں۔ اب میں جانتی تھی کہ اُس کے زمانے آپس میں گھل مل گئے ہیں۔ اب میں چاہوں تو سوزین اور کیتھی کے متعلق کھل کے بات کر سکتی ہوں____ جب ہم بغیر کسی زمانے کے رہ رہے ہیں تو ہم تو برزخ میں ہیں۔ جہاں سب اِدھر اُدھر سے گذر رہے ہیں۔ یا ہم وہاں ہیں جہاں کشش ثقل نہیں ہے۔ ہم سب اِدھر اُدھر ڈول رہے ہیں۔ کوئی بھی کسی کے پاس جا سکتا ہے۔

ایسے میں آنس کے کمرے میں گئی وہ باتیں کر رہے تھے۔

''امرتا پریتم یہ بتا دو تم نے امروز سے شادی کیوں کی؟ کیا اُسے گود لیا تھا کہ تمہیں ساحر لدھیانوی سے بیٹا چاہیے تھا؟''

''آپ کو تاریخ دان کس نے بنایا ہے۔ آپ کو تو کچھ بھی شعور نہیں ہے۔ It was the other way round____ امروز نے مجھے گود لیا تھا۔ ساحر کھسما دے کھانڑیں نوں تے میں گود لینا سی۔ ایس کر کے تے میں بچ گئی۔ امروز ایسا پینٹر سی کہ کھڑے کھلوتے کڑیاں دی ڈارنوں پچھے لا سکدا سی۔ اونے مینوں سانبھ لیا۔ نہیں تے میں لکھاں نال لکھ ہو گئی ہوندی۔ ساحر آپڑیں آپ تے عاشق سی۔ ایس لئی مینوں ای اونوں گودی لینا سی۔''

''مگر ساحر جب لاہور آیا تھا تو بہت شرمیلا تھا۔ اے حمید، احمد راہی، قتیل شفائی اور شہزاد احمد نے تو یہی لکھا تھا۔''

''شرمیلا شاعر ہی تو اپنے پر عاشق ہوتا ہے۔ دیکھو تاریخ دان ـــــ ہر عورت مرد کی نبض شناس ہوتی ہے۔ ہر عورت اپنے آپ میں بہترین نفسیات دان ہوتی ہے۔ میں تمہارے سب شاعروں کی تمھی اُتار سکتی ہوں۔ سارے سالے ٹھرکی، مفت خورے، لاڈلے، خود پرست اور عورت کے معاملے میں بے غیرت ہوتے ہیں۔''

''اور مصور؟'' ـــــ

''مصوروں میں بھی اسی طرح کے ہوتے ہیں مگر مصور Introvert ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے اندر جو منظر چھپا ہوتا ہے، اُسے وہ باہر لاتے ہیں۔ وہ شاعر کی طرح ننگے بدن نہیں ہوتے۔ وہ خود کو بھی کپڑے پہناتے ہیں اور اپنی پینٹنگ کو بھی کہ اچھی پینٹنگ ہوتی ہی وہ ہے جس میں بہت کچھ رنگوں کے اندر چھپا ہوتا ہے۔ اور بہت کچھ اُن کے زاویوں کے پردوں میں جھانک رہا ہوتا ہے۔''

''ایسا تو شاعروں کی شاعری میں بھی ہوتا ہے۔ غالب، میر، فیض، اقبال، منیر نیازی اور ناصر کاظمی سب میں ایسا ہی ہے۔''

''ہاں اُن کی شاعری میں ایسا ہوتا ہوگا۔ مگر ان کی زندگی میں نہیں ـــــ غالب نے اپنے کپڑے خود اپنے خطوط میں اُتار دیئے۔''

''تو یہ تو اُس کی عظمت ہے۔''

''میں نے کب کہا وہ عظیم نہیں تھے؟''

''تو شاعروں کو اُن کی شاعری سے جاننے کی کوشش کریں نہ کہ اُن کے خطوط یا خاکوں یا ''یادوں کی بارات'' کے حوالے سے'' ـــــ

''اوہ ''یادوں کی بارات'' پر اب میں کیا بات کروں؟ وہ تو نہرو نے جوش کو خواہ مخواہ جوش دلا دیا کہ تم انڈیا میں آجاؤ ـــــ اور وہ آجاتے تو جگہ جگہ پیشاب ہی کرتے۔''

''پیشاب تو ہر شاعر نے کیا تھا۔ فراق نے بھی، مجاز نے بھی۔ فراق نے تو سنا ہے غلمان پہ بھی ہاتھ ڈالے اور پیشابوں کی تاریخ بہت لمبی ہے۔ آپ کے ہاں بھی اور ہمارے ہاں بھی۔ امرتا پریتم! یہ آپ اگر سب کے پوتڑے

بیچ چورا ہے پہ دھونے کی کوشش کرو گی تو کوئی نہیں بچے گا نہ شاعر، نہ افسانہ نگار، نہ نقاد، نہ مصور، نہ موسیقار۔"

"بات آپ نے شروع کی تھی۔"

"ہاں مگر میں نے کب شروع کی تھی؟"

"وہ ایسے کہ میں نے امروز کو گود لیا تھا یا نہیں؟"

"ہاں مگر یہ امروز کون ہے؟"

اب میں سامنے آئی اور کہا۔"امرتا پریتم چلی گئی ہیں۔ آپ کس سے بات کر رہے ہیں؟"

"میں کہاں ہوں؟"

"آپ گھر میں ہیں۔"

"آپ کون ہیں؟ امرتا پریتم کہاں گئی؟"

"وہ چلی گئی ہے۔ یہ میں ہوں۔"

"اچھا تو سوزین کو بلاؤ۔"

"وہ آئی تھی اور پھر چلی گئی۔"

"چلی گئی؟ کہاں؟"

"واپس آسٹریا اور کہاں؟"

"آسٹریا۔۔۔۔ ہاں اُس کی ماں بہت اچھی تھی۔ اب وہ کہاں ہے؟"

"سوزین سے جو آپ کی بیٹی جیسمین ہے وہ آپ سے ملنے آئی تھی؟"

"جیسمین ملنے آئے گی تو تم پہچان لوگی۔ وہ ایسے کہ اس کی بچپن کی تصویریں مجھے سوزین بھیجتی رہتی تھی۔"

"ہاں میں نے دیکھ لی ہیں۔"

"تو پھر تم نے دیکھا جیسمین کا آدھا چہرہ اوپر کا بالکل ماں پہ گیا ہے اور آدھا نیچے کا چہرہ ہو بہو میں ہوں۔"

"ہاں جیسمین آئے گی تو پہچان لوں گی۔ آپ سوزین کو فون کر کے کیوں نہیں بلا لیتے۔"

"نہیں آئے گی۔ اس نے کہا تھا میں تمہاری زندگی میں دوبارہ نہیں آؤں گی۔ یہ ہمارے کنٹریکٹ کا حصہ تھا۔ بلکہ جو بھی اس طرح بغیر نکاح کے ایک ساتھ یورپ میں رہتے ہیں وہ کبھی دوبارہ آمنے سامنے نہیں آتے۔"

''آپ تو تاریخ دان ہیں۔ یہ بتائیں کہ یورپ کا یہ کنٹریکٹ اور ایران میں مُتعہ کا رواج کیا آپس میں ملتے جلتے ہیں؟''

''ہاں ــــــ ملتے جلتے ہیں، لیکن فرق ہے'' ــــــ

''وہ کیا فرق ہے؟''

''پہلا فرق یہ ہے کہ ایران کا مُتعہ مفتیوں کی جانب سے مقرر کردہ شرائط کے مطابق ہے اور بہت پہلے سے رائج ہے۔ جس میں کچھ شرعی نکات بھی شامل ہیں۔''

''اور یورپ میں آپ نے جو کنٹریکٹ سوزین کے ساتھ کیا تھا، اس میں کیا تھا؟''

''اُس میں کوئی مفتی شامل نہیں تھا۔ اس میں کچھ بھی ہم دونوں نے لکھا ہوا کنٹریکٹ سائن نہیں کیا تھا۔ وہ دل سے دل تک کا کنٹریکٹ تھا۔''

''دل سے دل تک یا جسم سے جسم تک؟''

''ہاں شاید یہ تمہاری بات ٹھیک ہے۔''

''کیونکہ مجھے بہت پہلے سے معلوم ہے کہ آپ کا مجھ سے بھی جسم سے جسم تک کا تعلق رہا ہے اور اُس میں ہم نے تین بچے پیدا کیے۔''

''دل اور جسم دو الگ چیزیں نہیں ہیں۔ سچ یہی ہے کہ دل کے رشتے کا پتہ نہیں جسم کا رشتہ حقیقت ہوتا ہے۔ پوری کائنات ایسے ہی پیدا ہوئی ہے۔ جسم سے جسم کے تعلق سے۔ انسان کو خاندان بنا کے زندہ رہنا ہوتا ہے۔ اس طرح خاندان کی بنیاد پڑی۔ اُس میں صرف جوڑوں کا ذکر ہے جو خاندان بنانے کا سبب بنتے ہیں۔ کہیں محبت اور دل قسم کی کوئی بات شامل نہیں ہوتی۔''

''اگر ایسا نہیں ہوتا تو پھر یہ سب آپ نے مجھ سے کیوں چھپایا؟ اگر میں جنگل میں کسی قافلے سے بچھڑ جاتی اور وہاں کوئی بھی جنگل کا رہنے والا مجھے مل جاتا تو ہم دونوں کے ہاں تین کیا تیس بچے بھی پیدا ہو سکتے تھے۔''

''ہاں یہی سچ ہے۔ یہی میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔''

''یہ تو تمہارا سچ ہے۔ میرا سچ یہ ہے کہ تم نے مجھے دھوکہ دیا ہے، محبت کا۔''

''تم کہانی لکھنے والوں اور شاعروں کو دھوکہ کھانا اچھا لگتا ہے۔ محبت کا سارا ڈرامہ تم لوگوں نے اپنی

دکان لگانے کے لئے چالو کیا تھا جو آج تک فریب دے رہا ہے۔"

"اور اس فریب کا سب سے زیادہ فائدہ آپ جیسے پڑھے لکھے لوگوں نے اٹھایا ہے۔ کسی دیہاتی نے آج تک بیوی کو فریب نہیں دیا۔۔۔۔۔ بس اُسے بستر پر لایا اور بغیر کچھ کہے چالو ہو گیا۔"

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے تو پھر اب میں کہاں ہوں؟"

"آپ کہیں بھی نہیں ہیں۔"

"نہیں میں ڈاکٹر عبدالسلام سے مل کے آ رہا ہوں۔ ہمارے نوبیل انعام یافتہ سائنس دان سے۔"

"آپ کہیں نہیں گئے پچھلے بیس گھنٹوں سے۔"

"نہیں میں تو ابھی آیا ہوں۔ میں یوکے میں تھا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے پاس ایک گلی میں ایک چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں تھا۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"یہ تو زمانوں کا ہیر پھیر ہے۔ مجھے کیا معلوم۔ میں ڈاکٹر عبدالسلام سے ملنے گیا تھا۔ وہ کسی سے نہیں ملتے تھے۔ پاکستانیوں سے تو بالکل نہیں ملتے تھے۔ میں اُن کے پاس گورنمنٹ کالج لاہور کے حوالے سے گیا تو انہوں نے بلا لیا۔ وہ نقاہت کے باعث اُٹھ کر میرا استقبال بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اُن کا ایک طالب علم اُن کے پاس تھا۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور کہا۔"تم کب گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے ہو؟"

"میں نہیں جانتا میں جی سی میں کب تھا؟ کئی زمانے میرے اندر گردش کر رہے ہیں۔ جی سی میرے اندر تھا۔ اور میں لٹریچر اور ہسٹری میں سانس لے رہا تھا۔"

"میرے پاس کس لئے آئے ہو؟ گورنمنٹ کالج کا ٹاور لے کر آتے تو میں تمہیں سلام کرتا۔"

"سر میں تو صرف آپ کی ذہانت کو ماننے آیا ہوں۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے؟ جب پاکستان کے ایک سائنس دان کو پہلی بار نوبیل انعام ملا تو تمہارے ملک میں کیا ہوا؟ سرکاری ٹیلی وژن نے کیا کردار ادا کیا؟ وہ ڈکٹیٹر ضیاء الحق اور اُس کے حواری کیا کر رہے تھے۔۔۔۔۔ کیا پاکستان میں اقلیتوں کے حقوق نہیں تھے کہ میری تقریب میں ایک پاکستانی ہونے کی حیثیت میں پاکستان کا سفیر وہاں موجود ہوتا اور پاکستان کی کوئی نمائندگی ہوتی۔ میں اقلیت تھا، اقلیت ہوں مگر مجھے پاکستانی

تو مان لیتے۔ کیا کسی انسانی حقوق کے نمائندے نے آواز اٹھائی؟ کیا کسی پاکستانی نے سڑک پر آ کر احتجاج کیا؟ میں مسلمان نہیں ہوں مگر پاکستانی تو ہوں۔ پاکستانی ہونے کے حق سے کوئی بھی محروم نہیں کر سکتا تھا۔ کیا کسی عدالت نے اس کا نوٹس لیا؟ کیا کسی ادیبوں کے اجلاس میں اس کا نوٹس لیا گیا؟ کیا وکیلوں نے احتجاج کیا؟ کیا اقلیتوں کے حقوق کی کسی انجمن نے احتجاج کیا؟''

''لیکن آپ کے نام پر عبدالسلام چیئر رکھ دی ہے۔ عبدالسلام ہال کا اعلان کر دیا ہے۔ عبدالسلام میتھی میٹیکل سکول بنا دیا ہے۔''

''میں اس پر گورنمنٹ کالج کا احسان مند ہوں پھر بھی.... پوری دنیا حیران تھی کہ ایک ملک اپنے نوبیل انعام کو اپنانے سے انکار کر رہا ہے۔ جو سائنس دان اُن کا شہری ہے اُن کی درس گاہوں میں پڑھا ہے۔ ان کے چھوٹے سے شہر کے سرکاری ٹاٹ سکول سے پڑھا ہے۔ وہ اس کے انعام کو قبول نہیں کر رہی۔ پاکستان کے تمام غریب عوام کے منہ پر ضیاء الحق نے طمانچہ مارا۔''

''ڈاکٹر صاحب! عام پاکستانی آپ کا بہت احترام کرتا ہے اور آپ کے اس اعزاز کو اپنا اعزاز سمجھتا ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے پاس دو نوبیل لارئیٹ ہیں۔ ایک آپ دوسرے کیمسٹری کے نوبیل انعام یافتہ ہرگوبند کھرانہ۔ گورنمنٹ کالج نے دونوں کی تصویریں بخاری آڈیٹوریم میں ساتھ ساتھ لگا رکھی ہیں۔''

''ہرگوبند کھرانہ سے میں مل چکا ہوں۔ میری بات ہوتی رہتی ہے۔ میں اُسے اپنا اُستاد سمجھتا ہوں کہ وہ میرا اسینئر ہے۔''

''ڈاکٹر صاحب میں ایک تاریخ کا طالب علم ہوں۔ اور کچھ ہوا یا نہ ہوا تاریخ آپ کو آپ کا رتبہ دے گی۔ تاریخ میں آپ کا وقار قائم رہے گا۔ سب کچھ مٹ جائے گا۔ مگر آپ کا یہ نوبیل انعام تو رہے گا۔''

''تو پھر آپ ڈاکٹر عبدالسلام سے مل کر کہاں گئے تھے؟''

''ابھی تو مل کے آیا ہوں۔ یہاں ہوں اور جو میں ڈاکٹر صاحب سے کہہ کر آیا ہوں۔ اُسے ثابت بھی کر چکا ہوں۔ تاریخ میں وہ موجود ہیں۔''

''لیکن کیا تاریخ موجود رہے گی؟''

''کیا مطلب؟''

''ابھی میں دیکھ رہی تھی کہ کسی نے ''مستقبل کی تاریخ'' لکھ دی ہے۔''

''ہاں تو مستقبل کی تاریخ تو زمانہ قدیم سے لکھی جا رہی ہے۔ یہ جوتشی، یہ فال نکالنے والے، یہ مستقبل کا حال بتانے والے، یہ رَمل اور زائچے والے اور یہ نجومی، یہ پنڈت، یہ برہمن، یہ بہروپے بھی مستقبل کی تاریخ بتا دیتے تھے۔ وہ مرزا غالب کا شعر ہے ناں ۔

دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے''

''مگر ''مستقبل کی تاریخ'' کسی جوتشی وغیرہ نے نہیں لکھی۔ اسے عالمی سطح کے سائنس دانوں نے لکھا ہے۔''

''ہاں مگر وہ بھی اُسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ انسان خسارے میں ہے۔ جو اللہ نے فرمایا ہے کہ وقت کی قسم انسان خسارے میں ہے۔''

''وہ اور بات ہے انسان تو ہمیشہ سے خسارے میں ہے۔ مگر میں کچھ اور کہہ رہی ہوں۔''

''کیا کہہ رہی ہو؟ یہ کہ انسان اپنے مستقبل کی تاریخ لکھ رہا ہے۔''

''لکھ چکا ہے۔''

''جو تاریخ ہم نے لکھی ہیں وہی تو مستقبل کی تاریخیں ہیں۔ ہسٹری آف فیوچر میری سب کتابوں میں موجود ہے۔''

''کیا آپ کی کتابیں تاریخ میں زندہ رہیں گی؟''

''بالکل نہیں۔ برصغیر اور اس خطے کی تاریخ پر ایک حملہ ہو چکا ہے۔''

''کیسا حملہ؟ کس نے کیا ہے؟''

''ایسٹ انڈیا کمپنی جب کلکتہ کے ساحلوں پر اُتری تھی تو پھر ——— ہندوستان کے تمام راجوں راجواڑوں اور ریاستوں کو ایک ایک کر کے ہڑپ کرتے ہوئے دہلی کے مغل دربار اور لکھنؤ کے واجد شاہی دربار کو تابع کر کے، ایک ایک کر کے تمام حکمرانوں کے کپڑے اُتارنے کے لئے سرکاری مؤرخ بھرتی کیے، جو

بآسانی دستیاب تھے ـــــ اس طرح تمام راجوں مہاراجوں کے کپڑے اتار دیئے گئے۔ مغلوں، نوابوں اور راجپوتوں تک کی عورتوں کے کپڑے بھی اتار دیئے گئے۔''

''یہ تو تاریخ ہے۔ سب جانتے ہیں اب کیسا حملہ ہوا ہے؟''

''اب انگریز نے اپنی مرتب کی ہوئی تاریخ پر حملہ کر دیا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''یہ تم نہیں دیکھتی۔ آئے دن کوئی کسی یورپی اور امریکی مؤرخ کی کتاب باہر سے چھپ کر آتی ہے جس میں مغلوں، راجوں، مسلم ریاستوں کے حکمرانوں، راجپوت حکمرانوں کے متعلق ایسی تحقیق ہوتی ہے جس میں جو کپڑے انگریز نے اُن کے جسم سے اُتارے تھے، وہ کپڑے اُن کی اولادیں دوبارہ پہنا رہی ہیں۔''

''مطلب یہ کہ جو کل کے وِلن تھے آج کے ہیرو ثابت ہو رہے ہیں'' ـــــ

''نہیں، یہ صرف انگریزوں اور امریکی دانشوروں کا ایشیا میں ہندوستان کی تاریخ کے حوالے سے اپنا قبضہ مضبوط کرنے کے لئے ایک نیا حملہ ہے۔ یہ جو لٹریری فیسٹیول میں اور آئے دن کسی نہ کسی فورم سے امریکی اور یورپی مؤرخ لیکچر دینے آ رہے ہیں یہ کون ہیں؟ یہ اُن کی اولادیں ہیں جنہوں نے ہماری تاریخ کے حکمرانوں کو ننگا کیا۔ اب اُن کی اولادیں وہ اُترے کپڑے ان کو پہنانے آ رہے ہیں۔''

''وہ کیا کہتے ہیں؟''

''وہ کہتے ہیں کہ اکبر اعظم، واجد علی شاہ، ٹیپو سلطان، دارا شکوہ، شاہ جہاں اور جہانگیر ـــــ اور جو بھی راجے تھے وہ تو عوام کے ساتھ رابطے میں تھے۔ اُن کا کردار عوام دوست، فنونِ لطیفہ اور انسانی اقدار سے ہم آہنگ تھا۔ اُن کا فنونِ لطیفہ سے رشتہ ایسا تھا کہ امریکی اور یورپی قومیں شرما جائیں ـــــ ایسے میں تان سین، امیر خسرو، واجد علی شاہ اور بنگال کے تمام فن کار، رابندر ناتھ ٹیگور کے شانتی نکیتن کی چھتری کے نیچے آ گئے تھے۔ اور اس طرح جن قوموں نے ہمیں لُوٹا تھا اُن کی اولادیں ہمیں ہمارا کھویا ہوا ورثہ واپس دلانے کے لئے مؤرخین کا روپ دھار کر ادبی فیسٹیولز اور ہماری یونیورسٹیوں کی کانفرنسز میں ہم پر دوبارہ حملہ آور ہو چکی ہیں'' ـــــ

''آپ کو کسی کا انتظار ہے؟''

''مجھے صرف موت کا انتظار ہے اور موت بہت بڑی سچائی ہے۔لیکن میں بھول گیا ہوں کہ میں زندہ بھی ہوں کہ نہیں۔یہ میں کسی اور مقام سے بات کرر ہا ہوں۔تم گواہی دو کہ میں کہاں ہوں۔''

''میں تو اپنی گواہی نہیں دے سکتی کہ خود مجھے نہیں پتہ کہ میں سوزین کے ساتھ ہوں یا کیتھی کے ساتھ ـــــ مجھے تو یہ بھی نہیں پتہ کہ میں ہوں بھی کہ نہیں۔کبھی کبھی لگتا ہے انسان عالم برزخ میں ہے یا خواب دیکھ رہا ہے۔یا خواب میں عالم برزخ دیکھ رہا ہے یا دونوں آپس میں گڈ مڈ ہو گئے ہیں۔''

''ہاں تو جب میں کہیں نہیں ہوں تو پھر کہاں ہوں؟''

''یہ سوال آپ کو خود دیکھنا ہے کہ میں اپنے سوال میں الجھی ہوں کہ اگر میں کہیں ہوں تو وہ کون سی جگہ ہے۔''

''انسان جب زمانے کا اعتبار کھو دیتا ہے تو پھر وہ کسی بھی جگہ نہیں ہوتا۔کیونکہ جگہ ہی نہیں ہوتی۔تو پھر وہ یا تو قیامت کے راستے میں ہوتا ہے یا پھر قبر میں اتارا جا رہا ہوتا ہے۔''

''میں ایک مرحلے میں ہوں اور مجھے نہیں معلوم کہ زمانوں نے کیا سازش کی ہے کہ میں کسی بھی زمانے میں نہیں ہوں۔''

''تو پھر آپ دنیا سے اُٹھ چکے ہیں کہ زمانے تو زمین پر ہوتے ہیں۔''

''اچھا ہوا میں اُٹھ چکا ہوں۔''

''لیکن ابھی تو آپ سے ملنے سوزین کی بیٹی جیسمین کو آنا ہے اور کیتھی کے کسی بھی بیٹے یا بیٹی کو آنا ہے۔''

''تو پھر میں بیچ میں اٹکا ہوں۔''

''یہ بیچ کہاں ہوتا ہے؟ پہلے اس کا تعین کر لیں۔''

''ہاں جب زمانہ زمین پر ہے تو پھر اُس سے اوپر جو ہو گا وہ کہیں بیچ میں آئے گا۔''

''نہیں بیچ وہاں ہو گا جہاں زمین اور انتہا کا تعین ہو گا۔زمین تو ہے انتہا کا علم نہ آپ کو ہے نہ مجھے۔''

''تو اس کا مطلب ہے میں بیچ میں بھی نہیں ہوں اور کہیں بھی نہیں ہوں۔ذرا دیکھو کوئی آیا ہے۔''

''کوئی گھنٹی بجی ہے کیا؟''

''ہاں ایک گھنٹی تو میرے اندر بجی ہے۔ باہر کی گھنٹی کا مجھے پتہ نہیں کہ میں باہر نہیں ہوں۔''

''آپ کو میں سلا دوں۔ نہیں تو گھنٹیاں بجتی رہیں گی۔''

''نہیں۔ پہلے مجھے رہائی دو۔''

''کیسی رہائی؟ تم کس کی قید میں ہو؟''

''میں اپنے تین بچوں اور تمہاری قید میں ہوں۔''

''نہیں، تم صرف سوزین اور کیتھی کے بچوں کی قید میں ہو۔''

''تو اُس سے رہائی کیسے ہو سکتی ہے؟''

''وہ تو تب ہوگی جب وہ بچے آئیں گے۔ اب تو جوان ہو چکے ہوں گے۔''

''مجھے برزخ سے نکالو۔ میں یا زمین پہ رہنا چاہتا ہوں یا آسمانوں کے پار جانا چاہتا ہوں۔''

''اُس کے لئے آپ کو اپنے وجود کی قید سے نکلنا ہوگا۔''

''کیا وجود باقی رہ گیا ہے؟''

''ہاں وجود تو بندے کے اندر کہیں ہوتا ہے تو اُس کا مجھے پتہ نہیں ہے۔''

''تو دیکھو باہر کون آیا ہے؟''

''باہر ابھی کوئی نہیں آیا۔ ہوا بھی نہیں آئی۔''

''یہ میں کہاں ہوں؟ بہت حبس ہے۔ یہ میں کہیں آگرہ میں تو نہیں ہوں۔ آگرہ بازار میں میرے آس پاس غریب بساطی، کمہار، کُنجڑے، بزاز، درزی، قلعی گر، بھڑ بھونجے، طباخی، خاکروب، ماشکی، موچی، نائی، گجک فروش، گل فروش، پرچونیئے، پنساری، سنیارے، دھوبی، سازندے اور ڈھولک بجانے والے سب موجود ہیں۔ کسی نے دھوتی اُڑسی ہوئی ہے، کسی نے بنڈی پہنی ہے۔ کوئی ننگے بدن زیر ناف چیتھڑا چپکائے تو کوئی سر پر رومالی رکھے اپنے تئیں سفید پوش بنا بیٹھا ہے۔ کوئی وقت سے پہلے کا بوڑھا ہے۔ کوئی جوانی سے پہلے کا مرجھایا پھول ہے۔ کسی کے گال پچکے ہیں تو کسی کا پیٹ۔ کسی کے بال کھچڑی ہیں تو کوئی مُردوں میں زندہ ہے۔ پوچھنے پر بتاتے ہیں ''ہم نظیر اکبر آبادی کے دوست ہیں۔ اُن سے روز کی صحبت ہے۔''

''تمہارے نظیر اکبر آبادی کہاں ہیں؟''

''آج اُن کا سوئم تھا، گذر گئے۔ انہی کپڑوں میں دفنا دیے گئے جو پہنے تھے کہ وہ ہمارے جیسے تھے۔ کہہ گئے کہ جب آگرہ کے لوگ ایسے تو میں کیسے سفید براق قیمتی لٹھا پہن کے دفنایا جاؤں۔''

''مگر نظیر اکبرآبادی کو تو کسی بادشاہ کسی شاہجہاں کسی اکبر نے دربار میں نہیں بلایا۔''

''بلاتے بھی تو وہ کب جانے والے تھے۔ ارے وہ تو اول آخر ادھر کے کیڑے تھے۔''

''کیڑے نہیں انسان تھے۔''

''تو کیا ہم تمہیں انسان دِکھتے ہیں؟ بولو کیا ہم کیڑے نہیں؟ جب ہم کیڑے تو ہمارا اگر و بھی کیڑا ہی تھا۔ اُسے تم بھلا شاعر بنادو۔ وہ شاعر کب تھا وہ تو ہمارے لئے احتجاج کر رہا تھا۔ مگر تمہارے پروفیسروں نے اُسے اردو شاعری میں نظم کا ہیرو بنا دیا۔ ارے وہ تو سڑک کے بیچ آپ کو آئینہ دکھا رہا تھا۔ صرف ایک بابو جی نے اُسے سمجھا۔''

''کون بابو جی؟''

''ارے ایک ہی بابو جی تھا جس کا نام انتظار حسین تھا۔''

''ہاں اب سمجھ میں آیا۔ مگر ایک اور بھی تو تھا۔ جس نے ڈرامہ لکھا ''آگرہ بازار''۔ تو کیا تم اُسے نہیں جانتے۔ حبیب تنویر اُس کا نام تھا اور اُس نے 1954ء میں یہ ڈرامہ سٹیج کیا تھا۔''

''تو ہم سب اُس کے کردار تھے؟''

''''آگرہ بازار'' میں نظیر اکبرآبادی کے بارے میں حبیب تنویر نے پہلی بار اردو دنیا میں ایک بڑی غلط فہمی کو دُور کیا۔''

''کیا غلط فہمی تھی؟''

''وہ یہ تھی کہ میر تقی میر اور مرزا غالب کے بیچ کوئی اور شاعر ہی نہیں۔ اس غلط فہمی کو حبیب تنویر اور پھر انتظار حسین نے دور کیا اور اب۔''

''اور اب ہم آپ جیسے تاریخ دان کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ آج سوئم تھا نظیر اکبرآبادی کا اور آپ کو اب حبیب تنویر اور انتظار حسین کی گواہی دینی ہے۔''

''ہاں میں دیکھ رہا ہوں کہ آگرہ بازار کے سب کردار وہی ہیں جو ''آگرہ بازار'' میں تھے۔''

''ارے بابو تم کیا تاریخ بیچتے ہو؟ تاریخ تو ہم بیچتے ہیں۔ یہ چلتی پھرتی تاریخ یا پھر ہمارا گُرو نظیر تاریخ پہ تھوکتا تھا اور بولتا تھا ایک وقت آئے گا ہم تاریخ بن چکے ہوں گے۔''

''اب تمہارے گُرو کا سوئم ہو گیا۔ تو اب تمہاری آواز کون بنے گا؟ تم تو یتیم ہو گئے۔''

''ارے بابو وقت آئے گا۔ کوئی حبیب تنویر اور انتظار حسین ضرور آئے گا۔ یہ تو آپ نے خود بتا دیا ہے۔ جو ہمارا گُرو بن جائے گا۔''

''تمہارے بازو میں تاج محل ہے اور تم وہی کیڑے کے کیڑے ہو اور پورے آگرہ کے بازار کے دائیں بائیں جو گلیاں ہیں اُن میں کلبلاتے پھرتے ہو۔ پورا آگرہ کیڑوں سے اُبل رہا ہے۔''

''اے بابو ہمارے پُرکھوں کا خون پسینہ تاج محل میں پانی کی طرح بہا ہے۔ کیا جانتے ہو تم؟ تاج محل کا پتھر کدھر سے آیا؟ کہاں سے کاری گر آئے؟ کہاں سے سرخ پتھر آیا؟ کس کس نے فتح پور سیکری کے جنگل میں محل کھڑا کیا؟ کیا گرم موسم رہا ہو گا اُس جگہ پر۔''

''ہاں میں سب جانتا ہوں۔ میں بھی تمہاری طرح کا کیڑا ہوں۔ تاریخ کا کیڑا۔''

''تم تاریخ کے ایسے کیڑے ہو جو تاریخ کو چاٹ جاتا ہے۔''

''ہاں ایسا ہی ہوں۔ اگر تاریخ کو نہ چاٹوں تو وہ مجھے چاٹ جاتی ہے۔''

''ارے میاں اٹھو اپنا راستہ کھوٹا نہ کرو۔ سوئم ہو گیا۔ اب ہم اپنی دکان بڑھاتے ہیں۔ جاؤ میاں اپنی راہ لو۔ ادھر بہت آئے بہت گئے۔ کئی ملک الشعراء تھے۔ کئی داستان گو تھے۔ کئی مرثیہ خواں تھے۔ کئی سوز خواں تھے۔ کئی تاریخ کے بیجاری تھے۔ سب گئے۔ تم بھی جاؤ۔''

''اب جو دیکھتا ہوں میں بیچ بازار اکیلا کھڑا ہوں۔''

''آپ یہاں بھی اکیلے ہیں۔ میں تو کہیں اور ہوں۔''

''مگر تم کہاں ہو؟ میں تو کسی زمین پر نہ آسمان پر ہوں۔ تم کہاں ہو؟''

''میں تو اس وقت ایک ہسپتال کے آئی سی یو میں ہوں جہاں میری دوست اور افسانہ نگار خالدہ حسین میرے سامنے لیٹی ہے اور اُس کے پاس کچھ سانسیں بچ گئی ہیں۔ جو وہ میرے ساتھ گذارنا چاہتی ہے۔''

''میں تو کہیں بھی نہیں ہوں۔ تم جہاں ہو، مجھے بتا سکتی ہو؟''

''خالدہ! تم نے یہ کیا حال بنالیا ہے۔ کیا تم اس حالت کی ذمہ دار نہیں ہو؟''

''آخری سچ یہی ہے کہ میرے والد نے مجھے اپنی طرف سے بہتر مستقبل دینے کے لئے ایک سی ایس پی افسر کے ساتھ شادی میں باندھ دیا۔''

''تمہارے والد انجینئرنگ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔''

''یہ ہم جیسی کہانی لکھنے والی لڑکیوں کی بدقسمتی ہوتی ہے۔''

''تو اگر ایسی بدقسمتی ہوگئی تھی تو کس نے روکا تھا کہ آپ پروین شاکر کی طرح طلاق نہ لے لیں۔''

''میرا اور پروین کا معاملہ مختلف تھا کہ میرا خاوند سے رشتہ محبت اور نفرت کا تھا۔ بچے پیدا ہونے کے بعد میرے اندر کی بغاوت نے دم توڑ دیا ــــ میرا خاوند سارا دن تو گھر سے باہر رہتا تھا۔ اور میرے لئے کوئی سوال پیدا نہیں کرتا تھا۔ رات کو وہ اپنی مرضی سے میرے کپڑے اتار دیتا تھا۔ یہاں سے نفرت جنم لیتی تھی۔ تم خود کہانی لکھتی ہو تو سمجھ لو یہ بھی میں ایک کہانی ہی بیان کر رہی ہوں۔ ہوسکتا ہے یہ جھوٹ ہو اور میں اُس رات لذت ہی لیتی ہوں گی۔''

''مگر تم نے شادی سے پہلے جب برصغیر میں ایک کہانی کار کی حیثیت میں مقام بنالیا تھا تو پھر خاموشی کیوں قبول کی؟ افسانے لکھنے کیوں چھوڑ دیئے؟''

''میں ثابت کرنا چاہتی تھی کہ پاکستانی عورت لکھنا چھوڑ بھی دے۔ اُس کا چشمہ رُک بھی جائے تو وہ جب چاہے اُسے جاری کرسکتی ہے اور میں نے شوہر کی وفات کے بعد اُسی خشک چشمے کو دوبارہ جاری کردیا تھا۔''

''مگر اس دوران دریاؤں میں بہت پانی بہہ گیا تھا۔ کیا تم اپنے بیوروکریٹ شوہر سے دوستی کر کے یہ نہیں بتا سکتی تھیں کہ تم نقوش کے ایڈیٹر محمد طفیل، احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، انور سجاد، انتظار حسن، میرزا ادیب اور غلام عباس جیسے لکھنے والوں سے مل کر بھی وفادار بیوی رہ سکتی ہو۔''

''اُسے تمام لکھنے والوں سے نفرت تھی۔''

''وہ خود کیا تھا۔ انگریزوں کی غلامی کا طوق گلے میں ڈالے صرف انگریزی کے زور پر سرکاری نوکری میں آگیا اور کیا تھا اُس کے پاس؟ دو ڈرائیور، چار نوکر، دو باورچی اور بس۔''

''ہاں یہی تھا اور میں اس پر سمجھوتہ کر گئی۔ کمزور عورت تھی۔''

''کہانی کار کمزور نہیں ہوتا ـــــ یہ تم نے کیسے سمجھ لیا۔''

''کہانی کار کمزور ہوتا ہے۔ مجبور ہوتا ہے۔ وہ اپنے کردار کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے یہ تو پھر شوہر تھا۔ کیا منٹو مجبور نہیں تھا؟ کیا اشفاق احمد اور احمد ندیم قاسمی مجبور نہیں تھے کہ ایک نے بیوی کو خوامخواہ اوتار بنا دیا دوسرے نے بیوی کو زندہ دفن کر دیا۔''

''اور تم بھی تو زندہ دفن ہو گئی تھی۔ کم سے کم تیس سالوں کے لئے۔''

''مگر میں نکل آئی۔ سب نے دیکھا میں نے افسانے لکھے اور انہی افسانوں پر میں زندہ رہوں گی۔''

''تم نہیں نکلی، تمہارے افسانے نکلے۔ تم نے تو اپنی زندگی گروی رکھ کے افسانوں کی رہائی کا سامان کیا۔ اب جو افسانے اس عرصے میں تم نے نہیں لکھے ہم وہ افسانے کس سے مانگیں۔ کس کا گریبان پکڑیں؟''

''تم خود کہانیاں لکھتی ہو۔ بولو کیا تم وہ سب لکھ سکی ہو جو لکھنا چاہتی تھی۔''

''نہیں میں بھی وہ سب نہیں لکھ سکی۔''

''تو پھر بولو۔ عورت اور وہ بھی پاکستانی عورت کتنا لکھ سکتی ہے۔ جتنا لکھتی ہے اُس سے زیادہ اُس کے برتن سے گر جاتا ہے۔ نہیں سنبھال سکتی۔''

''تم سے پہلے بھی ایسے واقعات ہوئے ہیں۔ تمہیں چاہیے تھا اپنی کہانیوں کے ذریعے اُن کی رہائی کا سامان پیدا کرتی۔''

''تمہارا اشارہ روشن آراء بیگم کی طرف ہے، جس نے جاگیردار سے شادی کے بعد اپنے فن کو عین عالمِ شباب میں خیرباد کہہ دیا اور بھینسوں کے باڑے کی دیکھ بھال کرنے لگی۔''

''ہاں میرا اشارہ اُسی کی طرف تھا۔''

''چین کے انقلاب میں بھی تو ایسا ہوا تھا ـــــ شاعروں کو سُوروں کی رکھوالی پہ رکھا گیا تھا۔''

''روشن آراء بیگم نے اُف تک نہ کی۔ اگر وہ صبح کو اپنا ریاض ہی جاری رکھتی تو بھینسیں زیادہ دودھ

دینے لگتیں۔ پرندے ان کے گھروں میں گھونسلے بنا لیتے۔"

"خالدہ حسین مان لو تم نے بزدلی کی۔ ایک بیوروکریٹ سے ڈر گئیں۔ تمہارے بیوروکریٹ شوہر سے اچھا تو وہ گدی نشین روحانی پیشوا تھا جو زمیندار بھی تھا جس نے جمیلہ ہاشمی کے قلم کو طاقت دے دی اور وہ مسلسل لکھتی رہی۔"

"شاید میں مسلسل لکھنا نہیں چاہتی تھی۔ شاید مجھے اتنا ہی لکھنا تھا۔ شاید میں بزدل تھی یا میرے اندر چشمہ رُک گیا تھا۔"

"وہ یہ سب کہتے کہتے سو گئی اور میں نے دیکھا وہ وہاں نہیں تھی"۔۔۔۔ میں نے آنس کو دیکھا وہ بھی سو گئے تھے۔ ہم سب لگتا تھا وقت کے سیال مادّے میں پگھلے ہوئے وقت کے دھارے میں اِدھر سے اُدھر ڈول رہے تھے۔ کون کب ہمارے قریب سے گذرا اور ہم کب کس کے سامنے آ گئے۔ اس پر ہمارا بس نہیں چلتا تھا۔۔۔۔ اس طرح ڈولتے ڈولتے میں بھی کہیں سو گئی۔

میں نیند سے اُٹھی ہوں۔ مگر کہاں ہوں۔ میرے ساتھ عجیب سلسلہ ہوتا تھا کہ جسم سو گیا ہے، دماغ اور سوچ جاگ رہی ہے۔ آنکھیں بند ہیں۔ دماغ چل رہا ہے اور مجھے باہر کی ساری آوازیں آ رہی ہیں۔ مجھے سب پتہ چل رہا ہے کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ مگر جسم مکمل نیند کا لطف اٹھا رہا ہے۔۔۔۔ ایسا دو دو گھنٹوں تک چلتا رہتا تھا۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ میں نیند میں ہوں اور مجھے محسوس ہوتا تھا کہ بستر پہ کسی نے میرے ہاتھ پاؤں جکڑ رکھے ہیں اور میں کوشش کر رہی ہوں چھڑانے کی۔ ایسے میں چیخ نکلتی ہے تو آنکھ کھل جاتی ہے۔ دیکھتی ہوں کہ خواب میں بھی اسی بستر پر تھی اور اب بھی اُسی بستر پر ہوں۔ میں حیران ہوتی ہوں کہ خواب میں بھی اُسی جگہ تھی۔ جاگ کر بھی اُسی جگہ پر ہوں۔ اب جب صدیاں اُلٹ پلٹ ہو جائیں تو پھر انسان کیا جاگے کیا سوئے۔ ایک جیسا ہوتا ہے۔۔۔۔ قصہ سوتے جاگتے کا ہماری داستانوں میں لگتا ہے یہی ہوتا تھا۔۔۔۔ اب میں سوزین اور کیتھی کے بچوں کا انتظار کر رہی تھی کہ کب وہ آتے ہیں اور میں آنس کو اُن کی غلامی سے نجات دلا دوں۔ لیکن یہ میرے بس میں تو تھا نہیں۔ اب ایسے میں ایک دن۔۔۔۔

آنس نے اپنا قلم بند کیا۔ پھر اپنی ساری تحریروں کے کاغذات کو جمع کیا۔ ان کو ترتیب دیا کہ اب

اُسے کچھ لکھنا نہیں تھا۔ تاریخ کا سمندر بہہ رہا تھا۔ مگر وہ اپنی کشتی کنارے لگانا چاہتا تھا۔ وقت کا سیال سمندر بہے جا رہا تھا۔ وہ وقت کے ساتھ چلنے سے انکار کر رہا تھا۔ تاریخ مؤرخ کو روند کر آگے نکل جاتی ہے۔ یہ وہ جگہ ہوتی ہے جب تاریخ خود کو مؤرخ سے آزاد کراتی ہے اور بتاتی ہے کہ وہ کسی کے تابع نہیں۔ اُس کی اپنی حکمرانی ہے۔ اور مؤرخ تو خود تاریخ بن جاتا ہے۔ نام ونشان نہیں ملتا۔۔۔۔ آنس نے اپنی تحریروں کو دیکھا۔ بہت کچھ ضائع کیا کہ تاریخ ضائع بھی ہو جاتی ہے۔ بلکہ ہم نے تاریخ کو ضائع ہی کیا ہے۔ اگر ہم تاریخ کو ضائع نہ کرتے تو کیا مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہو سکتا تھا۔ ہم نے تاریخ ہی نہیں اپنے وجود کو بھی ضائع کیا۔

آنس نے مجھے بلایا اور کہا۔ ''میں صرف تمہارا مجرم ہوں۔ تم نے میری ڈائریاں پڑھ لی ہیں جو میں نے صرف تمہارے لئے لکھی تھیں۔''

''ہاں میں نے پڑھ لی ہیں۔ اگر تم مجھے شادی سے پہلے بتا دیتے تو۔۔۔۔''

''تو پھر شادی نہ ہوتی۔ شادی ہونی چاہئے تھی تا کہ تمہیں پتہ چلتا کہ شوہر کیا ہوتا ہے۔''

''اب مجھے معلوم ہو گیا ہے۔ اب تم اور کیا چاہتے ہو؟''

''کچھ نہیں۔ میں یہ لکھ رہا ہوں کہ جب صبح کو میں نہ اُٹھوں تو سمجھ لینا، میں بہت پرامن طریقے سے خلا اندر خلا سے گذر چکا ہوں۔''

''تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ مستقبل کی تاریخ کیا ہو گی؟''

''میں مستقبل کی تاریخ پر کام کر چکا ہوں۔ تمہیں بتایا تھا۔''

''ہاں بتایا تھا، پھر۔۔۔''

''پھر یہ کہ میں نے دو لفافے تیار کئے ہیں۔ ان میں دو چیک ہیں۔ ایک سوزین کی بیٹی جیسمین کے لئے دوسرا کیتھی کے بچے کے لئے لڑکا یا لڑکی معلوم نہیں''۔۔۔۔

''یہ اُن کو مل جائیں گے اگر کوئی آیا تو۔''

''ہاں باقی میرے اکاؤنٹس اور پراپرٹی تمہارے اور بچوں کے لئے ہے۔''

''مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ اس لئے کہ میرے اپنے اکاؤنٹس ہیں اور میری کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آج بھی اگر مجھے کینسر ہو تو اتنی دولت ہے کہ میں علاج کرا سکوں۔''

''لیکن میں نے تمہارے لئے تمہارا حصہ رکھ دیا ہے۔''

''اُسے کسی خیراتی ادارے کو دے دو۔''

''یہ نیک کام تم خود کر سکتی ہو ـــــ میری پراپرٹی اور بینک اکاؤنٹس اب تمہارے اور بچوں کے ہیں۔ جیسے چاہو، بانٹ لو۔ ہاں ایک کام کرنا۔ جب میں سو جاؤں تو تینوں بچوں کو اطلاع نہ دینا۔ تینوں کی فلائٹس تین چار دنوں سے پہلے نہیں آسکیں گی اور پھر یہ بھی ہے کہ وہ تینوں اپنے کاموں میں مصروف ہوں گے۔ میں اُن کے لئے ضروری نہیں ہوں ـــــ مجھے کسی گھٹیا ہسپتال کے سستے فریزر میں نہ رکھنا۔ مجھے اُسی دن دفنا دینا۔ بس یہ کرنا کہ ایک فون میسج کر دینا۔ اطلاع ہو جائے گی۔ آج کم سے کم یہ سہولت تو ہے۔''

''اور اگر میں پہلے گزر گئی تو؟''

''تو پھر یہ سب میں کرلوں گا۔ مگر میں تمہاری طرح معاملات کو سنبھالنے والا نہیں ہوں۔ اس لئے بہتر ہے تم میرے بعد یہاں سے جاؤ۔''

پھر وہ کہیں چلے گئے۔ بیٹھے بیٹھے خود سے بولنے لگے کہ رات کے خواب میں سمندر میں پاؤں رکھا تو ایک محل میں پہنچ گیا۔ جہاں سب پتھر کے لوگ تھے۔ مچھلیاں اُن کے اوپر سے نیچے سے گزر رہی تھیں۔ پھر غائب ہو گئیں۔ میں حیران گم سم گھومتا رہا۔ ایک جگہ رک گیا۔ وہاں سوزین پتھر کی ہو چکی تھی۔ وہ کب وہاں آئی اور کیوں آئی۔ پھر آگے ایک علاقہ حبشیوں کا ملا۔ جہاں کیتھی کا آدھا جسم پتھر کا آدھا انسان کا۔ میں ٹھٹک گیا۔ کیتھی کا اوپر کا دھڑ پتھر کا تھا۔ اُس کی چھاتیاں ننگی تھیں اور پتھر کی تھیں۔ مجھے لگا کہ جب لندن میں وہ میرے سامنے تھی تو تب بھی وہ چھاتیاں پتھر کی تھیں ـــــ میں نے ان چھاتیوں کو چھونے کی کوشش نہیں کی۔ ہو سکتا ہے میں پتھرا جاتا۔ اب جو دیکھتا ہوں ظہیر کاشمیری ہاتھ میں گرز لے کر آرہا ہے۔ سامنے جنرل ضیاء الحق پوری وردی میں کھڑا ہے۔ وہ پتھر کا بن چکا ہے۔ ظہیر کاشمیری اپنی کڑک آواز میں گرز لے کر اُس پر حملہ آور ہوتا ہے اور بولتا ہے۔ اوئے میں کمیونسٹ ہوں اور کمیونسٹ پیدائشی یا تو قیدی ہوتا ہے یا حملہ آور ـــــ تو اب میں حملہ آور ہوں اور یہ کہہ کر اُس پتھر کے ضیاء الحق کو پاش پاش کر دیتا ہے۔ اور پھر فرش پر بیٹھ کر رونے لگتا ہے۔ خوب بین کر رہا ہے اور میں ظہیر کاشمیری کے پاس جاتا ہوں اور کہتا ہوں۔ ''سر آپ نے دشمن کو مار دیا ہے۔ پھر روتے کیوں ہیں؟'' ظہیر کاشمیری مجھے دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔ ''میرا دشمن مر گیا ہے۔ اب میں کس سے لڑوں گا۔ میرے زندہ

ہونے کا جواز ختم ہو گیا ہے۔ اب میں دنیا کی نظر میں Rebel without Cause بن چکا ہوں۔ میں بھی دشمن کے ساتھ مر چکا ہوں۔ دشمن کو کبھی نہ مارو۔ اُسے زندہ رکھو تا کہ تم زندہ رہو۔ میں پاگل تھا اپنے ہاتھوں دشمن کو مار دیا۔ اور خود بھی مر گیا۔"

میں نے دیکھا وہ یہ سب بول نہیں رہے تھے وہ با قاعدہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ خواب میں چل پھر رہے ہیں۔ اس کے بعد وہ خاموش ہو کر سو گئے۔ مجھے بھی ایسا محسوس ہوا میں بھی کسی خواب کی لہروں میں تیر رہی ہوں۔ خواب کی لہریں آتی ہیں اور ہمیں اپنی لپیٹ میں لے جاتی ہیں۔۔۔۔ میں کہاں ہوں؟۔۔۔ ایک بہت بڑی کانفرنس ہے اور میری بیٹی گود میں ہے اور مجھے بات کرنی ہے۔ سب دیکھ رہے ہیں۔ میں سٹیج پر آتی ہوں۔ بیٹی مائیک کا رخ بدل دیتی ہے۔ لوگ ہنستے ہیں۔ میں پھر مائیک ٹھیک کرتی ہوں، بیٹی مائیک کا رُخ پھر بدل دیتی ہے اور پھر منظر بدل جاتا ہے۔ میں ایک پتھر سے تراشے گئے قدیم قلعے کی راہداریوں میں بھول بھلیوں میں گھوم رہی ہوں۔ دن میں بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے۔ یہ بڑے پہاڑ کو تراش کے قطب شاہی خاندان نے حیدر آباد دکن میں بنایا تھا۔۔۔ سب کچھ پتھر کا ہے۔ ہاں یہی تو قلعہ گولکنڈہ ہے۔ میں ایک راہداری سے دوسری میں آتی ہوں۔ میں اکیلی ہوں اور مجھے ستار بجانے کی آواز آرہی ہے۔ میں اُس جانب بھاگتی ہوں۔ کوئی دیوار آجاتی ہے۔ میں مڑتی ہوں سیڑھیاں کھل جاتی ہیں۔ میں انہیں عبور کرتی ہوں ایک چوراہا آجاتا ہے۔ آسمان کا ٹکڑا اوپر دکھائی دیتا ہے۔۔۔ پھر میں بھول بھلیوں میں اِدھر سے اُدھر بھاگتی ہوں۔ اب میں آواز کی سمت جارہی ہوں۔۔۔ ستار کی آواز اب پتھروں کی راہداریوں میں گونج رہی ہے۔ ساتھ میں الاپ بھی شامل ہو چکا ہے۔۔۔ اب مجھے وہم سا ہو رہا ہے۔ کہیں یہ دو بہنیں تارہ متی اور میرا متی تو نہیں ہیں جو پہاڑ کی بارہ دری پر گاتی تھیں اور قلی قطب شاہ ان کی آواز سننے کے لئے ہوا کے رُخ پر آکر بیٹھ جاتا تھا کیونکہ وہ دونوں اُس کے دربار میں گانے پر تیار نہیں تھیں۔ ان کی اسی ادا پر قلی قطب شاہ نے حکم دیا کہ شاہی گورستان میں ان دو بہنوں کو دفن ہونے کی اجازت ملے گی اور وہاں دو قبریں گورستانِ شاہی میں اب بھی موجود ہیں۔

اب میں بھاگ رہی تھی اور وہ آوازیں کلاسیکی گائیکی میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ ایک چبوترے پر دونوں بہنیں آسن جما کر بیٹھی تھیں۔ نیچے بیش قیمت ایرانی قالین تھا کہ قلی قطب شاہ آصفیہ خاندان سے رسم وراہ میں تھا اور ایرانی کلچر کے اثر میں تھا اور یہی وجہ بنی کہ اورنگ زیب نے ہزاروں میلوں سے آکر اس قلعے پر حملہ

کیا اور فتح کرلیا۔ تارہ متی اور میرا متی نے کوئی راگ چھیڑا تھا ـــــ اور اُس کی گونج پورے قلعے میں پتھروں پر تیرتی ہوئی پھیل رہی تھی۔ میں ان کے سامنے آگئی ہوں۔ اب میں سامنے بیٹھ گئی ہوں۔ انہوں نے اپنا راگ مکمل کیا۔ تارہ متی نے ستار رکھا اور میری طرف دیکھا۔

''اجنبی ہو ـــــ کہاں سے آئی ہو؟ کوئی بھٹکی ہوئی روح ہو یا ان پتھروں میں تمہیں کسی نے چنوا دیا تھا اور اب تمہاری روح یہاں بھٹک رہی ہے؟''

''نہیں میں تو ٹورسٹ ہوں۔ اجازت لے کر اندر آئی ہوں۔ میں نے تم بہنوں کو پہچان لیا ہے۔ مگر تم تو مر چکی ہو'' ـــــ

''شاید تم مر چکی ہو۔ اس کا فیصلہ کون کرے گا؟''

''اگر ہم مر بھی چکے ہوں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ میں تم دونوں بہنوں کی عاشق ہوں۔''

''تم نے ابھی سنا ہی کیا ہے۔''

''جو سنا وہی بہت ہے ـــــ کہ اُس سے آگے کیا تان سین گائے گا۔''

''تم موسیقی کو کتنا جانتی ہو؟''

''اگر میں تم دونوں کو جانتی ہوں تو پھر موسیقی کو بھی جانتی ہوں۔''

''ہم دونوں تو اس قلعے کے پتھروں میں پتھر کی ہو چکی ہیں۔''

''یہی میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ تم دونوں کیسے زندہ ہو جاتی ہو؟''

''قلی قطب شاہ نے اپنا قلعہ ہمارے نام کر دیا تھا۔ اس لئے اب ہم یہاں رہتی ہیں۔''

''گویا آپ کی روحیں یہاں آباد ہیں۔''

''روحیں بھی تو زندہ ہوتی ہیں۔ ہم زندہ ہیں ـــــ اور تم؟''

''میں نہیں جانتی کہ زندہ ہوں یا نہیں آپ دونوں اب اس قلعے میں رہتی ہیں؟''

''ہاں، روزانہ رات کو قلی قطب شاہ آتے ہیں۔ دربار لگاتے ہیں اور ہم دونوں بہنیں گاتی ہیں۔ ساز بجاتی ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے قلی قطب شاہ کی زندگی میں یہ خواہش پوری نہ ہوئی اب ہو رہی ہے۔''

''ہوسکتا ہے یہی قلی قطب شاہ کی زندگی ہو۔ اور وہ محض خواب ہو۔''

''ہاں ایسا ہوسکتا ہے۔''

اب میں خواب میں تھی کہ حقیقت میں۔ یہ معلوم نہیں تھا اور منظر بدل گیا —— میں قلی قطب شاہ کو شام میں آکر ان بہنوں کی موسیقی سنتے ہوئے دیکھنے سے رہ گئی۔

اب میں اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی ہوں۔ آنس سو چکا ہے اور مجھے آنس کے دو بچوں کا انتظار ہے۔ ایک سوزین کی بیٹی ہے اور دوسرا یا دوسری کیتھی کا بچہ ہے۔ ایسے میں پھر سو گئی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ میں ایسے باغ میں داخل ہوئی ہوں جہاں فیض صاحب گلاس لے کر غالب کی طرف آ رہے ہیں۔ اور غالب بے نیاز بیٹھے آسمان کو دیکھ رہے ہیں۔ فیض صاحب خاموشی سے بیٹھ جاتے ہیں اور غالب اپنے خالی گلاس کو اٹھا کر فیض صاحب کو بتاتے ہیں۔ فیض صاحب اس گلاس کو بھرتے ہیں اور بیٹھ جاتے ہیں۔ ایسے میں احمد فراز آتے ہیں اور وہ بھرا ہوا گلاس لے کر بیچ میں بیٹھ جاتے ہیں۔ فیض صاحب غالب سے کہتے ہیں یہ میرا لاڈلا بچہ ہے۔ غالب کہ بے حد نخوت سے بھرے ہوئے ہیں۔ کوئی بات نہیں کرتے اور اُٹھ جاتے ہیں۔ فیض صاحب جا کر انہیں منا لاتے ہیں۔ غالب کہتے ہیں۔ ''فیض دیکھو میرے شاگرد بہت ہیں مگر میں انہیں اس طرح کی محفل میں شریک نہیں کرتا —— بس خط کا جواب خط سے دیتا ہوں۔''

''یہ شاگرد نہیں ہے میرا لاڈلا ہے۔''

''فیض یاد رکھو۔ یہ غزل عجیب صنف ہے یا خود مر جاتی ہے یا غزل گو کو مار رکھتی ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے غالبِ زماں۔''

''ہاں مگر یہ فراز بیچتا کیا ہے؟''

''آپ ہی کو بیچتا ہے۔ یہ کوئی کم تجارت ہے۔''

''فیض نہیں مجھے بیچنا آسان نہیں ہے۔ کیا بات کرتے ہو۔ یہ آپ کو بیچ رہا ہے اور آپ مجھے بیچ رہے ہیں۔ اچھی بات ہے۔ مجھے تو بے شمار شاعر بیچ رہے ہیں۔ تم بھی بیچو۔''

''غالب صاحب یہ آپ نے کیا کہہ دیا۔ میں آپ کو کیا بیچوں گا۔ آپ تو خود بیدل کو بیچ رہے ہیں۔ اس طرح تو ہم سب کسی نہ کسی کو بیچ رہے ہیں۔''

''فیض تم عقلمند ہو۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میرا گلاس خالی تھا اس لئے ایسا کہہ گیا۔ بھر دو میرا گلاس۔''

''ہاں تو احمد فراز سے آپ گلاس کا معانقہ کریں۔''

''بھئی فراز آؤ گلاس سے گلاس ملاؤ۔''

''حضرت آپ کے گلاس سے گلاس ملانا تو ایسے ہے جیسے دل سے دل اور ہونٹ سے ہونٹ ملانا۔''

''فیض یہ تیرا لاڈلا بے تکلف ہو گیا ہے۔ اسے کہو یہ بڑوں کے جوتوں میں پاؤں رکھنا چھوڑ دے۔ اس کے پاؤں سکڑتے جائیں گے۔''

''حضرت مجھے فیض صاحب کی عزت کا پاس ہے۔ جواب تو میں ایسے دوں کہ آپ کا مغل خون پگھل جائے۔ فارسی میں میں نے بھی ایم۔ اے کر رکھا ہے۔ جانتا ہوں بیدل کو بھی اور آپ کے فارسی کلام کو بھی۔''

''اب یہ آپ کا لاڈلا گستاخی کر رہا ہے۔''

''فراز دیکھو اپنے میں اور منیر نیازی میں فرق کرو۔ یہ منیر نیازی کا لہجہ ہے۔''

''نہیں فیض صاحب یہ فراز کا بھی لہجہ ہے۔ بھلا پوچھیں حضرت جی سے جن کا پیشہ سو پشت سے سپاہ گری رہا ہے۔ انگریز کے آگے ہتھیار کیوں ڈالے۔ پوچھیں۔ کس لئے کلکتہ جوتیاں رگڑتے ہوئے گئے۔ جن جوتوں کا طعنہ دے رہے ہیں ملکہ کی شان میں قصیدہ میں نے تو نہیں لکھا تھا۔ میں نے تو فوجی حکمران کو جوتے پہ لکھا تھا۔ جیل گیا تھا۔ آپ بھی جیل کاٹ آئے۔ ہمارے حضرت تو جیل گئے مگر جوئے کے الزام میں۔''

''فراز گلاس لے کر چلے جاؤ۔ تم آؤٹ ہو گئے ہو۔ آؤٹ ہو جاؤ۔''

اب جو میں نے دیکھا غالب تو وہاں تھے ہی نہیں ــــــ اور فیض اکیلے گلاس لئے لڑھک رہے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ یہ سب ایک خواب ہے۔ مگر خواب میں بھی تو راستہ نکلتا ہے اور میں اُس راستے کی تلاش میں تھی ــــــ کہ مجھے صبح کی دستک محسوس ہوئی۔ میں نے پردہ ہٹا کر دیکھا صبح کے آثار تھے۔ میں صبح کو طلوع ہوتے دیکھنا چاہتی تھی۔ کئی بار پہلے دیکھا تھا۔ مگر آج کچھ اور ہی دلکشی محسوس ہو رہی تھی۔ ایسی صبح

میں نے ایک بار کالام کے اُس گیسٹ ہاؤس میں دیکھی تھی جو نسبتاً ایک ہموار زمین پر بنا ہوا تھا اور ساتھ میں کھیتوں میں شلجم کی فصل تیار تھی۔ وہ صبح برف میں ڈھلی ہوئی تھی۔ جیسے پہلی رات کی دلہن غسل کر کے آئی ہو۔ اُس صبح مجھے محسوس ہوا تھا کہ میں صبح کی چادر لے کر کہیں بھی جا سکتی ہوں۔ آج بھی میرا احساس تھا کہ میں صبح کی اوڑھنی اوڑھ کے کہیں نکل جاؤں۔ اس منظر کے بیچ سے غائب ہو جاؤں۔ یہ تو ایسے ہی ہے کہ لکھنے والا اپنی کہانی سے چپ چاپ نکل جائے، جیسے کوئی کسی وجہ سے اپنے گھر سے نکل جاتا ہے ہمیشہ کے لئے۔ وجہ کچھ بھی ہو سکتی ہے اور یہاں بھی میرے پاس وجہ تھی۔ میں سوزین کی بیٹی جیسمین اور کیتھی کے لڑکے یا لڑکی جس کا مجھے علم نہیں تھا، کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے کہانی کو چھوڑ کے جانا چاہتی تھی۔ ویسے تو بے شمار دنیا کے کہانی کاروں نے اپنی کئی کہانیوں کو چھوڑا ہے اور اُن میں سے نکل گئے۔ منٹو صاحب اپنی کہانی ''پھندنے'' میں سے نکل گئے۔ اس لئے وہ بڑی کہانی بن گئی۔ گبریل گارشیا مارکیز اپنے ناول ''سو سال کی تنہائی'' میں سے نکل گئے۔ ایک نقاد نے اُن سے پوچھا کہ آپ کا یہ ناول ادھورا محسوس ہوتا ہے۔ لگتا ہے آپ اسے چھوڑ کے کہیں اور نکل گئے تو اُس نے کہا۔ ''ہاں یہ ٹھیک بات ہے۔ یہ ادھورا ہے۔ کیونکہ اسے میرے قاری نے مکمل کرنا ہے اور مجھے نکل ہی جانا تھا کہ مجھے کہیں اور کسی کہانی کی طرف جانا تھا۔''

میں بھی مارکیز کی طرح اپنی کہانی کو چھوڑنا چاہتی تھی۔ کبھی کبھی مائیں بھی اپنے بچوں کو چھوڑ کر کہیں نکل جایا کرتی ہیں۔ اتنی وفاداری سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ اُس صبح بھی میں اپنی کہانیوں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ اور میرے پاس صبح کے ساتھ بھاگنے کا بہانہ بھی تھا۔ مگر مجھے صبح پر اعتبار تھا۔ اگر اس نے بے وفائی کر دی تو پھر یہ دوہری بے وفائی ہو جائے گی۔ میں انتظار کھینچتی رہی کہ دن چڑھ جائے اور میں کسی بھی طرح سے اپنی کہانی میں سے نکل جاؤں۔ ویسے میرے جیسی لکھنے والی کا ایک مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ کہانی کی سہیلی بن چکی ہوتی ہے۔ جیسے عصمت چغتائی نے کہانی کو سہیلی بنایا۔ امرتا پریتم نے کہانی کو نہ صرف سہیلی بنایا بلکہ دوپٹہ بدل بہن بنایا۔ قرۃ العین حیدر نے کہانی کو اپنے وجود کا حصہ بنایا لیکن کئی موقعوں پر کہانی کو خود سے الگ کرنے کا کشٹ کیا ـــــ ایسا تو کہانی کی تاریخ میں ہوتا رہا ہے ـــــ تو میرے ساتھ بھی ہوا۔ لیکن میں کہانی سے بے وفائی نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے میں بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ صبح گذر گئی۔ میری روح پر سے کئی دوپہریں گذر گئیں۔ اب جو میں نے خود کو سنبھالا تو دیکھا آنس ابھی تک سو رہا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ آنس کو اپنے دونوں بچوں کا

انتظار ہے۔ اب یہ دونوں بچے میری کہانی میں کیوں آ گئے۔ میں انہیں اپنی کہانی میں کیوں آنے دوں؟ مگر وہ تو کہانی میں آ چکے تھے ــــ آنس نے اپنے اعتراف میں جو دو تحریریں میرے لئے لکھی تھیں، اُن میں یہ دونوں موجود ہیں۔ اور صرف ان دونوں کی وجہ سے وہ تحریریں لکھی گئیں۔ تو اب میری کہانی سے وہ نکل نہیں سکتے۔ تو کیا میں اُن کی سوتیلی ماں ہوں۔ وہ میرے لئے کیا ہیں؟ کیا میں اُن کا استقبال کروں یا اُن سے نفرت کروں۔ میرے اندر تو کوئی بھی جذبہ موجود نہیں ہے اور پھر آنس نے مجھے دو لفافے اُن کے لئے دیئے ہیں جو مجھے اُن تک بہر حال پہنچانے ہیں۔

آنس گہری نیند میں چلا گیا تو میں نے ڈاکٹرز کو بلایا۔ سب نے اُسے ہاتھ لگائے بغیر بتایا کہ وہ اس حالت میں کئی سالوں تک سویا رہ سکتا ہے کہ وہ اپنی یادداشت سے باہر نکل گیا ہے۔ یہ نیند اتنی گہری ہو سکتی ہے کہ اُسے محسوس بھی نہیں ہوگا کہ اُس پر سے صدیاں گذر جائیں گی۔ تو کیا ایسے میں مجھے اُس کے بچوں کے انتظار میں بیٹھنا ہوگا۔ اگر میں اپنی کہانی کو مکمل کرنا چاہتی ہوں تو پھر مجھے ان بچوں کا انتظار کرنا ہوگا۔ یہ تو وہ قربانی ہے جو میں کسی صورت نہیں دینا چاہتی اور آنس اگر اسی طرح سویا رہا تو میں کیسے اتنی دیر زندہ رہ سکتی ہوں۔ اس کا مطلب ہے مجھے اُس وقت تک کہانی میں رہنا ہے جب تک وہ دونوں نہیں آ جاتے۔ کیا معلوم وہ دونوں نہ آئیں؟ کیا معلوم وہ الگ الگ وقفوں سے آئیں تو ایسے میں مجھے کتنا لمبا جینا ہوگا۔ اور کیا جینا میرے بس میں ہے؟ ظاہر ہے نہیں ہے۔ اب آنس میری کہانی میں سو چکا تھا۔ جب کوئی کہانی میں سو جائے تو کہانی تو نہیں سو سکتی۔ میں کہانی کے ساتھ جاگ رہی تھی ــــ

میں آنس کے کمرے میں جاتی تھی اور انہیں دیکھتی تھی۔ وہ سو رہے ہوتے تھے۔ اب سوچتی تھی کہ وہ ایسے ہی سوتے رہیں گے۔ یہ کیسی نیند ہے؟ کیا یہ اصحاب کہف کی نیند ہے یا Clinically dead آدمی کی نیند ہے جو وینٹی لیٹر پر رہتا ہے۔ اور کوئی نہیں جان سکتا کہ وہ کب تک وہاں رہے۔ مگر وہ تو ٹھیک سو رہا ہے۔ جب سویا تھا تو اکیسویں صدی کا آٹھواں پہر شروع ہو چکا تھا۔ اب تو میں بھی سالوں، مہینوں، دنوں کا حساب بھول گئی ہوں۔ ہم کس صدی میں تھے؟ کس صدی میں ہیں؟ ــــ بلکہ مجھے تو ایسا بھی لگتا ہے کہ میں کب کس زمانے میں ہوں۔ کس صبح میں ہوں کہ شام میں ہوں۔ صبح کا ایک حصہ شام سے ملتا جلتا ہوتا ہے۔ اور شام کا آغاز صبح کے آغاز جیسا ہوتا ہے یا نہیں مگر محسوس ہوتا ہے۔ مجھے قرآن کی وہ آیت یاد آتی رہتی تھی کہ اللہ تمہارے

درمیان دنوں کو پھیرتا رہتا ہے اور میں اب اُس کا تجربہ کر رہی تھی۔ مگر آنس تو اطمینان سے سویا تھا۔ اُسے کوئی تکلیف نہیں تھی۔ مگر ڈاکٹرز نے کہا وہ فطری نیند سو رہا ہے۔ آپ اُسے اٹھانے کی کوشش نہ کریں۔ اُس کے لئے تکلیف دہ ہوگا۔

اب میں بھی سوگئی۔ سوتے میں وقت تو ہوتا ہی نہیں ہے۔ آپ کب کس خواب میں جاگتے ہیں اور کس خواب میں سوتے ہیں۔ آپ کو اس کا کیا علم؟ میں کبھی کبھی خواب سے نکل آتی تھی اور اپنے لان میں اپنے پودوں کو دیکھتی تھی۔ پودے، بچوں جیسے ہوتے ہیں۔ روزانہ اُن سے باتیں نہ کرو تو مرجھا جاتے ہیں۔ روزانہ ان کے سر پر ہاتھ نہ پھیرو تو وہ روٹھ جاتے ہیں۔ میں خواب سے نکل کر آتی اور اپنے پودوں سے باتیں کرتی اور اُن کو پانی دیتی۔ پھر میں واپس نیند میں چلی جاتی۔ یہ سب ممکن ہے۔ ہم کیسے بے حس لوگ ہیں کہ نیند کے وقفے کو اپنی زندگی سے الگ کر دیتے ہیں۔ نیند ہی تو وہ وقفہ ہے جب ہم وہ زندگی جیتے ہیں جو ہم حقیقت میں جی نہیں سکتے ایسی نیند کو ہم اپنی زندگی سے نکال دیتے ہیں۔ میں نے نیند کو بسر کرنا شروع کر دیا۔ نیند کو اگر آپ عزت دیں اور اُس کی گود آپ کو حاصل ہو جائے تو پھر نیند آپ کے سارے راز اپنے میں چھپا لیتی ہے۔ آپ کی دوست بن جاتی ہے۔ آپ کی ہر خواہش پوری کرتی ہے۔ آپ کو نیند اپنے اندر بیداری کا موقع بھی دیتی ہے۔ آپ سوئے ہیں لیکن بیدار ہیں۔ ایسا تجربہ میں کرنے لگی تھی اور جب چاہتی تھی نیند کی کھڑکی کھول کر بیداری میں آجاتی تھی ــــــ کبھی کبھی آنس کے کمرے میں چلی جاتی۔ وہ بچوں کی نیند سو رہے ہوتے تو میں اُن کو ماتھے پر ہاتھ سے لمس دیتی کہ شاید وہ آنکھیں کھول دیں۔ لیکن ایسا نہ ہوتا تو میں فوراً واپس نیند کے پاس چلی جاتی۔ ایسا ہوتا رہا جیسا ہمارے قصوں میں ہوتا ہے۔ چاہے وہ قصہ سوتے جاگتے کا میں ہو یا شہزادہ آزاد بخت کے قصے میں ہو ــــــ

ایک دن جس کا انتظار تھا میں نیند سے نکل کر جب بیداری میں آئی تو گھر کی گھنٹی بجی۔ گویا میرے اندر کی گھنٹی بجی کہ کوئی آیا ہے۔ یہ کوئی دھوبن نہیں ہوگی کوئی باورچن نہیں ہوگی کوئی صفائی والی نہیں ہوگی۔ ہر گھنٹی کی آواز میں گھنٹی بجانے والے یا والی کا اعلان ہوتا ہے کہ کون آیا ہے۔ ڈاکیے کی گھنٹی اور ہوتی ہے اور دودھ والے کی گھنٹی اور ہوتی ہے۔ مجھے ایسے محسوس ہوا کہ کوئی آیا ہے۔ جس کا مجھے انتظار تھا۔ مگر مجھے کس کا انتظار تھا؟ آدھی نیند میں اور آدھی جاگی ہوئی میں نے سوچا کس نے آنا تھا۔ ایسے میں کیتھی اور سوزین دونوں

کے بچوں نے آنا تھا۔ اب اُن میں سے کون آیا ہے؟ یہ ایک سوال تھا۔ گھر میں صرف میں تھی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ ایک لڑکی تھی اور وہ بھی گوری۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ جیسمین ہے۔ سوزین کی بیٹی یا آنس اور سوزین کی بیٹی۔۔۔۔۔

''ہیلو!''

''ہیلو!''

''میرا نام جیسمین ہے۔''

''جانتی ہوں۔ اندر آ جاؤ۔''

''میں اپنے باپ سے مل سکتی ہوں؟''

''کیا تم جانتی ہو کہ تمہارا باپ کون ہے؟''

''ہاں میری ولدیت میں میرے باپ کا نام لکھا ہے اور یہ میرا گریجویشن کا سرٹیفکیٹ ہے۔ دیکھ لو۔''

''ہاں مجھے معلوم ہے۔ انہوں نے تمہاری ماں کو اجازت دی تھی۔ یہ نام استعمال کرنے کی۔''

''آپ میرے باپ کی کیا لگتی ہیں؟''

''میں ان کی قانونی بیوی ہوں۔''

''میں زیادہ وقت نہیں لوں گی صرف باپ کو اپنی ماں کا ایک پیغام دینا چاہتی ہوں اور پھر میں چلی جاؤں گی''۔

''آؤ اندر اور اگر پیغام زبانی ہے تو سوچ لو۔ کیونکہ وہاں تمہارے باپ کی صرف شبیہ دکھائی دے گی۔ میرا مطلب ہے ایک صورت ہوگی اور تم وہ صورت دیکھ لینا۔''

میں اُسے لے کر اندر گئی۔ آنس سوئے ہوئے تھے۔ جیسمین نے انہیں دیکھا اور کہا۔ ''یہ تو فطری نیند سو رہے ہیں۔ کب جاگیں گے؟ میں انتظار کروں گی۔''

''تو تمہیں صدیوں تک انتظار کرنا ہوگا۔ وہ اپنی آخری نیند میں جا چکے ہیں۔''

''کیا مطلب؟ وہ Clinically dead ہو چکے ہیں؟''

''میں نہیں جانتی۔ مگر کہتے ہیں کہ سویا اور مرا ایک جیسا ہوتا ہے۔ اب تم سوچ لو کہ تمہارا باپ زندہ

ہے یا زندہ نہیں ہے۔"

"اس حال میں انہیں میں نہیں دیکھنا چاہتی۔ ماں نے مجھے اُن کی تصویریں دکھائی تھیں۔ اب بھی میرے پاس ہیں۔"

"صرف اتنا بتاؤ کیا تم باپ کی تصویر کے ساتھ جوان ہوئی ہو؟ کیا رشتہ بنا ہے تمہارا باپ کے ساتھ، تصویر کا یا ماں کی یادوں کا؟"

"ماں کی یادوں کے ساتھ جوان ہوئی ہوں اور شاید تم نہیں جانتی کہ یہ یادوں کا رشتہ کتنا مضبوط ہوتا ہے کہ حقیقت اور تخیل میں ہمیشہ تخیل زیادہ پھیلا ہوا ہوتا ہے اور اُس کی سرحدیں زیادہ دور تک جاتی ہیں۔"

"لڑکی تم کیا پڑھی ہو اور کیا کر رہی ہو؟"

"میں نے Enviornmental Science میں پی ایچ ڈی کی ہے اور میں ایک انٹرنیشنل ادارے کے ساتھ کام کر رہی ہوں۔ اس لئے میرا آنا جانا پوری دنیا میں رہتا ہے۔ اسی وجہ سے میں پاکستان آئی ہوئی ہوں۔ خاص طور پر باپ سے ملنے نہیں آئی۔ میں سندھ کی جھیلوں پر کام کر رہی ہوں کہ وہاں اب مہاجر پرندے آنا کیوں کم ہو گئے ہیں۔"

"پرندے آ تو رہے ہیں، جیسے تم آئی ہو۔ تم بھی تو مہاجر پرندہ ہو جو باپ سے ملنے آ گئی ہو۔ پھر اُڑ جاؤ گی۔"

"میں صرف ماں کی یادوں کا بوجھ اٹھائے پھرتی تھی۔ اب وہ بوجھ میں اُتارنا چاہتی ہوں۔"

"بوجھ اُتار کر چلی جاؤ۔ ہم نے کوئی نہ کوئی بوجھ اُتارنا ہوتا ہے۔"

"کیا میں باپ کو دیکھ سکتی ہوں؟"

"ہاں میں تمہیں کوئی پچھتاوا نہیں دینا چاہتی کہ تم دور سے آئی ہو۔ آؤ میرے ساتھ کمرے میں۔ تمہارا باپ لیٹا ہے۔ اُسے دیکھ لو اور اپنی ماں کا پیغام انہیں دے دو۔"

"لیکن وہ تو پیغام اب نہیں پڑھ سکیں گے۔ میں وہ آپ کو بتا دوں۔"

"میں وہ پیغام اُن تک نہیں پہنچا سکوں گی۔"

"مجھے تو ہر حال میں ماں سے کیا ہوا وعدہ نبھانا ہے۔"

''تم اُن کے سرہانے کھڑے ہو کر وہ پیغام دے دو۔ ان تک پہنچ جائے گا۔ اس لئے کہ یہ میرا تجربہ ہے آدمی کا جسم سویا رہتا ہے دماغ جاگ رہا ہوتا ہے اور وہ سب سن رہا ہوتا ہے۔''

''ایک شرط ہے آپ کو بھی میرے ساتھ کمرے میں جانا ہوگا۔ میری بات کا کوئی تو گواہ ہو۔''

''ٹھیک ہے۔ میں ساتھ رہوں گی۔''

پھر وہ اور میں اندر گئے۔ آنس سوئے ہوئے تھے۔ معلوم نہیں ان کا دماغ حاضر تھا یا نہیں۔ جیسمین نے باپ کو دیکھا۔ دونوں ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوئی اور پھر بولی۔

''ڈیڈی! جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے میں نے آپ کو ممی کے ساتھ دیکھا ہے۔ یہ کوئی خواب نہیں تھا۔ ممی اور آپ ایک ساتھ رہ رہے ہیں۔ اب ممی کی یادداشت زمان و مکاں سے باہر جا چکی ہے۔ وہ جب چاہیں کسی بھی وقت میں پہنچ جاتی ہیں اور آپ سے باتیں کرتی ہیں۔ جو وقت آپ کے ساتھ نہیں گذرا وہ بھی انہوں نے اپنے خیالوں میں تخلیق کر لیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان اس زمانے یا دنیا میں اتنا یقین نہیں رکھتا جتنا اپنے تخیل میں یقین رکھتا ہے۔ وہ حقیقت ہوتا ہے باقی سب بے معنی ہوتا ہے۔ ماں کا پیغام یہی ہے کہ انہوں نے زندگی آپ کے ساتھ گذاری ہے اور میں بھی اس کے ساتھ بڑی ہوئی ہوں۔ مجھے معلوم ہے آپ ماں کے ساتھ بیٹھے ہوتے تھے اور آپ دونوں کی باتیں مجھے یاد ہیں۔ آپ نے ایک دن بریانی بنائی تھی اور ماں کی سالگرہ کی شام آپ نے چکن کڑاہی اور پلاؤ بنایا تھا۔ میں نے آج تک اتنا لذیذ کھانا نہیں کھایا۔۔۔۔ ڈیڈی مجھے آپ کے کھانوں کی عادت ہو چکی ہے۔ آپ اتنا اچھا پکاتے ہیں۔ آپ اتنا اچھا سلاد بناتے ہیں اور پھر میز لگاتے ہیں۔ ممی آپ کے ہاتھ کا کھانا اب تک کھا رہی ہیں۔ وہ آپ کے ساتھ سوتی ہیں۔''

اب میں نے جب یہ سنا تو مجھے محسوس ہوا کہ آنس میرے ساتھ کون سی زندگی گذار رہے تھے۔ کیا ایک انسان دو یا دو سے زیادہ زندگیاں گذار سکتا ہے۔ جیسمین نے اپنی بات پوری کی اور باہر آ گئی۔ لگتا تھا اس کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ اب میری باری تھی۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا اور میں نے وہ لفافہ اُس کے حوالے کیا جو آنس نے مجھے اُس کے نام کا دیا تھا۔ اُس نے دیکھا اور کہا۔

''یہ میرے ڈیڈی نے میرے نام دیا ہے؟''

''ہاں دیا ہے اور دیکھ لو تمہارے نام کا ہے۔''

''میں رکھ لیتی ہوں کہ وہ میرے ڈیڈی ہیں۔ اب میں جاتی ہوں۔ آپ میرے ڈیڈی کا خیال رکھیں۔ ویسے ممی تو ڈیڈی کا خیال رکھ رہی ہیں۔''

وہ چلی گئی۔ اور میں کیتھی کے بیٹے یا بیٹی کا انتظار کرنے لگی کہ اب اُس کو بھی آنا تھا۔ میں نے جو آنس کے ساتھ زندگی گذاری کیا وہ زندگی نہیں تھی۔ میں بھی شاید آنس کی طرح کسی خواب سے گذر رہی تھی۔ اور حیران تھی کہ انسان اپنا آپ جہاں چھوڑ آتا ہے، وہ بھی اُس کا ایک اور جیون ہوتا ہے جو چلتا رہتا ہے۔ ہم سب ایک وقت میں کہاں کہاں زندگی گذار رہے ہیں۔ اب میں کیا سمجھوں۔ آنس نے میرے بستر میں سے اپنے تین بچے حاصل کئے اور وہ میرے ساتھ تھے بھی اور نہیں بھی۔ کہ وہ کہیں اور دو بستروں میں بھی تھے۔ ایسا میں بھی کر سکتی تھی۔ مجھے بھی کئی ملے تھے۔ انڈیا کا نیوڈ پینٹر ملہوترا مجھ پر عاشق تھا۔ میں بھی دوسرے بستر کی زندگی گذار سکتی تھی۔ لیکن میں نے ایسا کسی کے خوف سے نہیں کیا تھا۔ مجھے یہ کرنا ہی نہیں تھا۔ مجھے یہ پسند ہی نہیں تھا۔ کیا مرد اور عورت کی رغبت جنسی طور پر مختلف ہوتی ہے۔ یہ بات میں جانوروں کی اناٹومی کے حوالے سے دیکھوں یا انسانوں کے حوالے سے تو لگتا ہے انسان خسارے میں ہے۔

سچ بات یہ تھی کہ اب مجھے کیتھی کے کسی کردار کا انتظار نہیں تھا۔ نہ میں آنس کو اس حال میں کئی صدیوں تک دیکھنا چاہتی تھی ــــ صدیاں بھی کیا ہوتی ہیں۔ ایک پلک جھپکنے میں صدی گذر جاتی ہے۔ 1857 ــــ 1957 اور پھر 2057 کیسے بدلے۔ کیا بدلا؟ کیا نہیں بدلا؟ ہمارے ہاں تو نہیں بدلا۔ ہاں دنیا ضرور بدلی۔ جسے ہم نے نہیں بدلا ــــ ہم پر صدیاں ایسے گذر جاتی ہیں جیسے صدیاں ایک ایک کر کے اپنے اوپر سے گذر جاتی ہیں۔ مجھے اپنے تینوں بچوں سے اب کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی تھی۔ جنہیں میں نے اتنی شفقت سے پال پوس کے ایسی تعلیم دلوائی کہ وہ تینوں آسودہ زندگی کے لئے خود کو کوالیفائی کرتے ہوئے اپنی اپنی پسند کے ملک میں انتہائی اعلیٰ معاشی اور ذہنی فضیلت کے مقام تک پہنچ سکیں ــــ وہ پہنچ چکے تھے۔ اب میں ان کے لئے اور وہ میرے لئے شاید بے معنی ہو چکے تھے۔ انہیں میری اور آنس کی سالگرہ یاد رہتی تھی۔ وہ وہاں سے پھول اور تحفے بھجوا دیتے تھے۔ فون بھی مسلسل کر کے آگہی لے لیتے تھے۔ یاد دہانی بھی کراتے تھے کہ آپ چھٹیاں ہمارے پاس گذاریں اور پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کو گود لیں۔ میری کہانیوں کے محض کردار تھے، جنہیں میں نے جنم دیا۔ ہسپتال میں تین مرتبہ شدید درد میں اندر سے چیخ کی صورت درد کو باہر نکالا

تب یہ تین پیدا ہوئے۔ اور پھر جو ہر ماں کرتی ہے وہ سب ہوا۔ مگر اب میں سوچ رہی تھی کہ آنس نے مجھے دھوکہ دے کر یہ تین بچے میرے بستر سے لے لئے یا میں نے خود آنس کو اجازت دی کہ محبت کے بغیر بھی ایک معاشرتی معاہدے کے تحت تم یہ سب کر سکتے ہو۔ اب میں بھی برابر کی قصوروار تھی۔ یہ تینوں بچے ہم دونوں کی الگ الگ ضرورت اور مجبوری تھے۔ اگرچہ دیکھا جائے تو تینوں نے ہم دونوں کے اندر کی فطری محبت کو بہت سہارا دیا۔ ہماری خوشی کو دوبالا کیا۔ ہم اپنے انسانی جذبات میں مکمل ہوئے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ بس اس بات نے پاؤں جکڑ لئے۔ اب میرا غصہ کم ہوا اور میں اپنے تینوں بچوں کے بھی بچوں کے بارے میں سوچنے لگی کہ ہم میاں بیوی کے ذہنی توازن اور معاشرتی ترجیحات سے پیدا ہونے والی سچائیوں کا خمیازہ وہ بچے کیوں ادا کریں ــــــ کیا سوزین اور کیتھی کے بچے اور میرے بچوں میں کوئی فرق ہے؟ یہ سب بچے ایک نطفے سے پیدا ہوئے ہیں۔ نطفہ تو مرد کا ہوتا ہے تو پھر کیتھی، سوزین اور میرے میں کیا فرق ہے۔ اب میرے تینوں بچے بے معنی ہو چکے تھے۔ اس طریقے سے تو دنیا کے تمام بچے بے معنی ہو جاتے ہیں۔ انسانی معاشرہ ماں باپ کے اسی نازک اور مبہم رشتے کے نتیجے میں صدیوں سے اسی طرح کی نسل انسانی کو جنم دیتا رہا ہے۔ ہم سب جنسی لذت کے نتیجے میں دنیا کی آبادی میں اضافہ کرتے رہے ہیں۔ بے شک یہ جنسی لذت کسی ذہنی کسی اخلاقی کسی سماجی دیانت داری کے بغیر ہو؟

میرا اور آنس کا رشتہ کروڑوں میاں بیوی کے رشتے کی طرح یوں کہا جا سکتا ہے کہ سہولت کی شادی کے نتیجے میں پیدا ہونے والا رشتہ ہے۔ جو بچے پیدا کرتا ہے۔ انہیں پالتا پوستا ہے اور اُس میں اپنے لئے مریض اور نرس کا رول تلاش کرتا ہے کہ میاں مریض تو بیوی نرس۔ بیوی مریض تو میاں نرس ــــــ اور پھر دونوں کا انجام ایک میلوڈرامے کی فضا میں ختم ہوتا ہے ــــــ

اب میں بھی سونا چاہتی تھی کہ دنیا کا ہر رشتہ کسی نہ کسی مصلحت کی لپیٹ میں ہی ہوتا ہے۔ شاید یہ قانونِ قدرت ہے اور جو اس مصلحت سے بچ نکلتے ہیں وہ پیغمبر، اولیاء، اوتار، صوفی، سنت، جوگی، فقیر اور عاشق ہوتے ہیں۔ اب میں تو ان سب میں سے تھی نہیں سو میں تھک چکی تھی اور نیند میں جانا چاہتی تھی اور پھر نیند سے نکل کر دوبارہ نیند میں ہی جانا چاہتی تھی۔ آپ اسے فرار کہہ سکتے ہیں۔ کہہ لیں ــــــ فرار بھی انسان کی ضرورت ہے ورنہ وہ مر جائے گا۔ انسان اگر زندہ رہتا ہے تو اسی فرار کی وجہ سے زندہ رہتا ہے۔ فرار جسے انگریزی میں

Escape کہتے ہیں۔ یہ ہر حساس اور تخلیقی انسان کی ضرورت ہے۔ کیونکہ وہ اس فرار میں جہاں جا نکلتا ہے وہ کوئی انوکھی جگہ۔ یا انوکھا واقعہ ہوتا ہے اور اُسے اپنی تخلیق میں کسی انوکھی واردات سے آشنا کر دیتا ہے۔ دنیا کا سارا بڑا ادب فرار کا نتیجہ ہے۔ آسکر وائلڈ فرار میں تھا ــــــ کامیو اور کافکا فرار میں تھے۔ سارتر، ٹالسٹائی، دوستوؤسکی، چارلس ڈکنس، ایلیٹ، ہرمن ہیس، جیمز جوائس، ہمینگوے سے لے کر مارکیز تک سب فرار میں تھے اور انہوں نے اپنی حقیقت سے فرار حاصل کیا تو اُن کے ہاتھ میں سچائی آئی ــــــ پھر اُن سب کے پیروکاروں میں سچائی آئی۔ اب میں فرار کو ہی اپنی تخلیقی طاقت سمجھنے لگی تھی۔ اب میں کس کس سے فرار حاصل کروں۔ خاوند سے، بچوں سے یا اپنے آپ سے۔ کہانی کو میں نے ختم کرنا ہے یا کہانی خود اپنا انجام طے کرتی ہے۔ کہانی لکھنے والے کی اپنی کہانی سے ایک داخلی مخاصمت ہمیشہ رہتی ہے۔ میں بھی اپنی کہانی سے ضد کے رشتے میں رہی ہوں۔ اور آج میں وہاں آ گئی ہوں کہ میں اپنے ہاتھوں سے اپنی کہانی کا گلا گھونٹ دوں یا کہانی کو موقع دوں کہ وہ خود اپنے آپ کو مکمل کر لے۔

ابھی میں نیند میں جا ہی رہی تھی کہ خواب سا محسوس ہوا اور میں دروازے پر گئی۔ وہاں ایک سیاہ فام سمارٹ نوجوان کھڑا تھا۔ نوجوانی سے ذرا آگے آ چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا۔ میں نے کہا۔ ''اندر آ جاؤ۔ مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔'' وہ حیران ہوا اور کہنے لگا۔ ''کیا میں صحیح جگہ پر آیا ہوں۔ یہ مشہور رستورین۔۔۔۔''

''ہاں یہی اُن کا گھر ہے۔ تم کیتھی کے بیٹے ہو؟''

''آپ کو کیسے پتہ چلا؟''

''میں آنس کی بیوی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کیتھی سے اُن کی ایک اولاد ہے۔ تمہاری ماں نے تمہیں کیا بتایا ہے؟''

''یہی کہ میں اُن کا بیٹا ہوں۔''

''مگر کیتھی نے یہ نہیں بتایا کہ تمہارے بائیولوجیکل باپ نے تمہیں اپنا نام نہیں دیا تھا؟''

''ہاں یہ بھی بتایا تھا۔ میں اپنے بائیولوجیکل فادر سے ملنے آیا ہوں اور اپنی ماں کا ایک پیغام بھی مجھے انہیں دینا ہے۔''

''میرے ساتھ آؤ۔ وہ سو چکے ہیں اور معلوم نہیں وہ کب جاگیں گے۔''

''میں اپنے بائیولوجیکل فادر کو دیکھنا چاہتا ہوں اور اپنی ماں کا خط انہیں دینا چاہتا ہوں۔''

''آؤ میں تمہیں اُن کے کمرے میں لے جاتی ہوں جہاں وہ سو رہے ہیں۔''

''میں کیتھی کا بیٹا ہوں۔ ماں نے بتایا تھا کہ میرا باپ پاکستان میں ہے اور میری ماں ایک افریقی قبیلے سے تھی۔''

''تھی سے مطلب؟ کیا اب وہ نہیں ہے؟''

''ہاں نہیں ہے۔ مگر یہ بات تو مجھے اپنے فادر سے کرنی ہے۔''

''تم یہاں تک کیسے پہنچے؟''

''اب مجھے اپنا جنم بتانا پڑے گا۔ میری ماں جس افریقی قبیلے سے تھی وہ اب بھی اپنی پوری قدیم روایات کے ساتھ جنگل ہی میں رہتا ہے۔ عورتیں جسم کو ننگا رکھتی ہیں۔ میری ماں جب پڑھنے کے بعد اپنے وطن واپس آئیں تو اُنہیں ان کے مضمون اینتھراپالوجی کے حوالے سے یونیورسٹی میں پڑھانے کی ملازمت ملی اور انہوں نے مجھے پیدا کیا۔ سب کو بتایا کہ میرا باپ کون ہے۔''

''تو پھر سب نے اس بات کو قبول کر لیا؟''

''مجھے یہ معلوم نہیں۔ مگر میں اپنے قبیلے سے الگ رہا۔ کبھی کبھی اپنے قبیلے کی کوئی جھلک ماں مجھے دکھا دیتی تھیں۔''

''تم اپنے بائیولوجیکل فادر سے ملنے اتنی دیر سے کیوں آئے ہو؟''

''میں تو نہیں آنا چاہتا تھا اور شاید مجھے ضرورت بھی نہیں ہے۔ مگر ماں نے یہ خط دیا ہے اور کہا تھا ہو سکے تو مل لینا —— اور پھر یہ اُن کی وصیت تھی۔ اس کے بعد وہ مر گئی تھیں۔''

اب مجھے سعادت حسن منٹو کا افسانہ ''گورمکھ سنگھ کی وصیت'' یاد آ گیا۔ جس میں گورمکھ سنگھ کا بیٹا باپ کی وصیت پوری کر کے عبدالحی جج کے پورے خاندان کو مروا دیتا ہے۔ میں جان چکی تھی کہ کیتھی کی وصیت بیٹے نے بہر حال پہنچانی ہے۔ میں نے کہا۔ ''تمہیں باپ سے ملنے کی خواہش زیادہ ہے یا ماں کی وصیت پہنچانے کی زیادہ ضرورت ہے۔''

''مجھے صرف ماں کی وصیت اپنے بائیولوجیکل باپ تک پہنچانی ہے۔''

''تو آؤ میرے ساتھ۔ میں تمہیں تمہارے بائیولوجیکل باپ کے سرہانے لے جاتی ہوں۔ تم نے جو کہنا ہے کہہ دو____''

میں اُسے لے کر آنس کے کمرے میں گئی جہاں وہ لیٹا تھا۔ وہ سامنے آیا اور اُس نے باپ کو بس ایک جھلک دیکھا اور پھر۔

''مجھے کیا معلوم یہ میرا باپ ہے۔ میں نے تو اپنے باپ کو دیکھا تک نہیں''____

''تمہاری ماں نے تمہارے باپ کی کوئی تصویر نہیں دکھائی؟''

''نہیں____وہ شاید میرے باپ کو صرف اپنے اندر محفوظ رکھنا چاہتی تھیں۔ آج کل کی طرح کوئی تصویر کسی جگہ محفوظ نہیں تھی اور اگر تھی تو وہ کسی کو دکھانا نہیں چاہتی تھیں۔''

''تو پھر جس ایڈریس پر یہاں تک آئے ہو۔ یہ وہی مسٹور ین ہیں۔ نام بھی اُن کا وہی ہے جو تمہاری ماں نے بتایا تھا۔ جبھی تو تم یہاں تک آئے ہو۔''

''ہاں ایسا ہی ہے۔ میں نے اضافی بات اس لئے بول دی تھی کہ میں اس موقع پر سنبھل نہیں پایا۔ یہ میرے لئے پہلا اور آخری انوکھا تجربہ ہے کہ میں جائز اولاد نہیں ہوں۔ دنیا کی نظر میں ناجائز بیٹا ہوں۔ اور اپنے جائز باپ کو دیکھنے آیا ہوں۔''

''پہلے یہ تو بتاؤ۔ یہاں تک پہنچے کیسے؟''

''میں نے اپنے ملک کی سب سے بڑی یونیورسٹی میں پولیٹکل ہسٹری میں ماسٹرز کیا اور میری ماں نے مجھے یہ مضمون سوچ سمجھ کے رکھوایا۔''

''کیا مطلب؟ سوچ سمجھ کے۔''

''وہ ایسے کہ شاید میں یہ پڑھ کے اپنے ملک کی فارن سروس میں آجاؤں گا اور اس بہانے شاید میری پوسٹنگ پاکستان میں ہوجائے گی تو میں اپنے باپ سے مل سکوں گا۔''

اب مجھے کچھ کچھ سمجھ آنے لگی۔ میں نے پوچھا۔ ''پھر یہاں پاکستان میں کب آئے؟''

اُس نے بتایا۔

''ماں نے مجھے تیار کر لیا تھا اور جب میری فارن پوسٹنگ کی باری آئی تو ہمیں کچھ ملکوں کا چوائس دیا

جاتا ہے۔ ماں نے کہا میں چاہتی ہوں تم ایشیا میں جاؤ تو پاکستان کا نام اپنے چوائس میں ضرور رکھنا۔ بس میں نے ایسا ہی کیا اور پھر ماں نے بتایا کہ تمہارا باپ پاکستان میں ہے۔"

"تمہاری ماں نے تمہیں سب بتا دیا کہ تمہارے باپ کے ساتھ تمہاری ماں کا کیا رشتہ تھا؟"

"ہاں۔ وہ کسی جرم کا شکار نہیں تھی۔ وہ میرے بائیولوجیکل باپ سے محبت کرتی تھی اور اُس کے ساتھ رہ رہی تھی۔ وہ ہر روز اُن سے باتیں کرتی تھیں۔ اُن کے ساتھ کچن میں کھانا بناتی تھیں۔"

"کیسے بناتی تھیں؟"

"وہ اکیلے کچن میں ہوتی تھیں اور اپنے سے باتیں کرتی تھیں اور جو کچھ وہ بناتی تھیں وہ پاکستانی کھانے ہوتے تھے جو انہوں نے میرے باپ سے سیکھے تھے۔"

"تمہاری ماں نے اور کیا بتایا؟"

"اور یہ کہ میرا باپ میری ماں سے بہت محبت کرتا تھا۔ اور اُس کا خیال رکھتا تھا۔"

"تمہیں اپنے باپ کو دیکھنے کا یا ملنے کا شوق تھا یا ہے؟"

"نہیں ــــــ میں صرف اپنی ماں کی خوشی کی خاطر آیا ہوں۔"

"تم اسلام آباد اپنے ملک کی ایمبیسی میں رہتے ہو؟"

"ہاں جیسے بتایا ہے میں نے یہ پوسٹنگ اسی لمحے کے لئے لی تھی۔ ورنہ پاکستان کیا ہے؟ ہم اسلام آباد میں نہیں گھوم سکتے۔ میں صرف ماں کی وصیت پوری کر کے واپس کسی غریب افریقی ملک کی ایمبیسی میں چلا جاؤں گا یا اگر میری قسمت اچھی ہوئی تو انڈیا چلا جاؤں گا لیکن انڈیا جانے والوں کا بہت ہجوم رہتا ہے۔ بڑی بڑی سفارشوں سے انڈیا کی پوسٹنگ ملتی ہے۔"

میں سوچنے لگی۔ اس نے کیا بات کی ہے؟ ہم بھی کبھی ہندوستان کا حصہ تھے۔ اب الگ ہو کر دنیا میں ایسے رسوا کیوں ہو گئے کہ ایک معمولی افریقی ملک کا افسر جس کا باپ پاکستانی ہے۔ وہ صرف ماں کی وصیت پوری کرنے آیا ہے۔

"میں جانا چاہتا ہوں۔ اگر میں اپنے بائیولوجیکل باپ سے مل لوں۔"

"لیکن پہلے ایک لفافہ لو۔ یہ تمہارے بائیولوجیکل باپ نے تمہارے لئے دیا ہے۔ انہیں نہیں معلوم

تھا کہ تمہاری ماں سے بیٹا پیدا ہوگا یا بیٹی تو یہ لفافہ ان دونوں کی اولاد کے لئے ہے۔"

اُس نے وہ لفافہ لیا اور اُسے کھولا۔ اُس میں جو بھی کرنسی تھی اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے دیکھ لیا اور بند کیا۔ پھر میری طرف دیکھا۔ جس کا مطلب تھا کہ میں کتنی دیانت دار ہوں کہ ایک اجنبی کو اتنی رقم دے رہی ہوں۔ جس کی اُسے نہ تو ضرورت ہے، نہ وہ اس کی توقع رکھتا ہے۔ پھر وہ لفافہ اس نے جیب میں رکھا اور ماں کی وصیت کا لفافہ کھولا اور کہا۔

"اگر میں یہ پڑھ دوں تو آپ کو اعتراض تو نہ ہوگا؟"

"تم یہ وصیت لائے ہو۔ تمہیں اپنا بوجھ تو اتارنا ہے۔ جب کشتی ڈوبنے لگے تو بوجھ اتارنا پڑتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔ کون سی کشتی ڈوب رہی ہے؟"

"جو سامنے تمہارا بائیولوجیکل باپ لیٹا ہے۔ یہ وہ کشتی ہے۔"

"لیکن اس سے پہلے بھی ایک کشتی ڈوب چکی ہے۔ وہ میری ماں تھی کیتھرین ــــــ"

"تو پھر تم چاہتے ہو میں تمہاری ماں کی وصیت سنوں؟"

"ہاں اگر آپ سننا چاہیں تو یہ آپ کے لئے بھی ہے۔"

"تو پڑھو۔ ویسے بھی میں کہانی کار ہوں۔ یہ وصیت پہلے سے پڑھ چکی ہوں۔"

"میں نے یہ وصیت پہلے نہیں پڑھی۔"

"تو پھر تم یہ پڑھتے ہوئے شرمندہ تو نہیں ہوگے؟"

"جب میں اُس وقت شرمندہ نہیں ہوا جب مجھے معلوم ہوا کہ میں ناجائز اولاد ہوں تو اب کیوں ہوں گا۔"

"تو پھر تم پڑھ سکتے ہو ــــ بہادر لڑکے ہو" ــــ

پھر اُس نے لفافہ کھولا اور پڑھنا شروع کیا۔

"آنس تم جب ہیتھرو ائیر پورٹ سے اُڑے تو میں نے وہاں انتظار کیا کہ کب تمہارا جہاز اڑتا ہے۔ وہ جب اُڑا تو میں نے اُسے ٹیک آف کرتے دیکھا۔ تب مجھے لگا۔ تم جا چکے ہو اور جیسے ہوا کبھی ہاتھ نہیں آتی ــــ تم بھی ہاتھ نہیں آؤ گے۔ اُس وقت میں نے اپنے پیٹ کی طرف دیکھا اور خوشی ہوئی کہ تم اُڑ کر کہیں

نہیں گئے تم تو میرے پیٹ میں ہو اور میرے جسم کا حصہ ہو۔ بس پھر میں خوش ہو گئی اور میں نے تمہیں اپنے پیٹ میں نو مہینے محسوس کیا۔ میں نے تمہارے بیج کو اپنے اندر پالنے کے لئے خوشی سے محسوس کیا۔ پھر میں اپنے قبیلے میں چلی گئی اور ایک بڑے شہر میں کئی طرح کے کام کرنے لگی۔ کبھی یونیورسٹی میں پڑھا رہی ہوں کبھی کسی فاؤنڈیشن کے ساتھ ہوں۔ کبھی کسی پروجیکٹ پہ کام کر رہی ہوں۔ ایسے میں یہ میری گود سے نکل کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گی نہ تم سے رابطہ رکھوں گی۔ نہ اپنے بچے کو تمہارا نام دوں گی۔ میں نے وعدہ نبھایا ہے۔ میرے بیٹے کے باپ کے خانے میں نامعلوم لکھا گیا ہے اور میرے قبیلے نے اسے برداشت کیا ہے۔ لیکن نامعلوم کا لفظ میری اور تمہاری توہین ہے۔ میں نے اس پر احتجاج بھی کیا تھا۔ مگر میرے ملک کے قوانین کے مطابق باپ کا یا تو نام ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ اور اگر نہیں ہوتا تو وہ نامعلوم ہوتا ہے۔ ماں کا نام اُس جگہ نہیں لکھا جاتا۔ جبکہ میں نے اُن سے کہا کہ اس کے باپ کا نام میں جانتی ہوں۔ وہ نامعلوم نہیں ہے۔ کسی نے مجھے نشہ پلا کر ریپ نہیں کیا کہ میں اس شخص کو پہچان نہ سکوں۔ میں نے اپنی مرضی سے محبت کے ذریعے اپنا بیٹا حاصل کیا ہے۔ وہ نامعلوم نہیں ہے ـــــ لیکن میں اُس کا نام نہیں دینا چاہتی۔ میری اس بات کو کسی نے قبول نہ کیا اور میرا بیٹا میرے اور آپ کے نام سے محروم ہو گیا۔ میرے قبیلے نے خوشی کا اظہار کیا اور سب کنواری لڑکیوں نے میرے گرد بالوں میں پھول لگا کر رقص کیا، جو ہمارے قبیلے کی رسم ہے۔ لیکن میں کاغذ کی تحریر نہ بدل سکی۔ میں شرمندہ ہوں۔ تم نامعلوم ہو اور نامعلوم ہی رہو گے۔ میں نے تمہارے بیٹے کی حفاظت کی۔ اُسے اچھی تعلیم دلوائی صرف اس لئے کہ وہ تم تک پہنچ سکے۔ جب وہ تم تک پہنچے گا میں نہیں رہوں گی۔ کیونکہ مجھے تمہاری پسندیدہ چھاتیوں کا کینسر ہو چکا ہے۔ کاش میں وہ چھاتیاں تم سے چھپا کے رکھتی مگر مجھے اپنے قبیلے کی رسموں پہ بہت غرور تھا اس لئے میں پہلے دن اپنا بدن تمہارے سامنے بے لباس کر کے لائی۔ بہت علاج ہوا مگر یہ کینسر آخری سٹیج کا نکلا اور ڈاکٹروں نے میری دونوں چھاتیاں کاٹ دی ہیں۔ اور اب وہ کہتے ہیں کینسر جسم کے اندر پھیل چکا ہے۔ وہ مجھے ایسی دوائیاں دے رہے ہیں جس کی وجہ سے میں بے ہوش رہتی ہوں۔ بس اتنا لکھ سکی ہوں۔ وہ مجھے چند دن دے رہے ہیں۔"

جب وہ اپنی ماں کی وصیت پڑھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا آنس نے ایک پل کے لئے اپنی آنکھیں کھولیں اور اُس کے جسم میں ذرا سی جنبش ہوئی اور جیسے اُس نے بتایا ہو کہ اُس نے یہ خط پڑھ لیا ہے۔ اور پھر

سے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ لڑکا کہ نہ کالا تھا نہ گورا، اُسے ہم سانولا کہہ سکتے ہیں۔ کیتھی پر یقیناً نہیں گیا ہوگا۔ وہ اپنے بائیولوجیکل باپ پہ چلا گیا تھا۔ ماتھا، بال، آنکھیں، ہونٹ، قد اور سب سے بڑھ کر آواز، بالکل باپ پر تھی۔ مجھے دھوکا ہوا کہ شاید آنس بول رہا ہے۔ جبکہ وہ سات براعظموں کو عبور کر کے آیا تھا۔ اب میں نہیں جانتی تھی کہ اُسے روکوں یا جانے دوں یا اُسے جی بھر کے دیکھوں۔ وہ میرے لئے اجنبی تھا۔ اُس کا کوئی بھی رشتہ اس گھر سے نہیں تھا۔ اُس نے ماں کی وصیت پوری کی اور ماں کا خط آنس کے سرہانے رکھ دیا ــــ اُس نے پوچھا۔ ''کیا میں اپنے بائیولوجیکل باپ کو چھو سکتا ہوں؟''

''ہاں۔ چھو سکتے ہو۔ شاید وہاں کوئی موجود ہو۔''

اُس نے اپنا ہاتھ آنس کے ہاتھ پر رکھا تو اچانک آنس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ اُس حرارت سے جھرجھری لے کر جاگے۔ مگر کچھ بولے نہیں۔ اُسے دیکھا۔ آنکھ بھر کے دیکھا۔ اُس نے بھی دیکھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ باپ بیٹے کے درمیان کوئی رابطہ ہوا ہے۔ دونوں طرف کوئی اداسی تھی۔ کوئی کمی تھی۔ کوئی ادھورا پن تھا۔ جواب مکمل ہو رہا تھا۔ میں حیران ہوگئی کہ آنس نے اس کے ہاتھ کو پکڑ لیا تھا۔ یہ کیفیت چند لمحے رہی اور پھر آنس نے آنکھیں موند لیں اور ہاتھ ڈھیلا چھوڑ دیا ــــ گویا ملاقات مکمل ہو چکی تھی۔ جس بات کا انتظار تھا وہ ہو چکی تھی۔ اب وہ نوجوان خاموشی سے کھڑا رہا۔ گویا باپ کو احترام سے رخصت کر رہا ہے۔ باپ اُس سے دور جا رہا تھا اور وہ آخری سلام کر رہا تھا۔ چند لمحوں بعد میں نے دیکھا دو آنسو اُس کی آنکھوں سے لڑھک گئے۔ کیا وہ ماں کے لئے تھے یا باپ کے لئے تھے ــــ

میں جو کہانی کا سفر مکمل کر چکی تھی ــــ اب پھر سے کہانی مجھے بلا رہی تھی۔ لیکن میں کہانی کے فریب میں نہیں آنا چاہتی تھی۔ کہانی تو خود غرض ہوتی ہے۔ خود کو مکمل کرنے کے لئے کہانی لکھنے والے کا خون چوس لیتی ہے۔ ایسا کئی بار ہو چکا ہے۔ منٹو، کامیو، کافکا، ہرمن ہیس، آئینیسکو، بریخت اس کی واضح مثالیں ہیں۔ اب کہانی میرا خون پینا چاہتی تھی۔ میں نے اُسے اجازت دے دی اور میں نے اُس نوجوان کو جانے دیا اور خود کو کہانی کے حوالے کر دیا ــــ وہ چلا گیا ــــ اور میں نے محسوس کیا کہ کہانی نے مجھ پر حملہ کر دیا ہے اور اپنے دانت میری شہ رگ پر گاڑ دیئے ہیں اور وہ آہستہ آہستہ میرا خون پینے لگی ہے۔ کہانی کو میرا خون بہت لذیذ لگ رہا تھا۔ وہ مزے لے لے کر قطرہ قطرہ پینا چاہتی تھی۔ میں نے اُسے کہا۔ میرا خون ایسے پیو جیسے منٹو کا خون پیا

تھا مگر اُس نے ایسا نہ کیا۔ وہ میرا خون ایسے پینے لگی جیسے اُس نے اشفاق احمد کا خون پیا تھا۔ اب میں تو اس کی گواہ تھی کہ کہانی نے اشفاق احمد کا خون کیسے پیا ـــــ کسی اور وجہ سے جب سرجن نے خاں صاحب کا پیٹ کھولا تو سامنے ایک عفریت بیٹھا ہوا ڈاکٹر کو گھور رہا تھا۔ ڈاکٹر نے فوراً پیٹ بند کر دیا اور خاں صاحب سے کہا۔ ''آپ کے اندر عفریت پل رہا ہے اور وہ اندر مورچہ لگا کے بیٹھ گیا ہے۔'' خاں صاحب مسکرائے اور کہا۔ ''وہ عفریت نہیں ہے۔ وہ میری کہانی ہے۔ جو مجھ سے بدلہ لینا چاہتی ہے کہ میں نے کہانی کو اپنی مرضی سے استعمال کیا ہے۔ اب کہانی مجھے اپنی مرضی سے استعمال کرنا چاہتی ہے۔ میں نے جو ڈرامے لکھے وہ ''حیرت کدہ'' اور ''من چلے کا سودا'' تھے۔ اب وہی ''حیرت کدہ'' میرے سامنے ہے اور وہی ''من چلے کا سودا'' میرے پیٹ کے اندر سرایت کر گیا ہے۔ ان کو میرے اندر بسیرا کرنے دو۔ آخر کہانی کو ہم ہی پال پوس کے بڑا کرتے ہیں تو پھر اُسے اپنے اندر رہنے کی جگہ بھی تو دینی پڑتی ہے۔ اب اشفاق احمد کی باتیں میرے سامنے آ چکی تھیں اور جب کہانی میرا خون چوس رہی تھی تو مجھے معلوم تھا کہ جب آپ کہانی کو گود لیتے ہیں تو ایک دن وہ خود کو بچانے کے لئے آپ کے خون پر پلنے لگتی ہے۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے جسم کا آخری قطرہ پی چکی ہے، جیسے اشفاق احمد کے اندر کا عفریت اُس کی رگ رگ میں سے گودا کھا چکا ہے ـــــ تو میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ کہانی نے جیت جانا ہوتا ہے۔ کہانی کار کو کہانی سے نکل جانا ہوتا ہے۔ کہانی چلتی رہتی ہے۔ کہانی کار ختم ہو جاتا ہے۔ رہے نام اللہ کا جو حاضر بھی ہے ناظر بھی ـــــ
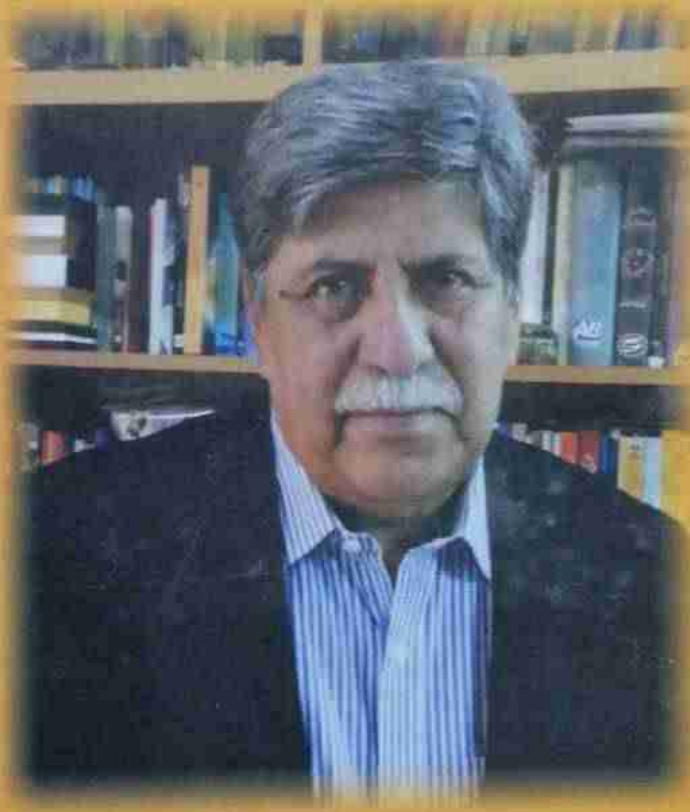
اصغرندیم سید کی کتب
• آدھے چاند کی رات
• دریا
• دبستان کُھل گیا
• کہانی مجھے ملی
(دس کہانیاں)
• چاند گرہن
• (ادھوری کلیات)
• "ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر"
ناول
Rs. 900.00
www.sangemeel.com
ISBN-10: 969-35-3364-X
ISBN-13: 978-969-35-3364-4
9789693533644